اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے نظامِ معاشی کا مکمل خاکہ، جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا
کے تمام اقتصادی اور معاشی نظاموں میں اسلام کا نظامِ اقتصادی
ہی ایسا نظام ہے جس نے سرمایہ و محنت کا صحیح توازن قائم کر کے
اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب

رفیقِ اعلیٰ ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

باہتمام۔ عمید الرحمن عثمانی

طبع ہفتم

قیمت غیر مجلد ... روپے
قیمت مجلّد ... روپے

رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ مطابق جون ۱۹۸۳ء

شائع کردہ :- عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعہ

آزاد پرنٹنگ پریس تو ٹیڑا

اسلام کا اقتصادی نظام

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

طبع اوّل

بعد حمد و صلوٰۃ موجودہ زمانہ مادیت کی ترقی کا زمانہ ہے، یعنی اس زمانہ میں روحانی (مذہبی) جذبات سرد پڑ رہے، اور لادینی خیالات آہستہ آہستہ انکی جگہ لیتے جا رہے ہیں، ایسے زمانہ میں مذہب کے نام سے کسی چیز کا پیش کرنا خصوصاً اس نام سے کسی "اقتصادی نظام" کی ہمہ گیری کا مدعی ہونا اور اسکو محنت و سرمایہ کی موجودہ کشاکش کا بہترین حل بتانا بہت بڑی جرأت اور حیرت انگیز جسارت سمجھا جائیگا مگر قدرت نے جنھیں چشمِ بصیرت عطا فرمائی ہی اور جنکو مشکوٰۃ نبوت کے فیضان سے حصہ وافر ملا ہے وہ بحمد اللہ آج بھی اس مادی ترقی کے مسموم اثرات یعنی مذہب سے بے اعتنائی برتنے آسکی تعلیمات سے تمسخر کرنے اور اسکو نظرِ حقارت سے دیکھنے کو "ذہنی غلامی" اور "دماغی پستی" یقین کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے موجودہ انقلابی ہنگاموں میں بھی صحیح راہ وہی ہی جو اسلام کی ہمہ رس دعوت انقلاب نے ہمکو بتائی ہی اور امنِ عالم کیلئے آج بھی یہی نسخہ کیمیا ہے اور بس۔

تاہم یہ قول چونکہ قول کی حد تک صرف ایک مقلدانہ خوش اعتقادی پر محمول کیا جاتا بنا بریں ضرورت تھی کہ اقتصادی ملل اور یورپین نظریوں کی کورانہ تقلید و اتباع کے اس دور میں جرأت و ہمت اور صداقت و اعتدال کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ پیش کیا جائے تاکہ انصاف پسند اور حق نگاہ اصحاب کو غور کرنے کا موقع ملے کہ دنیا کے موجودہ نظامہائے اقتصادی میں اقتصادی مشکلوں کے حل کے لئے کون سی راہ مفید خس و خاشاک سے پاک اور قابلِ عمل ہے

قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ اَمۡ	کہدیجئے کیا نابینا و بینا مساوی ہو سکتے
هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ	ہیں اور کیا تاریکی و روشنی برابر ہیں۔

نیز میری یہ "صدا" ان دردمند انسانوں کے لئے ہو جو غریبوں، مفلسوں اور عام بدحال انسانوں

کی فاقہ مستیوں اور ان کے مقابلہ میں خود غرض، عیش پسند، متکبر و مغرور اور قارون صفت سرمایہ داروں
کو دیکھتے اور موجودہ خود ساختہ اور غیر فطری تفاوت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو حیرت و اضطراب سے پکار
اٹھتے ہیں کہ سوسائٹی کا یہ بے رحمانہ طبقاتی نظام کیا خدا ہی نے اپنے بندوں کے درمیان قائم کر دیا ہے
یا چند انسان نما درندوں نے محض جبر و قہر سے سوسائٹی کا یہ نقشہ تیار کر کے اپنے ہی جیسے انسانوں
کو اپنی اغراض کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے؟ اور پھر اپنی نادانی و بے علمی سے کبھی سوشلزم و کمیونزم
کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور کبھی نیشنلزم کی پناہ لیتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ اس عذاب سے
نجات کی صرف یہی راہیں ہیں میری یہ کتاب ایسے زخمی دلوں کے لئے مرہم اور ایسے مصیبت زدہ
قلوب کے لئے آبِ حیات ہے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں مدارجِ معیشت کا فرق اسی حد تک جائز
اور فطری ہے کہ کسی حال میں بھی اجتماعی زندگی، انفرادیت کے تیشہ سے گھائل نہونے پائے اور
عوام کی فلاح و بہبود کسی صورت میں بھی چند افراد کی اغراض پر قربان ہو کر نہ رہجائے۔
رزق کی وسعت و تنگی کا دامن بلاشبہ خالق کردگار کے یدِ قدرت کی گرفت میں ہے لیکن اسی
کے قولِ فیصل (قرآن عزیز) نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ دنیا کے اربابِ دولت کی دولت کا راز اجتماعی
مفاد ہی سے وابستہ ہے اور اس کارزار ہستی میں کسی کا فاقہ مستی اور تنگدستی سے مجبور و مقہور رہنا
خود اس نظام کا ناقابلِ معافی جرم ہے جس میں وہ آباد ہے اور ایسے نظام کا پہلی فرصت میں تباہ
ہو جانا ضروری ہے۔ لہذا فرعون سامان اور فاقہ کش دو طبقوں میں انسانوں کو تقسیم کر کے جو کوئی
اس ظالمانہ نظام کی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے شاید وہ اسکے اس ظلم شکن اعلان اور پاداشِ
عمل کے قانون سے ناآشنا اور بے خبر ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ	خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے
أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي	اپنے کرتوتوں سے، ان کو اپنے کرتوت کا
عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (روم)	مزہ کچھ چکھنا چاہیے تاکہ وہ باز آجائیں۔

بہر حال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دستِ غیب کا کوئی

نسخہ ہاتھ آسکتا ہے اور نہ ان مذہب نما انسانوں کے لئے کوئی پیغام جانفزا دستیاب ہو سکتا ہے جنکے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشاء ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے ہے جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے اور کسی عادلانہ نظام کے بر روئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لئے ہے جو "الحاد" کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر و گوہر جانتے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردِ عمل ہیگل اور کارل مارکس کے فلسفہ، سوشلزم اور کمیونزم میں سمجھتے ہیں اور کبھی نیشنلزم اور یورپ کی ڈیماکریسی (جمہوریت) کو کعبۂ مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور و انصاف کی نگاہ سے دیکھیں کہ رسولِ عربی صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہم) کے بتائے اور سکھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوشحالی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ)

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آ چکی اور ایسی کتاب ہو چکی جو اپنی ہدایتوں میں نہایت روشن کتاب ہے خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو ہوائے نفس کی جگہ خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے یعنی اپنے مقررہ قانون کے بموجب انہیں تاریکیوں سے نکالتا، روشنی میں لاتا اور کامیابی و سعادت کی سیدھی راہ لگا دیتا ہے"۔

میری اس پیشکش میں بھٹکے ہوئے انسانوں کے لئے تسکین کا سامان اور ان کی حیات اجتماعی کیلئے روح پرور پیغام ہے بشرطیکہ ان کو حق کی تلاش ہو اور ان کا دل خدا اور اسکی بتائی ہوئی راہِ ہدایت

اور روشن کئے ہوئے آفتابِ رسالت سے باغی اور جان بوجھکر نافرمانی و سرکشی کے لئے جری و بے باک نہ ہو۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ	میں تم سے اس پر اُجرت کا خواہشمند نہیں ہوں
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۝	میری (اس خدمت کی) اجرت صرف اللہ کے پاس ہے

اس تصنیف کے متعلق مقصد کی وضاحت کے بعد، اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں مخلصانہ گذارش ہے کہ براہِ کرم وہ میری اس محنت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا شکار نہ بنائیں اور تنقید کرتے وقت اسی حیثیت سے نظر ڈالیں جس کے لئے وہ معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

اہلِ علم حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا یہ نقشہ موجودہ اقتصادی نظریوں اور ان کے پروگراموں کی طرح کسی کتاب کی صورت میں مدون و مرتب نہیں ہے اور نہ اسکے نظامِ عمل کا کوئی خاکہ اس جدید طرز وطریق پر اب تک شائع ہوا ہے بلکہ یہ اسلام کے بتائے ہوئے اصول اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی اس عملی حیات کے نظامِ عمل سے ماخوذ ہے جو زمانۂ نبوت اور دورِ خلافت میں بروئے کار آئے اور جنکو دنیا کے تمام اقتصادی وسیاسی نظامہائے عمل کے مقابلہ میں مساوات، امن وسلامتی اور عام رفاہیت کے پیشِ نظر تاریخی برتری حاصل ہے۔

تاہم اسکی تفصیل وتشریح اور ترتیب وجمع میں ایک خاص طرزِ نگارش کی وجہ سے جو اسلامی لٹریچر میں اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک نئے انداز کا حامل ہے، میری یہ سعی وکاوش بہت ممکن ہے کہ خامیوں اور لغزشوں سے خالی نہ ہو اور جو مطالب کہ اپنی توضیحات میں ضخیم جلدوں اور دقیق نکتہ سنجیوں کے محتاج ہیں میری لغزشِ قلم کی وجہ سے وہ صحیح طور پر ادا نہ ہو سکے ہوں۔

اس لئے یہ بھی التماس ہے کہ ہدفِ ملامت بنانیکے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کیجائے، خدا نے چاہا تو میں دوسرے ایڈیشن میں اسکی تلافی کی کوشش کرونگا

خادمِ ملت محمد حفظ الرحمٰن ۱۰ رجب المرجب ۱۳۵۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنِ گفتنی

دیباچہ طبع ثانی

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ اما بعد مصنف نے جب "اسلام کا اقتصادی نظام" لکھنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کی اس محنت کی ملک کے اہل قلم، اہل علم، اور اہلِ فکر کی نظروں میں اس قدر اہمیت ہوگی جسکا احساس نہیں بلکہ مشاہدہ کتاب کی اشاعت کے بعد ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسنے ایسے بحرانی دور میں جب کہ حق و صداقت بھی شخصی عداوتوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں اس کتاب کو شرفِ قبولیت بخشا اور ندوۃ المصنفین کی اس خدمت علمی و مذہبی کو جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں "سعی مشکور" بنایا۔

مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں جہاں کتاب کی نوعیت کے اعتبار سے اسکو اسلام کے علمی ذخیرہ میں ایک جدید اضافہ ظاہر کیا تھا وہاں اپنی خامی اور نقشِ اوّلین کی حیثیت سے کتاب میں اضافہ اور ترمیم کی گنجائش کا بھی اعتراف تھا اور ارباب علم و بصیرت اور اصحاب قلم سے مخلصانہ درخواست کی تھی کہ وہ مصنف کے سیاسی رجحانات سے اختلاف کے باوجود دیانت کے ساتھ صرف کتاب پر تبصرہ اور ریویو کی زحمت گوارا فرمائیں اور بے لاگ تنقید کرکے مصنف کی راہنمائی کریں۔

مصنف اس سلسلہ میں ان ارباب علم و اصحابِ قلم حضرات کا شکر گذار ہے جنھوں نے اس اصولی نقطہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب پر تنقید بھی کی اور تقریظ بھی لکھی اور سب نے بالاتفاق

یہ تسلیم کیا کہ بے شبہ یہ کتاب وقت کی پکار کا اسلام کی جانب سے بہترین جواب ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ علمی ذخیرہ میں پہلی کتاب اور بیش بہا ذخیرۂ اسلامی کی حامل ہے۔

مصنف ساتھ ہی ان بعض اہلِ قلم کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے اصول تنقید سے گریز کرتے ہوئے کتاب کی جگہ مصنف کے سیاسی مسلک کو ہدفِ طعن بنایا اور اس کی جماعت کو غیر مہذب الفاظ میں یاد کرنا ضروری سمجھا اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ معاصرانہ حسد اور بغض وعناد، ادعاءِ امامت وقیادت اور ادعاءِ تقویٰ وطہارت کے باوجود بیتی اخلاق کے کس عمیق غار میں لیجاکر گرا دیتا ہے مگر مصنف اس لئے شکر گذار ہے کہ انکی اس غیر سنجیدہ روش نے کتاب کو ملک میں بہت زیادہ مقبول بنادیا اور اربابِ ذوق نے اس پر زیادہ سے زیادہ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس کا اندازہ ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آتے رہوئے ان خطوط سے ہوسکتا ہے جو کتاب کے متعلق ملک کے مختلف گوشوں سے اظہارِ خیال اور کتاب کی خریداری کے متعلق آئے یا اس کا صحیح اندازہ علوم جدیدہ کے ان اہلِ قلم کے تحریری تقاضوں سے ہوسکتا ہے جو جدید کے ساتھ قدیم کا بھی ذوقِ کامل رکھتے ہوئے مُصر ہیں کہ ان کو اس کتاب کو انگریزی زبان کے سانچے میں ڈھالنے کی اجازت دی جائے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اگرچہ ہاتھوں ہاتھ نکل چکا اور ان تھوڑے سے نسخوں کے علاوہ جو دفتر میں اصول تجارت کی بنا پر روک لئے جاتے ہیں کتاب کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا تاہم بعض دیگر تصنیفی مشاغل نے فوراً دوسرے ایڈیشن کی ترتیب کیجانب متوجہ نہونے دیا۔ مگر اربابِ ذوق کے پیہم تقاضوں اور وقتی ضرورت کے احساس نے مہمیز کا کام دیا اور بحمد اللہ دوسرا ایڈیشن بھی منصۂ شہود پر آگیا۔

اس ایڈیشن میں "نقش اوّلین" کو "نقش ثانی" بنانے کی پوری پوری سعی کی گئی ہے اور جدید اضافات اور ترمیم واصلاحات نے نیز تقطیع اور ضخامت کی زیادت نے گویا کتاب کو بالکل نیا جنم دیدیا ہے اور اس طرح وہ پہلے ایڈیشن سے الگ نئی اور مستقل کتاب بنگئی ہے۔

مصنف ایک مرتبہ پھر اربابِ علم اور اصحابِ قلم کی خدمت میں مخلصانہ ملتمس ہے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت، زیرِبحث مسئلہ میں اسلامی نظریوں کی وضاحت، معاشیات میں اسکے عملی نظام اور اجتماعی احکام کے پیشِ نظر مصنف کی کاوش و محنت پر آزادانہ مگر دیانت دارانہ تنقید یا تقریظ کے لئے قلم اٹھائیں۔

اور ان چند آخری صفحات پر بھی "جو کہ ضمنی طور پر ہندوستان میں معاشی مسئلہ کے متعلق زیرِ قلم آگئے ہیں" اگر کچھ لکھا جائے تو انصاف اور اسلامی اخلاق کی متانت کی روشنی میں معرضِ تحریر میں آئے تاکہ زیرِبحث مسائل میں قارئین کرام کو فیصلہ کرنے میں مدد ملے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہٗ)

۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

دیباچہ طبع ثالث

کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" اپنی ارتقائی منزلوں سے گذر کر اب تیسرے ایڈیشن کی صورت میں پیش ہے، اس ایڈیشن میں حذف و اضافہ دونوں سے کام لیا گیا ہے مگر حذف بہت کم اور اضافہ غیر معمولی ہے اس لئے کہ اس ایڈیشن میں خصوصیت کے ساتھ اسلامی معاشیات کے مفکرین شاہ ولی اللہ دہلوی، حافظ ابن قیم جوزی، امام رازی، امام غزالی اور ابن حزم اندلسی کے ان نظریات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو انھوں نے قرآن حکیم اور احادیث نبوی (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روشنی میں خالص معاشی نقطۂ نگاہ سے پیش فرمائے ہیں۔

ان نظریات کو پیش نظر رکھکر یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ معاشی مسائل کے حل میں مذہب سے آزاد یا مخالف ہو کر جن مفکرین نے کاوشیں کی ہیں اور نظری وعملی دونوں پہلوؤں کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے انکے مقابلہ میں اسلام کے ان مفکرین نے دینِ حق کی روشنی میں اس خوبی سے اس کا حل کیا ہے کہ ایک طرف لادینیت، طبقاتی جنگ وجدل اور انتقامی خامکاریوں سے تحفظ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب وہ پوری افادیت موجود رہتی ہے جو لادینی مفکرین کے معاشی نظام کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

اس مرتبہ یہ بھی سعی کی گئی ہے کہ مسئلۂ ربوٰ (سود) پر بھی سیر حاصل بحث کی جائے کیونکہ موجودہ دور کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے "سود" کو اس طرح تجارت کا جز بنا دیا ہے کہ آج اگر سود اور سودی تجارت کے خلاف کچھ کہا یا لکھا جائے تو وقت کے اہلِ نظر (معاشیین)

اس کو یا تعجب وحیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یا زیادہ سے زیادہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ حرمتِ سود
اور معاشی سسٹم میں عدمِ جواز سود پر دلائل کا ذخیرہ ایک روحانی نظریہ یا ایک اچھے دفاع
(Defence) سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور یہ تو وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا
کہ کسی معاشرہ میں سودی کاروبار ایک لغو اور باطل سسٹم ہے، اور یہ کہ موجودہ ماہرینِ اقتصادیات
کی ایک قابلِ ذکر جماعت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے کہ معاشیین کو تسلیم کرنا پڑیگا
کہ "سود" کے لئے معاشی نظام میں کوئی دخل نہیں اور شرحِ سود کو صفر تک پہنچا دینا ہی
صحیح معاشی حل کی کلید ہے۔

چنانچہ موجودہ ایڈیشن میں معاملۂ "ربوا" اور صحیح تجارتی لین دین کے درمیان تفاوت ظاہر
کرتے ہوئے اسلامی نقطۂ نگاہ سے عدمِ جواز سود پر ایسے معاشی دلائل پیش کئے گئے ہیں جو
مسئلہ کو دفاعی نقطۂ نظر سے آگے بڑھا کر ایک صحیح حل کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔
"مسئلہ اراضی اور ہندوستان میں معاشی مشکلات کا حل" کے عنوانات میں بھی
جدید ترتیب کے ساتھ مزید اضافات زیرِ قلم لائے گئے ہیں جنھوں نے کتاب کی افادیت
کو اور زیادہ وزنی بنا دیا ہے۔

غرض نقشِ ثالث "ثانی اور اوّل" کے مقابلہ میں مسئلہ ارتقاء کے "بقاء اصلح" کا
آئینہ دار ہے اور اصحابِ فکر ونظر کے لئے عمیق مطالعہ کا داعی۔

والی اللہ المرجع والمآب

خادمِ ملت
محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)
۲۰ جمادی الاخریٰ ۶۵ھ

طبع چہارم

کتاب کا چوتھا ایڈیشن بڑے ہی نازک زمانے میں پیش کیا جا رہا ہے، ایسا نازک زمانہ کہ چشم فلک نے نہ بھی کم سے کم ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا، ۱۹۴۷ء کی قیامت خیزیوں کے بعد ابھی تک پورا ملک بے اطمینانی کی تاریک لہروں میں گھرا ہوا ہے اور کہیں دُور دُور بھی روشنی کی کرن نظر نہیں آتی، جہاں تک اُردو کا تعلق ہے خود اس کے بولنے والے اس کو دیس نکالا دینے کی فکر کر رہے ہیں پھر جہاں تک ندوۃ المصنفین کا تعلق ہے ستمبر ۱۹۴۷ء کی بربادی کے بعد اس کے ادارہ کی بساط اُلٹ کر رہ گئی تھی۔ اب اس کا وجود ہی "کرشمۂ قدرت" سے کم نہیں ہے۔

موجودہ انقلاب نے مؤلفِ گرامی قدر کی مشغولیتوں کا نقشہ بھی یک قلم تبدیل کر دیا ہے، وہ رہ رہ کر تصنیف و تالیف کی پُر سکون وادی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں لیکن وقت کی شورشیں اُن کے قدم کھینچ لیتی ہیں، اور ان کو اس خدمت کا موقع نہیں دیتیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں اس کتاب کا جو ایڈیشن نکلا تھا زیرِ نظر ایڈیشن ٹھیک ٹھیک اُس کی نقل ہے۔ اور اس میں ایک سطر کا بھی رد و بدل نہیں ہو سکا۔ مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اگرچہ تیسرا ایڈیشن ہر حیثیت سے مکمل تھا اور اِس میں کسی قابلِ ذکر اضافے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی تھی، تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ اگر مصنف کو نظرِ ثانی کا موقع مل جاتا تو اس کی نوعیت کیا ہوتی۔ (۱۲ر شوال ۱۳۷۱ھ - ۱۷ر جولائی ۱۹۵۱ء)

طبع ششم

کتاب کا پانچواں ایڈیشن ۱۹۵۹ء کے آخر میں شائع ہوا تھا۔ اور یقین تھا کہ چھٹا ایڈیشن مؤلف کی نظرِ ثانی کے بعد نکلے گا۔ لیکن مولانا مرحوم کی اگست ۱۹۶۲ء میں رحلت ہو گئی، اور نظرِ ثانی کا منصوبہ یوں ہی رہ گیا گذشتہ چند سالوں میں اقتصادیات اور معاشیات کے سلسلے میں بحث و نظر کے جو جدید گوشے اُبھرے ہیں، ضرورت ہے کہ اُن کو سامنے رکھ کر مولانا کا کوئی فاضل ارادت مند کتاب پر ایک نظر ڈال لے، جہاں تک جوہری مباحث کا تعلق ہے زیرِ نظر ایڈیشن ہر حیثیت سے مکمل ہے

عتیق الرحمٰن عثمانی

۱۲ر شوال المکرم ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتصاد و علم الاقتصاد

لغت کی زبان میں قصد و اقتصاد "میانہ روی اور اچھے چلن" کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال، اور اس کی ہلاکت و بربادی کے "حقیقی اسباب" بتا سکیں۔ اس لئے "علم الاقتصاد" اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرتا اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔

"علم اقتصاد" اس معنی کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک "اجتماعی" اور دوسرا "انفرادی" یا "منزلی" ہماری بحث کا نقطۂ نظر "اقتصادِ اجتماعی" ہے اس لئے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور "انفرادی و منزلی" اقتصاد کے لئے دلیلِ راہ۔

علمی دنیا کے قدیم و جدید مفکرین اور علماء مبصرین نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے بھی اپنی کتاب "جمہوریہ" (Republic) میں اس مسئلہ کے متعلق اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا ہے اور علماء جدید میں کیسل (Cassel)، مل (Mill) اسمتھ (Smith) ڈیکارڈو (D Rico) اور جون (Jhon) نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ ان کی تصانیف اور ان کے نظریوں سے واضح ہے

اور آخر میں کارل مارکس (karl marx) نے نظریۂ اشتراکیت (socialism) اور اس کے "عملی پروگرام" کے ذریعہ سے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا اس سے علمی فکر و نظر، عملی نظام، اور طرزِ حکومت پر جو اثر پڑا ہے وہ موافقت و مخالفت کے رنگ میں، نہ صرف یورپ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ ایشیا اور مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں زبردست ہیجان برپا کئے ہوئے ہے، اور روس جو کہ آجکل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے۔ دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لئے پیہم جد و جہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

لیکن دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قدیم و جدید تمام نظامہائے حکومت میں ایک بھی ایسا نظام نہیں بتایا جا سکتا جس کے نظامِ اقتصادی نے انسانی دنیا کے اندر رفاہیت و خوش عیشی اور عدل و انصاف دونوں کو باہم ملا کر امن و سلامتی کا علم بلند کیا ہے اور یہ تو وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کے پیش کردہ نظریوں اور عملی تجربوں نے دنیوی سربلندیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حیات کے مقصدِ وحید یعنی اللہ اور اسکے بندوں کے درمیانی رشتہ کو مضبوط کرنے اور اخلاقِ کریمانہ کی رفعتوں تک پہنچانیکی خدمت انجام دی ہو۔

افلاطون اپنی شہرۂ آفاق کتاب جمہوریہ میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اسطرح خدا کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا اور زیردستوں پر زبردستوں کی قہرمانیت کے لئے دروازہ کھولتا ہے اور صنفی تعلقات میں انارکی پیدا کر کے معاشرتی نظام کو برباد کر دینے کے علاوہ معاشیات میں عوام و خواص کی تقسیم کو بڑی حد تک باقی رکھتا ہے۔ یورپ کی جمہوریت کا نظام بھی اسی دیوِ استبداد کی قبا اوڑھے ہوئے ہے اور عام رفاہیت و خوش عیشی کی بجائے مخصوص اور مالدار طبقوں کی کفالت کرتا نظر آتا ہے اور اس لئے عدل و انصاف کے حقیقی معنی کو بھی مسخ

کر دیا گیا ہے اور ظلم و استبداد کو عدل و انصاف کا نام دیا جا رہا ہے اور حقیقت بین نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ نہ صرف معاشی نظام بلکہ پورا نظامِ حکومت محض ایک چھوٹی سی جماعت کے اغراض کو پورا کرتا اور جمہور کو ان مقاصد کے لئے آلۂ کار بناتا اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کا نام جمہوریت (Democraacy -) رکھتا ہے۔

روما اور فارس کا پرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت دنیائے انسانی کو مطمئن تو کیا کرتے خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لئے بھی دعوتِ حق اور پیغامِ رفاہیت نہ دے سکے۔ اور جو کچھ بھی کیا وہ سب طبقۂ امراء و سلاطین ہی تک محدود رہا خصوصاً فارس کا وہ نظام تو قابلِ ذکر بھی نہیں جو مزدک کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ اسی طرح موجودہ ڈکٹیٹر شپ بھی امن و سلامتی کی جگہ قہر و غلبہ کی اور عام رفاہیت کی جگہ دنیائے انسانی کو محکوم بنانیکی ہنگامہ آرائیوں کے سوا دنیا کو کچھ نہ دے سکی

اشتراکیت اور اشتمالیت نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر ایک طرف خدا سے بغاوت کر کے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان انارکی کا باعث بنی اور دوسری جانب طبقاتی جنگ کے مراحل میں الجھ کر رہ گئی اور عالمگیر پیامِ امن بننے کی بجائے وہ بھی ایک طبقہ کی مخصوص حکمرانی کی قائل نظر آنے لگی فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا نہیں مزدوروں کا طبقہ ہے۔

بہر حال دنیا کے تمام نظامہائے حکومت اور دنیا والوں کی ہر قسم کی جد و جہد ہمیشہ اس مرحلہ میں ناکام رہی اور آج کی ہولناک جنگِ یورپ اس ناکامی کو اس طرح برسرِ عام لا رہی ہے کہ تہذیبِ نو سے مرعوب ہونیوالے انسان سرنگوں اور حیران نظر آتے ہیں اور ان کو کوئی تاویل بن نہیں آتی۔

پس اب دو ہی مرحلے باقی ہیں۔ یا دنیا ان ہلاکت آفرینیوں کا شکار ہو کر یکسر شر ہی شر بن کر رہ جائے اور یا پھر خیر اور حقیقی امن و سلامتی کی وہ دنیا بن جائے جس کا مظاہرہ اسلام

آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل مکمل طور پر دورِ نبوت، دورِ صدیقی اور دورِ فاروقی میں کر چکا ہے

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ — سو جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور

اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي — وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا

الْاَرْضِ (رعد) — ہے زمین پر۔

لہٰذا آج کی صحبت میں ہم اسلامی نظامِ حکومت کے اس شعبہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو "اقتصادی نظام" سے معنون ہے اور جس نے اپنے وجود کے حقیقی زمانہ میں دنیا کی تاریخ کے لئے یہ مواد بھی بہم پہنچایا کہ اس نظام میں اگرچہ دفتری اقتدار کی وہ جگمگاہٹ موجود نہیں ہے جو آج انسانوں کو سادہ راحت و آرام اور قلبی اطمینان و سکون بخشنے کی بجائے ان کی مشکلات و مصائب میں دن بدن اضافہ کا سبب بن رہی ہے اور جس کی بدولت حکومتوں کا اربوں روپیہ غریبوں اور مفلوک الحال انسانوں کی فلاح و بہبود کی جگہ جنگ کے استحکامات پر صرف ہو رہا ہے۔ لیکن اپنی عملی جدوجہد میں وہ علم المعیشت کے حقیقی مقصد کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اسکی تمام تر روح انسانوں کی خدمت فارغ البالی اور قلبی سکون و اطمینان کا باعث بنتی رہی ہے اس لئے اس میں نہ طبقاتی جنگ کی گنجائش ہے اور نہ اونچ نیچ کا وہ غیر فطری فرق ہی موجود ہے جس سے ایک جماعت بے قید سرمایہ و دولت کی مالک بنجائے اور دوسری اسکے سامنے دستِ سوال پھیلا کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرے اور اس کے دستِ تظلم کا شکار رہے۔

الحاصل یہاں ایسے نظریئے (تھیوریز) (Theories) مقصدِ بحث نہیں ہیں جو اپنے منطقی استدلالات اور عقلی کاوشوں کے اعتبار سے تو بہت بلند نظر آتے ہوں لیکن ان کی عملی افادیت یا تو صفر ہو یا پھر تمدن کے فاسد کرنے میں تیز گام، بلکہ ایک ایسا نظام زیرِ بحث ہے جو کائناتِ ہست و بود کی دنیوی ضروریات اور عملی معیشت کیلئے بہترین نظامِ عمل (پروگرام) رکھتا" اور تجرباتی زندگی میں اس بات کا ثبوت دیچکا ہو کہ وہ انسانوں کا اُن کے

حقیقی آقا "خدائے تعالیٰ" کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے اور ان کے اخلاق دکیر کٹر کو بلند اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ہر گروہ کے لئے یکساں معیشت کا کفیل رہا ہے اور انفرادی اور اجتماعی حیات کا ضامن۔ اور طبقاتی جنگ کی جگہ عالمگیر اخوت کا پیغامبر ہے۔

کسی نظریہ کے ساتھ اس کی "عملی قیمت کا لحاظ" اسلئے ضروری ہے کہ بعض نظریئے اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے اگرچہ بہت زیادہ جاذبِ نظر اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ اور "علم المعیشت کے مباحث میں ان کی بہت زیادہ اہمیت نظر آتی ہے لیکن جب وہ عمل کی ترازو میں تولے جاتے، اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں تو انکی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے۔

مثلاً "محنت" کا مفید مفہوم یہ ہے وہ کام جس کا کچھ مادی معاوضہ ہاتھ لئے" لیکن محنت کی علمی بحث میں" والدین کی خدمت اولاد کے لئے، عشاق کی ناز برداری اپنے محبوب کے لئے اور شوقین لوگوں کے مشاغل تفریحِ طبع کے لئے یہ سب محنت میں شمار کئے جاتے اور محنت کے وسیع نظریہ کے پیشِ نظر زیر بحث لائے جاتے ہیں، تاہم علماء اقتصادیات اس علمی نظریہ پر سیر حاصل بحث کرنیکے بعد آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا۔[۱]

اسکے برعکس بعض نظریئے نئی اصطلاحوں، جدید تعبیروں، اور مخصوص ماحول کے اثرات کے پیشِ نظر اگرچہ پہلے نظریوں کے مقابلہ میں ظاہری چمک دمک نہیں رکھتے لیکن عملی تجربہ میں ان کی افادیت بہت زیادہ ان کی پذیرائی بہت وسیع، اور نظامِ معیشت میں انکی درست کاری بیحد موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہٰذا کسی "عملی نظام" میں وہی نظریئے قابلِ قدر جگہ پانیکے مستحق ہیں جو تعبیری

---

[۱] علم المعیشت ص ۶۸۔

نقطۂ نظر سے اگرچہ انقلاب آفریں اور مسحور کن نظر نہ آتے ہوں مگر علمی دائرہ میں اس قدر مفید اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیلِ راہ بنالیا جائے تو بلاشبہ وہ ایک "صالح معاشی نظام" اور "امنِ عالم" کے کفیل ہو سکتے اور تمام انسانوں کی خوشحالی اور امن و عافیت کے راہنما بن سکتے ہیں۔

نیز ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو کہ جہاں وہ ایک طرف ایسی محکم بنیاد اور مضبوط اساس رکھتے ہوں کہ زمانہ کے ہزاروں انقلابات اور بے شمار تاثرات اور ذہنی رجحانات کے باوجود ان کی اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے۔ وہیں ان میں ایسی لچک پائی جاتی ہو کہ وہ وقتی تاثرات، ذہنی انقلابات و رجحانات، اور نت نئے حوادث کے لئے اپنی جزوی تفصیلات اور فروعی جزئیات میں وقت کی صحیح راہنمائی انجام دے سکیں اور موجودہ دور کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ دنیا کے لئے بھی اسی طرح مشعلِ ہدایت کا کام دیں جس طرح گذشتہ دنیا کی عام فلاح و طمانیت کے لئے کامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ اور یہ صرف وہی اصول ہیں جن کی روشنی میں "اسلام کا معاشی نظام" اپنے حقیقی دور میں ایک زرّیں تاریخ پیش کر چکا اور جس کے لئے دوست اور دشمن دونوں نے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

الغرض مسطورہ بالا تفصیلات کے پیشِ نظر یہ مناسب ہے کہ "اسلامی نظامِ معیشت" کو موضوعِ بحث بناتے وقت دنیا کے مختلف نظامہائے معاشی کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ عدل و انصاف کی روشنی میں یہ موازنہ ہو سکے کہ دنیا کے باقی نظامہائے اقتصادی میں اور اسلام کے نظامِ اقتصادی میں کیا فرق ہے اور یہ کہ درحقیقت معاشی نظام کے حقیقی مقصد کو کون پورا کرتا اور ان ہلاکت آفریں نظامہائے حکومت سے نجات دلا سکتا ہے جنھوں نے "اقتصادی ترقی" کے نام پر حیاتِ انسانی کو خس و خاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت بنا دیا ہے۔ اور جس انسان کی خوشحالی کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا آہستہ آہستہ اسی کی تباہی

وبربادی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب آئندہ اوراق میں جس اسلوب کے ساتھ "اسلام کے اقتصادی نظام" کو پیش کیا جارہا ہے اسکے مطالعہ کے بعد سطحی نظر میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں مختلف جماعتوں کے نام سے جس طرح منضبط نظریوں، مدوّن نظامِ عمل، اور مخصوص عنوانوں کے ساتھ معنون "معاشی نظام" ضخیم کتابوں کی صورت میں نظر آتے اور مستقل علم وفن کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس طرح "اسلام کا معاشی نظام" ایک جدا اور مستقل تدوین کی شکل وصورت میں مدوّن، مخصوص نظریوں میں محدود، اور خصوصی عنوانات سے معنون نظر نہیں آتا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اسلام نے دورِ حاضر کی طرح یہ نہیں کیا کہ اوّل "اقتصادی نظام" کے نام سے ایک عنوان قائم کر کے اس کے تحت میں ایک خاص نظریہ یا چند مخصوص نظریے بیان کرتا اور پھر ان نظریوں کے پیشِ نظر مختلف فصول و ابواب میں اسکے نظامِ علمی وعملی پر بحث کر کے کسی مخصوص نام کے ساتھ اس کو موسوم کرتا۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ صرف اسلئے کہ موجودہ دنیا کے جس قدر بھی نظامہائے اقتصادی ہیں وہ عموماً انسانوں کے خود ساختہ اور ایسے فلسفہ پر مبنی ہیں جن میں روحانیت اور مذہب کو یکسر سے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یا اس کی نہاد روحانیت اور مذہب کی مخالفت پر قائم کر کے اس کو فلسفیانہ رنگ میں ڈھال دیا ہے۔

اس کے برعکس "اسلام کا معاشی نظام" ایک ایسے ہمہ گیر فلسفہ پر قائم ہے جس کا نام "اسلام" ہے جو عالمگیر دعوت اور ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے اور دنیائے انسانی کی "صرف معاشی صلاح وفلاح" کا ہی خواہشمند نہیں ہے بلکہ روحانی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، حاجاتی اور معاشی غرض ہر قسم کی دینی ودنیوی فلاح وبہبود اور رُشد وہدایت کا علمبردار ہے اور اس طرح ایک وسیع اور مکمل نظامِ کائنات کا مدعی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا منتہائے مقصد صرف

دنیوی ترقی وکمال ہی نہیں ہے بلکہ سعادتِ ابدی اور رضائے الٰہی اسکی حیات کا کعبۂ مقصود ہے اس لئے وہ ہر شعبۂ زندگی کے لئے ایک "صالح نظامِ اجتماعی" کا طالب ہے اور ان ہی شعبہ ہائے زندگی کا ایک شعبہ "صالح نظامِ معاشی" بھی ہے۔

نیز اس کا دعویٰ ہے کہ "انسان" دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ حاکمِ مطلق (اللہ) کی نگرانی میں ایک ایسی حکومت برپا کرے "جو خلافتِ حقہ" کہلائے اور جس کا واضعِ قوانین انسان نہیں بلکہ خود احکم الحاکمین ہو، اور ان قوانین کی تنفیذ اس کے نائب "خلیفہ" کے ہاتھ میں ہو اور یہ حکومت اگر ایک جانب خالص روحانی اور اخلاقی برتری کی معلم ہو تو دوسری جانب عالم وکائنات کی سیاسی، مدنی اور معاشی ترقی وکمال کی حامل بھی ہو۔

غرض ایسے "نظامِ صالح" کی حامل ہو کہ جسکی بدولت ساری کائنات نسل وقوم اور ملک ووطن کے محدود دائروں سے آزاد ہوکر، یکساں طور پر عدل ونصفت امن وطمانیت اور خوشحالی ومعاشی رفاہیت سے مالامال ہوکر۔ اس اعتراف پر مجبور ہوجائے کہ وہ ابدی سعادت کے حصول میں بھی اس کو اپنا راہنما اور قائد تسلیم کرنے لگے۔ گویا اسکا معاشی نظام اس حیثیت سے ایک فلسفیانہ علم وفن نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی کاوشوں اور علمی وعملی موشگافیوں میں الجھا کر اصل مقصد سے محروم کردے بلکہ یہ معاشی نظام "شعبہ ہر ایک مکمل نظام کا اور آلہ ووسیلہ ہے مقصدِ حقیقی کے حصول کی آسانی راہ کا

بہرحال جبکہ اسلام کی دعوت اور اس کا پیغام کائنات کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی اور اسکا طریق کار ہمہ گیر عالمگیر وحدتِ اجتماعی کا مبلّغ ہے اور اس لئے اس کی رشد وہدایت نہ صرف دنیوی زندگی تک محدود ہے بلکہ "سعادتِ دارین" سے وابستہ اور قائم ہے اور دنیوی زندگی کی سعادت۔ ابدی سعادت کے لئے ذریعہ اور وسیلہ ہے تو بلاشبہ اسکے لئے کسی طرح یہ موزوں نہیں تھا کہ وہ زندگی کے اس مخصوص شعبہ (معاشی نظام) کو اپنے

مکمل نظام سے علیحدہ کر کے خاص نظریات اور عنوانات کے ساتھ ایک علیحدہ نظام کی حیثیت دیتا۔

بے شبہ وہ ایک "صالح معاشی نظام" کا مالک ہے مگر وہ نظام بھی تمام دوسرے نظامہائے زندگی کے اصول و آئینِ اساسی کی طرح ایک مکمل نظام قانون (قرآن عزیز) کا جزء ہے اور اس سے علیحدہ اپنی مستقل زندگی نہیں رکھتا۔ اسی لئے حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں صالح اقتصادی نظام کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ اسلام میں "اقتصادی نظام" کا اخلاقی اور مذہبی نظام کے ساتھ کسقدر گہرا تعلق ہے فرماتے ہیں :-

جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گذر گئیں اور دنیوی تعیش کو انھوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے اس پر غلبہ کر لیا تو اب انکی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور انمیں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھکر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بیجا عیش پسندوں کو دادِ عیش دینے کے لئے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جد وجہد میں مشغول و منہمک رہنے لگے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور ایکدوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں حتی کہ انکے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض سرد و گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم، اور حسین و جمیل، باندیاں موجود ہوں، اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک

رہی ہو، اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصۂ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے "معاشی نظام" کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبۂ فاسد پایا جاتا اور ان کے "معاشی نظام" کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔

نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری ہو گئی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ نا امیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی، اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لئے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اسکے لئے بادشاہ، نواب، امراء، اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کار پردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے انکی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر انکو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آب پاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق کچھ پیدا کر سکیں خلاصہ یہ کہ ظلم و بد اخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔

اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لئے بھی مہلت نہ ملتی تھی اور اس "فاسد معاشی نظام" کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم

متروک ہوگئیں اور امراء و روساء کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔

اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گذارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوگیا تھا مثلاً ایک طبقہ جہاد کئے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خوری کر رہا ہے تو دوسرا مدبرینِ مملکت کے نام سے پل رہا ہے، کوئی بادشاہ اور امراء کی خوشامد میں قصہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پا رہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعاگوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسبِ معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور تھی اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکارِ عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست اور ذلیل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔ پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دنائت و خسّت سے بھر گئے اور ان کی طبائع اخلاقِ صالحہ سے نفرت کرنے لگیں، اور انکے تمام اخلاقِ کریمانہ کو گھن لگ گیا اور یہ سب اس فاسد "معاشی نظام" کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔

آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالےٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضہ کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔

اس نے ایک نبی اُمّی (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر

بنا کر بھیجا وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام و جمہور پر معاشی دست برد کا سبب بننے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں۔

بہر حال خدائے تعالٰے نے اس ہستی کو اخلاقِ کریمانہ اور نیک نہادی کے لئے معیار اور طاہر و پاک امور کے لئے میزان بنا دیا۔"[1]

اسی طرح "ارتفاقات" پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ واضح رہے کہ ابنیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء، اگرچہ بالذات عبادات الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسومِ فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے۔ اسی لئے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔	میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کروں۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۴۔

اور اسی لئے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں رہبانیت کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔

پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے اس لئے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے انکے اخلاقِ کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اسلئے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس، سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی منافقتات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہلِ دولت و ثروت کے اطمینانِ قلب کو تعب اور حریصانہ کد و کاوش کے زہر سے مسموم کرتی، اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دست بُرد کے لئے آمادہ کرتی ہو کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یادِ الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔ لہٰذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت "نظامِ معیشت" میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک ہو[1] اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے"

پس اسلام نے اپنا یہ فرض اس طرح انجام دیا کہ اسود و احمر، عجم و عرب غرض تمام عالم

[1] مختصر از حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶۔

کے لئے اپنے مکمل نظام (قرآن) میں "نظامِ اقتصادی" سے متعلق چند اصول اور اساسی قوانین بیان کر دیئے جو رہتی دنیا تک ہر "عقلِ سلیم" اور "فطرتِ مستقیم" کے نزدیک یکساں طور پر واجب العمل اور قابلِ قبول ہوں اور اس کی تشریح و تفسیر میں دورِ نبوت و خلافتِ راشدہ نے وہ عدیم النظیر عملی پروگرام پیش کیا جس کے حُسن و کمال کا اعتراف دوست اور دشمن دونوں نے یکساں طور پر کیا اور جو کتابی فن بننے کی جگہ اپنے مقصدِ وجود کے لحاظ سے ہر فردِ انسانی کی خوشحالی اور رفاہیت کا حامل ثابت ہوا۔

الحاصل اسلام کا پیش کردہ "اقتصادی نظام" جو آئندہ صفحات میں سپردِ قلم کیا جا رہا ہے ان ہی اصولوں پر مبنی ہے جن کا داعی "قرآنِ عزیز" ہے اور جن کی شرح و تفسیر "احادیثِ رسول" اور "اسلامی فقہ" نے بیان کی ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ مناسب ہے کہ اول ان مبادیات کو بیان کر دیا جائے جو ایک "صالح نظامِ معاشی" کے لئے "اصولِ موضوعہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور پھر اسلام کے "معاشی نظام" کی وضاحت کی جائے اور اس کے بعد اسلامی معاشی نظام کا دوسرے نظامہائے معاشی سے موازنہ کیا جائے تاکہ اصل حقیقت منقح اور روشن ہو جائے۔

اصولِ موضوعہ

کائناتِ ہست و بود میں ایک صالح معاشی نظام" کی اس لئے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ موجود ہے کہ اس کو خدائے تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی سے فائدہ اٹھانا چاہیے مگر یہ فطری جذبہ جب زندگی کی کشمکش اور وسائلِ حیات کی کشاکش میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو قانونِ فطرت، جو کہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے تمام کائنات پر حاوی ہے ہر ایک انسان کو اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ حیاتِ اجتماعی بغیر کسی ایسے نظام کے متصور نہیں ہو سکتی جب تک ان کے درمیان ایسا تعاون و اشتراک موجود نہ ہو جس کی بنیاد عدل اور حقِ معیشت کی مساوات پر قائم ہو۔ تاکہ وہ "صالح معاشی نظام" کے لئے کلید بن سکے۔ اور اس قسم کا تعاون و اشتراک جب ہی عالمِ وجود میں آسکتا ہے کہ نظامِ معاشیات میں حسبِ ذیل اصول کار فرما ہوں۔

(۱) وہ "نظام" ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور اپنے دائرۂ عمل میں کسی بھی فرد کو معاشی زندگی سے محروم نہ رکھتا ہو۔

(۲) ایسے اسباب و وسائل کا قلع قمع کرتا ہو جو معاشی دست برد کا موقعہ مہیا کر کے افرادِ انسانی کے درمیان ظلم و استبداد کی راہیں کھولتے اور معاشی نظام کے فساد کا موجب بنتے ہوں۔

(۳) دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا محدود جماعت کے اندر سمٹ آنے اور اس فرد یا جماعت کو نظامِ معیشت پر قابض و مسلط ہونے سے باز رکھتا ہو تاکہ معاشی نظام تمام کائنات انسانی کی فلاح کی بجائے مخصوص طبقوں کے اغراض کا آلۂ کار بنکر نہ رہ جائے۔

(۴) محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا اور ایک کو دوسرے کی حدود پر غاصبانہ دست برد سے بچاتا ہو۔

معاشیات کے جدید نظریے

ان اصولوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے قبل یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ موجودہ علمی دور میں "علمِ معاشیات" کے متعلق جو موشگافیاں کی گئی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ معاشیات پر جن نقطہ ہائے نظر سے بحث کیا جانا ممکن ہے وہ تین ہیں" مابعد الطبیعاتی علمی نقطہ نظر" "طبیعاتی علمی نقطہ نظر" اور "تمدنی نقطہ نظر" اور علماء معاشیات ان کو حسب ترتیب معیاری نقطہ نظر ترتیبی نقطہ نظر اور افہامی نقطہ نظر سے تعبیر کرتے ہیں "معاشیات معیاری" کسے کہتے ہیں اسکو معاشیاتی علوم کے ایک بڑے ماہر کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"معاشیات معیاری کا مقصد معیشتِ موجودہ کی تشریح اور توجیہ نہیں بلکہ معیشت صحیحہ" کا پتہ چلانا ہے وہ محض یہ معلوم کرنے پر قانع نہیں کہ معاشی کل کے پرزے کیسے کام کرتے ہیں بلکہ وہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ معاشی کل ہوتی کیسی چاہئے؟"

معاشیاتِ معیاری کا مطمحِ نظر بہت بلند ہے وہ تو مقاصدِ معاشی کی تعیین کرنا چاہتی ہے اور اس تعیینِ مقاصد کو وہ "علم" کا کام بتاتی ہے وہ ان ازلی اور ابدی قوانین کے انکشاف کو اپنا فریضۂ اعلیٰ جانتی ہے جو سارے عالمِ اخلاقی میں رائج ہیں اور جن کے زیرِ فرمان معیشتِ انسانی کا علاقہ بھی ہے ان کا مقصدِ تلاش اور مطلوبِ جستجو "معیشتِ صحیحہ" ہے یعنی وہ معیشت جو مقصدِ حیاتِ انسانی اور مقصدِ کائنات کے مطابق اور انسے ہم آہنگ ہو۔ یہی "معیشتِ صحیحہ وصالحہ" ان معیاریوں کا مرکزی تصور ہے جس سے دوسرے تمام مسائل مثلاً "مناسب اور صحیح اجرت" "مناسب اور صحیح قیمت" "مناسب اور صحیح تقسیم دولت" "سود کا جواز و عدم جواز" خود بخود طے ہو جاتے ہیں . . . .

انکے نظام میں قدرِ اعلیٰ "معیشتِ صحیحہ" ہے باقی سب اس سے ادنیٰ اور اس کے ماتحت قدریں ہیں۔ معاشیات کا کام یہ ہے کہ اس قدرِ اعلیٰ کا پتہ چلائے ماتحت

قدروں کی اس سے مناسب، مطابق تشکیلات کو معلوم کرے اور جو معاشی ادارے واقعی موجود ہیں ان کو اس معیار پر پرکھ کر انکے کھرے کھوٹے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔"

"ترتیبی معاشیات" علم طبیعات کی ایک شاخ ہے جو علوم طبیعی کی اساس و بنیاد پر اپنی عمارت استوار کرتی ہے، مگر عملی زندگی میں اسکی قدر و اہمیت کے اعتراف کے باوجود اس کا سنگ بنیاد کیا ہے؟ وہ محترم مصنف کے اس پارۂ بیان سے ظاہر ہوتا ہے:۔

ان تینوں گروہوں (معروضیہ۔ موضوعیہ۔ ریاضیاتی) میں مشترک یہ ہے کہ سب کے سب فلسفہ کے مقابلہ میں "علم" کے حامی ہیں۔ یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو ہونا چاہئے اس سے سروکار نہیں رکھتے، تمام مافوق التجربہ اور مابعد الطبیعی عناصر سے اپنے "علم" کو پاک اور صاف رکھنا چاہتے ہیں اور معاشیات میں اخلاقی احکام کے سختی سے مخالف ہیں۔ [۱] ......

ان سب کے نزدیک علوم طبیعی زیادہ مکمل علوم ہیں، انھیں سے تمام دوسرے علوم میں خصوصاً معاشیات میں نمونہ کا کام لینا چاہئے لہٰذا ترتیبی معاشیات کا مقصد یہ ہے کہ "قوانین" مرتب کرے تاکہ ہر منفرد مظہر معاشی کو کسی قانون کے تحت میں بحیثیت ایک مخصوص دفعہ کے لایا جا سکے کہ یہی انکے نزدیک نظری علم کی کائنات ہے۔ [۲]

علم المعیشت کے مشاہیر علماء یورپ اسی نظریئے کے حامی ہیں مثلاً جان اسٹارٹ مل (Ihon straart mil) کارل منگر (Carl minger) کارل مارکس (Carl marx)۔ پریٹو (Parito) وغیرہ

"افہامی معاشیات" کو علم تمدن کا ایک جز سمجھنا چاہئے اور تمدن سے بھی وہ تمدن مراد ہے جو انسان ہی کا تمام ساختہ پرداختہ ہے اسلئے کہ افہام کی بنیاد و اساس اس اصول پر قائم ہے کہ ہم جنس ہی کے لئے ہم جنس کا سمجھنا ممکن ہے چنانچہ اسکی تعبیر یوں کی جاتی ہے:۔

---

[۱] معاشیات، مقاصد اور منہاج از ڈاکٹر ذاکر حسین ص ۱۰-۱۱ [۲] ایضاً ص ۷

"افہام کا یہ نظریۂ علم ان بنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم یعنی ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لئے ممکن ہے اور یہ کہ ہم پورے طور پر اور ہر پہلو سے اس چیز کو جان سکتے، سمجھ سکتے ہیں جسے ہم خود بنا بھی سکیں، مظاہرِ تمدن کے فہم کی کوشش میں چونکہ مُدرِک بھی ذہنی ہو اور مدرَک بھی تشکیلِ ذہنی۔ اس لئے دونوں ہم جنس ہیں اور اس لئے پورا علم ممکن ہے پھر سارا تمدن آدمی کا ساختہ پرداختہ ہے، اسی نے اسے بنایا ہے اس لئے یہ اُسے سمجھ سکتا ہے، قدرت چونکہ ذہنِ انسانی کی خارجی شکل نہیں ہے بلکہ امرِ الٰہی کی خارجی تشکیل ہے، قدرت انسان کی ساختہ پرداختہ بھی نہیں اس لئے قدرت کا سمجھنا، قدرت کا پورا پورا حقیقی علم ذہنِ انسانی کے لئے ممکن نہیں ہے......

لیکن معاشیات افہامی چونکہ صرف تمدن کے ایک ٹکڑے کو سمجھنا چاہتی ہے تمدن زندگی یا انسانی زندگی کے مقصد و منشاء مضمر کا پتہ چلانا نہیں چاہتی......

اسی لئے افہامی معاشیات فلسفہ یا مابعد الطبیعات یا مذہب نہیں بلکہ سیدھا سادہ تجربی جماعتی، تمدنی علم ہے۔ لہ

یہ ہیں علم المعیشت کے وہ نظریے جو موجودہ دور میں اس تمدنی علم کے مایۂ ناز سمجھے جاتے اور اسکو ایک "علم و فن" کی حیثیت بخشتے ہیں۔

اسلامی نظریہ معاشی اور جدید نظریئے

لیکن اسلامی "نظامِ معیشت" کی حدود ان نظریوں سے زیادہ وسیع اور اس کی پروازِ فکر ان سے کہیں زیادہ بلند ہے وہ جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا جا چکا اور آئندہ تفصیلی طور پر آئیگا "اپنے معیاری نقطۂ نظر میں اُن تمام افکار کا بھی حامل ہے جن کا ذکر مقالہ میں موجود ہے اور ان سے وسیع تر افکار کو بھی اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہی۔ اسی طرح وہ افہامی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ وسیع اور بہت زیادہ نافع نظامِ عمل کا بانی اور موسس ہے۔

لہ معاشیات، مقصد و منہاج ص ۷۹-۸۰ از ڈاکٹر ذاکر حسین۔

مثلاً جبکہ "معیاری معاشیات" کا اساسی تصور "معیشتِ صالحہ" کا تصور ہے تو گذشتہ سطور میں اسلامی نظامِ معاشی میں "معیشتِ صالحہ" کی جو تشریح کی گئی ہے کیا اس سے بڑھ کر معیشت کے صالح ہونے کا تصور کسی بھی معاشی نظام میں موجود ہے اور کسی معاشی نظام کا نظریہ فکر اس معراج اور رفعت پر پہنچا ہے کہ وہ "معاشی نظام کی غرض و غایت صرف رفعِ حاجات و احتیاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پُر کرنا ہی قرار نہ دیتا ہو بلکہ اسکو ذریعہ بناتا ہو اقوام کی باہمی اخوت و ہمدردی اور مساوات و مواسات کا وسیلہ قرار دیتا ہو اخلاقی رفعت اور ابدی سعادت کے حصول کا؟

اور جبکہ "الہامی معاشیات" کا نقطۂ نظر، نظر اور فکر کی جگہ موجودہ عملی معاشیات کا محور و مرکز ہے اور تمدن کے اس شعبہ کو جماعتی، تمدنی اور تجرباتی حیثیت سے بروئے کار لاتا ہے تو آئندہ صفحات اس امر کی شہادت دینگے کہ تمدن کے اس ٹکڑے کو جس طرح اسلامی "علم المعیشت" نے سلجھایا اور اس کو طبقاتی جنگ اور سرمایہ داری کے غلبہ، دونوں سے جدا رہ کر جس طرح عملی کسوٹی پر کسا اور تجرباتی خراد پر اتارا اس سے بہتر اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر دوسرا کوئی نظامِ عمل نظر نہیں آتا۔

رہا "ترتیبی معاشیات کا نظریہ" تو وہ اپنی فلسفیانہ اور طبیعاتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے اسلامی نظریۂ معاشیات سے بالکل جدا بلکہ متضاد ہے البتہ اس کے باوجود بھی اس کے چند جزوی پہلو جو اس نظریہ کی پابندی سے الگ اپنی جگہ مستقل ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتے ہیں تو اسلام کا نظامِ معاشی ان خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے۔

مثلاً جب کہ معاشی نقطۂ نظر میں سب سے پہلا معاملہ ان اعمال سے وابستہ ہے جو رفعِ حاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پاٹتے ہیں تو خواہ کسی اسلوب سے بھی ہوں ان اعمال میں نقص و کمال اور تنزل و ترقی کا ہونا لازمی ہے اور یہی سبب بنجاتا ہے ایک ایسے فلسفہ کا جو ترتیبی درجات پر بحث کرتا اور انکے نقص و کمال کو واضح کرتا ہے اور یہ اسلامی معاشیات

میں اگرچہ کوئی خاص فن کی حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ نے اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اس کو "ارتفاقات" کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور اسکے مختلف درجات قائم کئے ہیں اور ان کو عملی معاشی نظام، تدبیر منزل، اور سیاست مدن وغیرہ کے لئے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت دی ہے۔ بس موجودہ علم المعیشت کے یہ نظریئے ایک علم وفن کی حیثیت سے "اسلامی معاشیات" میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اس قسم کی فنی اور علمی کاوشوں کے مقابلہ میں ایسے اصول اور ان اصول کے ماتحت ایسے علمی نظام کا داعی ہے جو انسانوں کی عام رفاہیت، خوشحالی، اور انکے امن واطمینان کے لئے آلہ کار بنیں اور معاشی راہ سے انسانوں کے درمیان غالب ومغلوب اور ظالم ومظلوم کی تقسیم کے لئے مانع ہوں۔

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ "جدید علمی دور" میں منجملہ دیگر علوم وفنون کے "علم المعیشت" کو بھی بڑی حد تک ایک علم وفن کی حیثیت حاصل ہو اور بڑے بڑے علماء یوروپ وایشیاء نے اس پر ضخیم تصانیف پیش کی ہیں لیکن اس تمام این وآں اور چنین وچناں کے باوجود "علم المعیشت" کا اصل مقصد یعنی عام رفاہیت وخوشحالی آجتک عنقا ہی ہوئی ہے اور دولت وذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں اسطرح آگئے ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لئے زندگی "موت" سے زیادہ بھیانک بنگئی ہے۔ بخلاف اس دور (دور نبوت وخلافت راشدہ) کے کہ وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں مگر عام خوشحالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلا لحاظ مسلم وکافر، مؤمن ومشرک، مرد وعورت صغیر وکبیر اور اجیر ومستاجر سب ہی امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے۔ اور تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ اس دور میں ایک وقت مملکت اسلامیہ کے اندر ایسا آیا ہے کہ لوگ صدقات کے مال کو لئے پھرتے تھے مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا [1]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۴۴۔

معاشی نظام کا منشاء

علاوہ ازیں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشاء اور محرک کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پشت پر ایک خاص ذہنیت کارفرما ہوتی ہے پس کسی "معاشی نظام" کے صالح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اسکے محرکات اور اس کے منشاء کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے سو اگر اس کی پشت پر فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سرتاسر فساد ہیں تو بلاشبہ "وہ نظام" فاسد نظام" ہے اور اگر اس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اسکا منشاء خیر ہی خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں

اس اصول کے پیش نظر جب ہم "معاشی نظام" پر گہری نظر ڈالتے اور فکر عمیق سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اسکے محرکات و منشاء یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صورتوں میں محدود پاتے ہیں۔ ایک یہ کہ "معاشی نظام" کو اس لئے قائم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے "ھل من مزید" کا نعرۂ نفع بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جا کر ختم نہ ہو سکے۔

یہ نظریہ سرمایہ دارانہ نظام کا بانی اور موسس ہے اور اسی کے زیر اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے "فورڈ کمپنی" کا مالک کروڑپتی اور ارب پتی ہونیکے باوجود بھی مارکیٹ میں ترقی اور اضافہ ہی کا خواہشمند رہتا ہے کیونکہ وہ "معاشی نظام" کے جس ماحول میں جدوجہد کر رہا ہے اس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے اور سودے بازی پر قائم ہے اور یہ صرف اربابِ دولت و ثروت ہی کو اور زیادہ بلند کرتا اور باقی تمام انسانی آبادی کو افلاس و احتیاج سے دوچار بناتا ہے، یہاں رفعِ حاجات و تکمیلِ ضروریات کے محرکات کام نہیں کرتے جو عام رفاہیت کا پیغام لائیں اور خوشحالی کو بحال کریں۔

دوسرے یہ کہ "معاشی نظام" کا محرک اور منشاء نفع بازی نہو بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور رفعِ حاجات ہو اور اس کے مقصد کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے صرف یہ ذہنیت کام

کر رہی ہو کہ انفرادی و اجتماعی احتیاجات کو پورا کیا جائے نہ کہ زیادہ سے زیادہ نفع کو پیش نظر رکھا جائے۔

"معاشی نظام" کے ان ہر دو محرکات یا ہر دو ذہنیتوں میں سے اسلام ایک ایسے "معاشی نظام" کا بانی اور مؤسس ہے کہ جسکی بنیاد صرف کائناتِ انسانی کی رفعِ حاجات ضروریات اور انفرادی و اجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے۔ وہ معاشیات کو دولتمندوں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان نہیں بنانا چاہتا بلکہ رفع حاجات و تکمیلِ ضروریات کیلئے ایک مفید اور نفع بخش ذریعہ بناکر اسکی افادیت کو عام کرنا چاہتا ہے۔

(گویا اس نظامِ معیشت میں) بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد ہوں گے کیونکہ سعی و کسب کے بغیر کوئی مؤمن زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائیگا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا اور اسلئے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوشحال ہوتی جائیگی قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے۔ لیکن صرف اپنے ہی لئے نہیں کمائیں گے تمام افرادِ قوم کے لئے کمائیں گے، یہ صورت پیدا نہ ہوسکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لئے محتاجی و مفلسی کا پیام ہوجائے جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے[۱]

اس تمام تر تفصیل کے بعد اب غور کیجئے کہ جب "معاشی نظام" کے کل پرزے اس طرح ڈھالے گئے ہوں اور اس کا نشو و نما اور اسکی ترقی ایسے ترتیبی اجزاء پر قائم ہو جو صرف طبیعات ہی تک اگر نہ ٹھہر جائیں بلکہ اخلاقی اور مذہبی محاسن کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے مذہب اور دستورِ الٰہی کے زیر فرمان عالم وجود میں آئیں اور اسکے متحرک فلاح دارین اور سعادتِ کائنات کے وہ اصول ہوں جنمیں معاشیات "رفعِ حاجات اور تکمیلِ ضروریات"

[۱] ترجمان القرآن مولانا ابو الکلام آزاد ج ۲ صفحہ ۱۳۲۔

کے لئے ہو نہ کہ زیادہ سے زیادہ سودا بازی اور نفع طلبی کے لئے تو ایسے صالح اور صحیح نظام معاشی کا وجود بلا شبہ دنیا کے لئے پیام رحمت او دعوت امن وسلامتی ہے۔

الحاصل "اسلامی معاشی نظام" ایسا بہتر نظام ہے جو اپنے اندر "علم المعیشت" کے قدیم وجدید نظامہائے مذہبی وعقلی کے تمام محاسن سموئے ہوئے ہے اور اس سے بھی زیادہ خوبیوں کا مالک ہے اور انکے معائب ونقائص سے یکسر خالی بلکہ ان کے مسموم اثرات کا بے نظیر تریاق ہے۔ اور ان تمام محاسن کے علاوہ اس کو یہ برتری حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے دماغ کی اختراع نہیں ہے کہ جسکی بنیاد انتقام یا طبقاتی منافرت جیسی خام کاریوں پر رکھی گئی ہو بلکہ وہ نظام کائنات کے خالق کا بنایا ہوا نظام ہے۔

اصولِ معاشیات قرآنِ عزیز کی روشنی میں

یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآنِ عزیز نے اپنی اساسی روش کے مطابق عبادات، معاشرتی معاملات، سیاسیات، اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشیات میں بھی صرف اساسی اصول اور معجزانہ اختصار کے ساتھ اصول وکلیات کا ہی ذکر کیا ہے اور ان کی تفصیلات وتشریحات کو ارشادِ نبوی (احادیث) اور ان سے مستنبط احکام (فقہ) کے حوالہ کر دیا ہے۔

حقِ معیشت میں مساوات

معاشیات سے متعلق قرآنِ عزیز نے جن اساسی اصول کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذاتِ الٰہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحتِ عام اور حکمتِ تام کا تقاضہ یہ ہے کہ دنیا کے اس تنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوتِ درجات پایا جائے لیکن امارت وغربت کے فطری تنوع کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے۔ کیونکہ اس نے حقِ معیشت کو سب کے لئے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی اس حقِ مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔

اللہ تعالےٰ ہر فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر ایک جاندار کی معیشت اسکے ذمہ ہے اسکے لئے حسبِ ذیل نصوص قابلِ مطالعہ ہیں

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ہود)	اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔
وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (الذاریات)	اور تمہارا رزق اور جس شے کا تم وعدہ دیئے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالےٰ کے ذمہ میں) ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ	اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو
اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ	ہم ہی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی ۔
اِيَّاهُمْ (انعام)	(انعام)
وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ	اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے ؟
الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (نمل)	کیا اللہ تعالےٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ؟
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ	بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے ، بڑی
الْمَتِيْنُ ۝ (الذاریات)	مضبوط قوت والا ہے ۔
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ	اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں معیشت کے
وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝	سامان بنادیئے اور ان کے لئے جن کو تم روزی نہیں
(الحجر)	دیتے ۔
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا	وہ (خدا) وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تمہارے لئے
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ)	وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے ۔

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فردِ بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسبابِ معیشت خدائے تعالےٰ کے خزانۂ عامرہ کی ایسی عطا و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو برابر کا حق ہے ۔

اور ان آیات کی اس روح کی زیادہ وضاحت و صراحت حسبِ ذیل آیات کرتی ہیں :

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا	اور رکھے اس زمین میں بوجھل پہاڑ اس کی (پیٹھ) پر اور
وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا	برکت رکھی اسکے اندر اور چار دن میں اندازہ سے رکھیں
فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ وَاللّٰهُ	اسمیں ان کی خوراکیں جو برابر ہیں ، بلحاظ طلب معیشت (سب حاجتمندوں کیلئے)
فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق

؎ روح المعانی ج ۲۴ ، البحر المحیط ج ۷ ص ۴۸۶ ۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (نحل)

میں برتری دی ہے پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ روزی دیگئی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیردستوں پر لوٹا دیں کہ اس روزی میں وہ سب کے سب برابر ہو جائیں پھر کیا اللہ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں [1]

ان آیات میں حقِ معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور صریح اعلان ہے وہ آپ اپنی مثال ہے اور اس کا انکار بداہت و صراحت کا انکار ہے۔

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

لیکن اب سوال یہ ہے کہ منشاءِ الٰہی کے اس مقصدِ عظیم کو پورا کون کرے اور اس عالمِ اسباب میں اس کی تکمیل کس کے ذمہ واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے وہ بآسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس "عالمِ تشریع" میں یہ فریضہ نائبِ الٰہی "خلیفہ" پر عائد ہوتا ہے کہ قلمروِ اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حقِ معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حقِ معیشت میں دراندازی بن سکے اور جو حکومت اس منشاءِ الٰہی کو پورا نہیں کرتی وہ "فاسد نظام" کی حامل اور نظامِ عادل سے منحرف ہے چنانچہ

---

[1] روح المعانی جلد ۱۴ البحر المحیط جز ۵ سورۂ النحل و تفسیر فتح القدیر جلد ۳ اس آیت کے ایک معنی یہ بھی کئے جاتے ہیں وجوزان یکون معنی الاٰیۃ ان اللّٰہ تعالٰی فضل بعضنا علٰی بعض فی الرزق وان المفضلین لا یردون من رزقھم علی من دونھم شیئاً وانما انا رازقھم فالمالک والمملوک فی اصل الرزق سواء وان تفاوتا کمًّا وکیفاً ۔ واختار فی الکشاف ان المعنی انہ سبحانہ جعلکم متفاوتین (افبنعمۃ اللّٰہ یجحدون) ویکون المعنی علی قراءۃ الخطاب ان المالکین لیسوا برادی رزقھم علٰی ممالیکھم بل انا الذی ارزقھم فی الرزق فرزقکم افضل رزق مما بد لکم وھم بشر مثلکم واخوانکم وکان ینبغی ان تردوا الفضل ما رزقتموہ علیھم حتی تساووا فی الملبس والمطعم کما یحکی عن ابی ذر رضی اللّٰہ عنہ (روح المعانی جلد ۱۴) وا باھم فلا یعطوا انھم یعطونہم شیئاً وانما ھو رزقی اجریہ علٰی ایدیھم وھم جمیعاً فی ذلک سواء لا مزیۃ لھم علٰی ممالیکھم فیکون المطارف علیہ المقدار، یناسب ھذا المعنی یقال لا یفھمون ذلک فیجحدون نعمۃ اللّٰہ ۔ فتح القدیر للشوکانی ج ۳ ص ۱۰۱ وکذا فی البحر المحیط جلد ۵

بقرہ کی اس آیت هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب (نور اللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے ہیں:-

جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان "خلق لکم ما فی الارض جمیعاً" تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے۔ اور کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوک خاص نہیں بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترک ہو اور من وجہ سب کی مملوک ہے ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تلک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے اسوقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک وقابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اسکو اوروں کے حوالہ کر دے کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اسکے ساتھ متعلق ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا گو زکوٰۃ بھی ادا کردیجائے اور انبیاء وصلحاء اس سے بغایت مجتنب رہے چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہو بلکہ بعض صحابہؓ وتابعین وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرما دیا۔ بہرکیف غیر مناسب وخلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہی ہے کہ زاید علے الحاجت سے اسکی تو کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک "من وجہ" اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور من وجہ مال غیر پہ قابض ومتصرف ہو اور اس کا حال بعینہٖ مال غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیئے وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصول انتفاع "بقدرت حاجت" ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اسکا حال آپ کو بھی معلوم ہو کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا) [۱]

اور مشہور محدث ابن حزم ظاہری نے اس سلسلہ میں محلّٰی میں جو روایات نقل کی ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

عن ابی سعید الخدری ان	حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہا سے روایت

[۱] ایضاح الادلہ ص ۲۶۸۔

رسول الله صلى الله عليه وسلم قال "من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل من زاد فليعد به على من لا زاد له" قال: فذكر من اصناف المال ما ذكر حتى رأينا انه لا حق لاحد منا في فضل (محلی ج ۶ ص ۱۵۷-۱۵۸)

ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس قوت وطاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں اسکو چاہیئے کہ اس فاضل سامان کو کمزور کو دیدے اور جس شخص کے پاس سامان خورد ونوش حاجت سے زائد ہو اسکو چاہیئے کہ فاضل سامان نادار اور حاجتمند کو دیدے۔ ابو سعیدؓ خدری فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلعم اسی طرح مختلف انواع مال کا ذکر فرماتے رہے حتی کہ ہم نے یہ گمان کرلیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔

قال عمر بن الخطابؓ لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين۔ [1]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا ہے اگر اسکا پہلے سے اندازہ ہوجاتا تو میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء مہاجرین میں بانٹ دیتا۔

وصح عن ابی عبیدة الجراح وثلث مائة من الصحابة رضی الله عنهم، ان زادهم فنی فامرهم ابو عبیدة فجمعوا ازوادهم فی مزودین ف

حضرت ابو عبیدہ اور تین سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعلق یہ روایت صحت کو پہنچ چکی ہے کہ ایک موقعہ پر ان کا سامانِ خورد ونوش ختم کے قریب لگا پس حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) نے حکم دیا کہ جس جس کے پاس جسقدر موجود ہو وہ حاضر کرو

[1] ابن حزم اس روایت کی سند پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں "وهذا اسناد فی غاية الصحة والجلالة" اور یہ سند نہایت صحیح اور پر از جلالت ہے" (محلی ابن حزم ج ۶ ص ۱۵۸)

جعل يقوتهم اياها على	اور پھر سب کو یکجا جمع کر کے ان سب میں برابر تقسیم
السواء۔ ؎۱	کر کے سب کی قوتِ لایموت کا سامان کر دیا۔"
عن محمد بن علی انہ سمع علیؓ	حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ
بن ابی طالب یقول: ان اللہ تعالیٰ	نے اہلِ دولت کے اموال پر انکے غریبوں کی معاشی حاجت
فرض علی الاغنیاء فی اموالھم	کو بدرجۂ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے پس اگر وہ
بقدر ما یکفی فقراءھم، فان	بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہونگے وہ
جاعوا او عروا او جھدوا فبمنع	محض اسلئے کہ اہلِ ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے اور
الاغنیاء وحق علی اللہ تعالیٰ	اس لئے اللہ تعالےٰ ان سے قیامت کے دن اس کی
ان یحاسبھم یوم القیمۃ و	باز پرس کریگا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دیگا۔
یعذبھم علیہ ؎۲	

یہ اور اسی قسم کی دوسری احادیث اور آیاتِ قرآنی کو دلیل میں پیش کرتے ہوئے مشہور محدث ابن حزم ظاہریؒ یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں :۔

اور ہر ایک بستی کے اربابِ دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غربا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مالِ فے (بیت المال کی آمدنی) ان غربا کی معاشی کفالت کو پوری نہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان اربابِ دولت کو اس کفایت کے لئے مجبور کر سکتا ہے (یعنی انکے فاضل مال سے بجبر لیکر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے) اور ان کی زندگی کے اسباب کیلئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ انکی ضروری حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لئے گرمی اور سردی دونوں موسم کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لئے ایک ایسا مکان ہو جو انکو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔ ؎۳

؎۱ محلی ج ۶ ص ۱۵۸۔ ؎۲ ایضاً ؎۳ محلی ج ۶ ص ۱۵۶ مسئلہ ۷۲۵۔

اور حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی روایت پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"اس بات پر صحابہؓ کا اجماع ہے کہ کوئی شخص بھوکا ننگا یا ضروریاتِ رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔" [۱]

اب ان تمام نصوصِ قرآنی اور ان کی مؤید احادیث و فقہی روایات کو سامنے رکھ کر بہ نظرِ انصاف غور فرمائیے کہ "اسلام کا معاشی نظام" حقِ معیشت کی مساوات کا کس طرح صاف اور واضح اعلان کرتا اور امیر اسلام کے اختیارات میں وسعت دے کر اسکی حفاظت کے لئے کس قدر عادلانہ دستور قائم کرتا ہے؟

ایک شبہ کا جواب

جو دماغ اسلامی نظام کے حقائق سے ناآشنا اور موجودہ فاسد نظام ہی کو "کہ جس میں امارت و غربت کا قابلِ نفرت حد تک تفاوت نظر آتا ہے" اسلامی نظام سمجھے ہیں ان کے لئے یہ باتیں بلاشبہ حیرت زا ہیں اور ان میں سے بعض تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے جب خود ہی لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو محروم المعیشت پیدا کیا ہے اور غربت و امارت کا یہ فرق بھی "کہ ایک کروڑ پتی ہے اور دوسرا نانِ جویں سے بھی محروم" اسی کا بنایا ہوا ہے تو پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ حقِ معیشت میں تمام افرادِ انسانی مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی فرد اس کائنات میں محروم المعیشت نہ رہے۔

اور بعض اس گمراہی میں ہیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے اسلامی نظام کو ہمہ گیر ثابت کرنے کے لئے ایک جدید کوشش ہے جو دنیا کے رجحانات اور وقت کے تقاضوں کے سامنے سپر ڈالتے ہوئے احکامِ الٰہی کی ترمیم و تبدیل کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے یا اشتراکیت و اشتمالیت سے مرعوب ہو کر قبا مارکسزم کو اسلام کے جسم پر موزوں کیا جا رہا ہے لیکن افسوس اور صد ہزار افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں خیالات، وساوس اور اوہام

---

[۱] محلّی ج ۶ ص ۱۵۸۔ تمام ائمہ مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

فاسدہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور درحقیقت یہ نتیجہ ہے اس عام بے خبری کا جو اسلامی تعلیم کے متعلق مسلم فضا میں ابر محیط کی طرح چھائی ہوئی ہے اور یہ ثمرہ ہے اپنے حقائق سے یکسر ناآشنا رہتے ہوئے اس امر عوبیت کا جو مغربی تعلیم کی بدولت ہم پر طاری وساری ہے۔

یہ دونوں خیالات، وسوسہ یا مغالطہ کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ہم اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ عالم تکوین اور عالم تشریع میں کیا فرق ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس قانون الٰہی کو کائنات کی کامرانی کا واحد حل تجویز فرمایا ہے، ذی عقل کائنات عالم کو جیکے امتثال کی تکلیف دی ہے اور جس کی تعمیل کے لئے مکلف بنایا ہے اسکا تعلق تکوینیات سے ہے یا تشریعیات سے؟ سو اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیتے تو بلاشبہ اس قسم کے وساوس اور اوہام کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خالق کائنات نے کائنات کے آغاز و انجام کا جو تکوینی نظام بنایا ہے اس کا تمام تر تعلق صرف اپنی ذات احدیت ہی کے ساتھ رکھا ہے اور اس میں کسی دوسرے کے دخل کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور نہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ نظام تکوینی میں کسی شے کے لئے کیا ہے اور کیا نہیں اور نہ اس علم کا ہم کو مکلف بنایا گیا ہے اور اس کا تعلق سر تا سر "عالم تکوین" سے ہے البتہ اس نے حضرت انسان (ثقلین) کو جب کہ عقل و شعور اور ادراک و تمیز عطا فرمائے ہیں تو اس عطاء و بخشش کے بعد اس کو یونہی بیکار اور معطل نہیں چھوڑ دیا بلکہ اشیاء کے حسن و قبح اور اپنی مرضیات و نامرضیات کی معرفت اور ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں امتیاز کے لئے نیز افراد کو اجتماعی سلک میں منسلک کرنے کے لئے ایک بہترین "نظام" عطا فرمایا اور اس میں اچھی اور بری دونوں راہوں کو واضح کر دیا "وھدینٰہ النجدین" اس نظام کا نام "نظام تشریعی" ہے اور کائنات میں "پہلے انسان" کے ساتھ ساتھ یہ "نظام" عالم تشریع پر حاوی ہے اور انبیاء اور رسل کے ذریعہ برابر دنیاء انسانی پر کارفرما رہا ہے اور اس کی فلاح و بہبود کا ضامن و کفیل ہے پس یہی وہ نظام ہے جس کا انسان مکلف ہے اور اسی کے

امتثال کے لئے وہ مامور ہے اور یہی وہ نظام ہے کہ جب حد کمال کو پہنچا تو "قرآنِ عزیز" کی شکل میں جلوہ افروز ہوا۔

پس اگر یہ بنیادی حقیقت ہمارے پیش رہے تو ہم باآسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے دائرہ سے یہ باہر ہے کہ ہم "نظام تکوینی" سے بحث کریں بلکہ ہم صرف "نظامِ تشریعی" (قانونِ تشریعِ الٰہی کے دائرہ میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں تو اب قرآنِ عزیز سے نقل شدہ نصوص کو ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجیے کہ کیا ان نصوص کی مراد یہ ہی کہ چونکہ اللہ تعالےٰ نے اپنی مصلحتِ عام اور حکمتِ بالغہ کی بنا پر کائناتِ انسانی میں امارت وغربت کے تفاوتِ درجات کو خلق کیا ہے اس لئے مردِ مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس تفاوتِ درجات کو ترقی دینے کے لئے ایسا نظام قائم کرے کہ تمام ثروت و دولت امیروں کے ہاتھ میں آجائے اور کروڑوں فقیر اور محتاج بنکر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان آفرین کو جان سپرد کریں اور اس طرح "العیاذ باللہ" منشاءِ الٰہی کو پورا کریں؟

اور اگر ان آیاتِ قرآنی کا مطلب یہ نہیں ہے تو پھر اسکے سوائے دوسرا کیا مطلب ہو سکتا ہی کہ درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حقِ معیشت میں تمام کائناتِ انسانی مساوی اور برابر کی شریک ہے اور کسی صاحبِ ثروت کی دولت وثروت غریبوں کی غربت میں اضافہ کرنیکے لئے نہیں ہی بلکہ خدا کی وہ امانت ہی جو اجتماعی نظام کے زیرِ فرمان غربا و مساکین کی غربت و مسکنت کو فنا کرنیکے لئے استعمال ہونی چاہئے گویا صاحبِ ثروت کی ثروت غربا کی غربت کے لئے رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت۔

اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے "اجتماعی معاشی نظام" کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے اور اگر بیت المال کا مالیہ کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلمروِ خلافت میں محروم المعیشت انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمایہ سے بجبر حاصل کر کے

"حقِ معیشت کی مساوات" کو بروئے کار لائے خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام "عائد شدہ مالی فرائض وحقوق" ادا کر چکے ہوں۔

الحاصل قرآنی نصوص اور ان کی مؤید احادیثِ رسولؐ اور ان سے مستنبط فقہی احکام یہ واضح کرتے ہیں کہ "حقِ معیشت کی مساوات" کا یہ نظریہ منشاءِ الٰہی کے خلاف نہیں بلکہ عین منشائے الٰہی کے مطابق ہے اور یہ جدید نظریہ نہیں ہے کہ مارکسزم کی حمایت یا اس سے مرعوبیت کی بنا پر احکامِ اسلامی کی انوکھی تعبیر کے ذریعہ وجود میں آیا ہو بلکہ اسلام کا وہ بنیادی اور اساسی "حکم" ہے جو اپنے وجود سے آج تک غیر متبدل اور غیر متزلزل رہا ہے اور اگر ہم نے اسکو سمجھنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی یا دوسرے انسانوں کے اختراعی معاشی نظاموں سے مرعوب ہو کر ہم نے "اسلامی معاشی نظام" کو یکسر بھلا دیا تو اس میں اپنا قصور ہے نہ کہ اسلامی نظام کے بیان کرنیوالے اور اسکی اصل حقیقت سے روشناس کرانے والے کا۔ اور یہ بھی سخت گمراہی ہے کہ ہم یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ غربت و امارت کا یہ غیر فطری تفاوت اور جابرانہ امتیاز جو آج ہم کو کائنات پر چھایا ہوا نظر آتا ہے خدا کا بنایا ہوا ہے بلکہ یہ فاسد نظامہائے معاشی" کے ثمرات ونتائج ہیں اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نظامہائے فاسد کو یک قلم سوخت ہو جانا چاہئے۔

درجاتِ معیشت

(۲) اگرچہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجاتِ معیشت میں مساوی نہیں ہیں اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کے لئے سامانِ معیشت ایک ہی طرح کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لئے مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہ بن سکے یعنی تفاوتِ درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ "معیشت" انسانوں کو دو طبقوں میں اسطرح تقسیم کردے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر وافلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ جائے۔ قرآنِ عزیز نے اس تفاوتِ درجات کو

اس طرح بیان کیا ہے :۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (زخرف)	"دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کردی ہے اور اسکو اسطرح کردیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہو"
اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (رعد)	"اللہ جسکے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جسکے لئے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے"
وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰكُمْ (انعام)	"اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایکدوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے"
وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (نحل)	"خدا نے تعالےٰ نے تم میں بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں کہ اس روزی میں سب برابر ہو جائیں۔ پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں" [1]

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت ایک خاص قسم کی آزمائش پر مبنی ہے یعنی اللہ تو ایک جانب غنی کو صاحبِ ثروت بنا کر اس سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو تنہا اپنی ملکیت نہ سمجھے بلکہ "انفرادی ملکیت کے باوجود" یہ یقین رکھے کہ وہ جسقدر زیادہ کمائیگا اسی قدر اس کی دولت پر اجتماعی حقوق زیادہ عائد ہونگے اسلئے کہ وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں کماتا بلکہ جماعت کے دوسرے افراد کے لئے بھی کماتا ہے۔

---

[1] روح المعانی، فتح القدیر، البحر المحیط تفسیر سورۂ نحل۔

نیز یہ ذہن نشین رہے کہ درجات کا یہ تفاوت جماعت کے دوسرے افراد کو محروم المعیشت بنانے اور ذاتی اغراض کی خاطر معاشی دستبرد کرنیکے لئے نہیں ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ خدا کی نعمت (عطاء ثروت) کا جاحد (منکر) ہے (اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ) کیونکہ یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے بلکہ انفرادی حاجات وضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات وضروریات کی تکمیل ہے۔

اور دوسری جانب غیر متمول سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متمول افرادِ ملت کے تموّل کو دیکھکر خدا کے ساتھ کفران اور ناشکر گذاری نہ اختیار کرے اور نہ حسد و بغض کو دل میں جگہ دے بلکہ طمانیت قلب کے ساتھ اپنی مختصر فارغ البالی اور خوشحالی پر شاکر رہے[۱] - اور یا پھر عملی جد و جہد میں آگے بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوق معیشت سے متمتع ہو اور غنا و دولت حاصل کرے جن کو تمام مخلوقِ خدا کے لئے عام اور مساوی کر دیا گیا - اور دوسرے افرادِ ملت کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو اپنے حاصل کردہ مال پر اسی طرح عائد کرے جس طرح قانونِ اسلامی نے دوسرے اربابِ دولت پر عائد کئے ہیں۔

احتکار و اکتناز کی حرمت

(۳) دولت اور سرمایہ داری کے وہ اصول قطعاً ناقابلِ تسلیم ہیں جن میں احتکار اور اکتناز کی کوئی صورت بھی بن سکے اور ان سے دولت و کنز پھیلنے اور تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے اور اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال بنا دے" اکتناز و احتکار کی حرمت اور انفاق کے وجوب کے لئے ذیل کی آیات قابلِ توجہ ہیں ":

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ	"اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی
وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ	کو اور اسکو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو انکو
بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ہ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ	دردناک عذاب کی خوشخبری دیدو جس روز کہ اس
	مال پر جہنم کی آگ دھکائی جائیگی پھر اس سے داغی

---

[۱] لفظ فارغ البالی اسلئے کہا گیا کہ اسلامی نظام حکومت میں کسی فرد کا محروم المعیشت رہنا ناجائز ہے۔

جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ
جُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ
لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

جائینگی انکی پیشانیاں، پہلو، ان کی پیٹھ (اور کہا
جائیگا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے گاڑ رکھا
تھا اور چکھو مزہ اپنے گاڑنے کا"

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ
مِنْكُمْ ۝

(حشر)

"فقراء مساکین، قرابت داروں اور یتیموں مسافروں
پر اللہ نے جو خرچ کرنے کا یہ طریقہ بتایا ہے اسلئے کہ تاکہ ایسا
نہو کہ مال و دولت صرف دولتمندوں ہی میں محدود ہو کر

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ
فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(توبہ)

"صدقات اور کسی کے لئے نہیں ہیں صرف فقیروں کے
لئے اور مسکینوں کے لئے اور انکے لئے جو صدقات کے وصول
کرنے پر مامور ہیں اور انکے لئے جن کے دلوں میں کلمۂ حق
کی الفت پیدا کرنی ہے اور انکے لئے جن کی گردنیں
(غلامی سے) آزاد کرانی ہیں اور قرضداروں کے لئے جو کہ
(قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کی راہ میں صرف
کرنے کے لئے (یعنی مجاہدین اور اعلاء کلمۃ اللہ میں مصروف
رہنے والوں کے لئے)، اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کی
جانب سے ٹھیرائی ہوئی بات ہے اور اللہ سب کچھ
جاننے والا حکمت والا ہے"

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (بقرہ)

"اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو"

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ
وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ
وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (انبیاء)

"اور ہم نے ان کی جانب (انبیاء علیہم السلام کی
جانب) وحی کی نیک کاموں کے کرنیکی اور نماز قائم کرنیکی اور
زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے"

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ

"اور جو ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ

اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ (منافقون) کرلو کہ تم میں سے کسی کے پاس آموجود ہو۔"

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (بقرہ) "اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے رکنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے)"

ان آیات میں ادائے زکوٰۃ وصدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے اور قرآنِ کریم میں ایک بہت بڑا ذخیرہ ان ہی احکام کی ترغیب و ترہیب، ان سے متعلق احکام اور تفصیلات پر مبنی ہے اور ان سب کی روح یہ ہے کہ دولت و ثروت جمع و ذخیرہ کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف خرچ کے لئے ہے اور اس کا مصرف ذاتی و انفرادی تعیش کی بجائے انفرادی و اجتماعی ضروریات کی کفالت ہے۔

اسی لئے ان آیات کی تفسیر میں "جمہور" کا مسلک یہ ہے کہ جس مال سے زکوٰۃ اور دوسرے مالی فرائض ادا نہ کئے گئے ہوں تو وہ مال احتکار و اکتناز کی فہرست میں شامل اور کنز سے متعلق وعید کا مصداق ہے اور اسی قسم کی دولت و ثروت کا نام "سرمایہ داری" ہے اور یہ حرام اور باطل اور تباہ کر دینے کے قابل ہے۔

اور اپنی ضروریات اور اہل وعیال کی حاجاتِ اصلیہ[۱] اور مالی فرائض و واجبات کی ادائیگی کے بعد بھی دولت باقی بچے تو اس کا پس انداز کرنا اگرچہ جائز ہے مگر خلافِ اولیٰ ہے کیونکہ اب اس مال پر اجتماعی حقوق عاید ہو چکے ہیں اور اب اسکو اجتماعی حاجات میں صرف ہونا چاہئے۔

جمہور کے خلاف حضرت ابوذر غفاریؓ[۲] اور بعض علمائے اسلام اس کو بھی جمع کر کے

---

[۱] مصارف کے موقعہ پر ہم نے جگہ جگہ لفظ حاجات کے ساتھ "اصلیہ" کا اضافہ کیا ہے یہ اسلئے کہ وہ تمام اخراجات مصارف نظامِ اسلامی میں غیر معتبر اور باطل ہیں جو اس کی نگاہ میں ممنوع یا حرام ہیں۔

[۲] کان من مذھب ابی ذر رضی اللہ عنہ تحریم ادخار ما زاد علی نفقۃ العیال وکان یفتی بذلک ویحثھم علیہ ویامرھم بہ۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ توبہ) ترجمہ ابوذر غفاریؓ کا مذہب یہ تھا کہ اہل وعیال کے نفقہ سے زائد روپیہ جمع رکھنا قطعاً حرام ہے وہ اسی کا فتوی دیتے، اسی کی تبلیغ کرتے اور اسی کا سب کو حکم دیتے۔

رکھنا حرام بتاتے ہیں۔

اور ان آیات زکوٰۃ و صدقات اور منعِ اکتناز و احتکار کے علاوہ آیاتِ میراث اور قانونِ وراثت بھی اسی حکمت پر مبنی ہے کہ دولت و ثروت "جمع و ذخیرہ" کے لئے نہیں ہے بلکہ تقسیم اور پھیلنے کے لئے ہے تاکہ اس کا افادہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو سکے۔

فاسد نظام معیشت کا انسداد اور سرمایہ و محنت میں عادلانہ توازن

(۴) خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں ہے جس سے فاسد نظامِ معیشت بروئے کار آئے یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے یا محنت اور معیشت کے لئے جائز جد و جہد بے حقیقت ہو کر رہجائے اور اس طرح محنت اور سرمایہ کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے اسی لئے اس نے ربوٰا (سود) کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار، قمار (جوا) کی تمام ظاہری و خفی اقسام و اصناف احتکار و اکتناز کی تمام اشکال اور اسی طرح کے عقود فاسدہ کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز اور مردود قرار دیا اور معاملات کے کسی شعبہ میں بھی "فاسد معاشیات" کو دخیل اور برکار نہیں آنے دیا۔ اور دوسرے شعبوں کی طرح معاملات کے اس شعبہ میں بھی عدل و انصاف ہی کو اساس و بنیاد قرار دیا ہے چنانچہ حسبِ ذیل تصریحات اسکی شاہد ہیں۔

اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (بقرہ)	"اللہ نے خرید و فروخت کے معاملات کو حلال کیا ہے اور سودی کاروبار کو حرام کر دیا ہے"
یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ (بقرہ)	"اللہ تعالیٰ سودی کاروبار کو مٹاتا اور صدقات و خیرات کو ترقی دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکر گذار گنہگار کو دوست نہیں رکھتا"
اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ	"بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں کار شیطان ہیں پس ان سے بچو"

ل وسلہ تفصیل آگے آئیگی۔

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (مائدہ)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ؕ (مطففین)	"خرابی ہے کمی کرنیوالوں کے لئے ان لوگوں کے لئے کہ جب ماپ کرلیں تو لوگوں سے پورا پورا بھرلیں اور جب ان کو ماپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں"۔
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ (ہود)	"اور تول کر دو برابر وزن کے ساتھ"۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نساء)	"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل (ناجائز طریقہ) سے نہ کھاؤ ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت ہو تو اس طرح کھا سکتے ہو (گویا ہر شخص اپنے حصہ کے مطابق اپنا حق لے"۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اسی اساسی اصول کی روشنی میں "باب ابتغاء الرزق" کے عنوان سے حسب ذیل نہایت پرشوکت اور مدلل مضمون تحریر فرماتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات کے لئے سب کچھ سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لئے مباح اور عام کر دیا۔ تو ان سے متمتع ہونے میں مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت شروع ہو گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب کوئی شخص سبقت اور پہل کر کے کسی شئے کو اپنے قبضہ میں کر لے یا مورث کے قبضہ کی وجہ سے اس کی وراثت میں آ جائے یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز طریقے قرار پا چکے ہیں تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس کی مقبوضہ شے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے البتہ دوسرے کی مقبوضہ شئے کو حاصل کرنیکا جائز طریقہ یہ ہے کہ باہم خرید و فروخت اور لین دین کے ذریعہ تبادلہ کی شکل پیدا کرے یا معتبر طریقوں سے باہمی رضامندی کا

معاملہ اسطرح انجام پاجائے کہ ہر دو جانب میں اس کے متعلق صحیح علم ہو اور اس معاملہ میں نہ التباس اور دھوکے کا دخل ہو اور نہ خلط ملط کرنیکی کوشش کی گئی ہو نیز چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون واشتراک کے بغیر ناممکن ہے اسلئے اللہ تعالےٰ نے تعاون اور باہمی اشتراک عمل کو واجب کر دیا اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے جو تمدن میں دخیل ہیں مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں۔

نیز اسبابِ معیشت کے "اسباب" بننے میں اصل الاصول یہ ہے کہ اموال مباح میں سے کسی شے کو اپنے قبضہ میں لیا جائے یا ان اموال مباح کے وسیلہ سے جو کہ مالی ترقی کا ذریعہ بنا کرتے ہیں اپنے مقبوضہ اور مشخصہ مال کو ترقی دیجائے مثلاً چرائی کے ذریعہ سے چوپایوں کی افزائشِ نسل یا زمین کی درستی اور پانی کی سیرابی کے ذریعہ سے زراعت وکاشتکاری۔

لیکن مالِ مباح کو اپنے لئے خاص کرنے یا دوسرے مباح اموال کو اپنے مال کی ترقی کا ذریعہ بنانے میں شرط اوّلین یہ ہے کہ تصرفات اس طرح عمل میں نہ آنے پائیں کہ ایک فرد دوسرے فرد کے لئے معاشی ذرائع کی تنگی اور ضیق کا باعث بنجائے اور اس طرح تمدن کو فاسد اور برباد کر دے (یعنی جبکہ حلال وسائلِ معاش سب کے لئے یکساں طور پر مباح اصل ہیں تو اب کسی شخص کو اپنی شخصی معاش کے لئے اسی قدر اس میں تصرف اور دعویٰ ملکیت جائز ہے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کی معاشی زندگی کی پریشانی کا باعث نہ بن جائے اور اس کی دولتمندی دوسروں کے افلاس اور فقر وفاقہ کا سبب نہ ثابت ہو۔)

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اگر "معاشی معاملات" میں لوگونکے

درمیان باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کے ذریعہ مالی ترقی و نشو و نما بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح بنیاد شوار سے دشوار تر ہو جائیگا۔ مثلاً ایک چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں لیجائے اور ایک معین مدت کے لئے وہ اس اباب وذہاب کی گارنٹی چاہتا ہے (یعنی تجارت کو ذریعہ معاش بناتا ہے) یا مثلاً ایک دوسرا شخص اپنی عملی جد و جہد کے ذریعہ دوسروں کے مال کی دلالی کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعہ معاش بناتا ہے) یا ایک تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے ذریعہ دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے۔ (یعنی صنعت وحرفت کو وسیلۂ معاش بناتا ہے) اور اس طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہوسکتی بہر حال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون واشتراکِ عمل ضروری اور واجب ہے اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقہ سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو جیسا کہ قمار (جوا) کا کاروبار ایسے طریقے سے عمل میں آئے کہ بظاہر تو تعاون نظر آتا ہو لیکن حقیقت میں وہ زبردستی کا تعاون ہو حقیقی تعاون نہو جیسا کہ مثلاً ربوا (سود) کا کاروبار۔ اسلئے کہ یہ بات بہت صاف ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لے لینے کے لئے مجبور و مضطر ہو جاتا ہے جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا اور اسکی اس قسم کی رضامندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جاسکتی پس اس طرح کے کاروبار نہ پسندیدہ اور جائز معاملات کہلائے جاسکتے ہیں اور نہ انکو معاشیات کے اسبابِ صالحہ کہا جاسکتا ہے اور بلاشبہ اس قسم کے تمام معاملات حکمت تمدن کی نگاہ میں باطل اور ظلم ہیں۔[۱]

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے صرف اس آخری اصول ہی پر روشنی نہیں پڑتی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۲۰۲۔

بلکہ اصولِ چہار گانہ کی ایک جامع اور مبسوط تفصیل سامنے آجاتی ہے یعنی

(الف) معیشت میں فطری تفاوتِ درجات کے باوجود تمام مخلوق یکساں اور برابر[1] ہے اور خدا نے تمام معاشی وسائل میں زمین اور پیداوار زمین کو سب کے لئے مباح الاصل پیدا کیا ہے اور تعیین و تشخیص جائز قبضہ سے ہی وجود میں آتی ہے۔

(ب) کسی فرد کو ان اموالِ مباح میں اسی قدر اور اسی طریق سے قبضہ و تصرف جائز ہے کہ اس سے دوسرے فرد کے لئے معاشی ضیق کے اسباب پیدا نہ ہو جائیں۔

(ج) نیز معاشی معاملات میں "باہمی تعاون و اشتراکِ عمل" واجب اور ضروری ہے۔

(د) اور یہ تعاون ایسے صحیح اور صالح طریقوں پر مبنی ہونا چاہیئے کہ اس سے نظام تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے یعنی ان کے ذریعہ معاشی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد ملے نہ یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کی مضرت پر موقوف ہو کر رہجائے۔

(ہ) اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ کائنات میں ایک "صالح معاشی نظام" موجود ہو جو خدائے تعالےٰ کے حکم اور منشاء کو پورا کرتا ہو۔

(و) پس اس صالح معاشی نظام" میں وہ تمام معاملات ناجائز اور حرام ہیں جنمیں باہمی تعاون کا مطلق دخل نہ ہو بلکہ ایک فرد کی تباہی اور مضرت پر دوسرے فرد کی مالی منفعت کا مدار ہو جیسا کہ مثلاً قمار (جوا) خواہ وہ غیر مہذب طریقوں سے عمل میں آئے یا سٹہ اور لاٹری وغیرہ جدید مہذب طریقہائے تجارت کے ذریعہ سے۔

(ز) اور وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں جنمیں بظاہر اگرچہ باہمی رضا اور تعاون نظر آتا ہو لیکن اسکی تہ میں زبردستی کے سوا اور کچھ نہ ہو جیسا کہ مثلاً ربوٰا (سودی لین دین) اور ایسے تمام اجارات و معاملات جنمیں ایک جانب سرمایہ دار کا سرمایہ ہو اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی اضطراری ضرورت اور سرمایہ دار مفلس کے افلاس اور اسکی

---

[1] یعنی حق معیشت میں برابر ہے۔

اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہی اور اجارہ، رہن اور دوسرے معاملاتِ لین دین
میں اس سے ایسی شرائط منظور کرالیتا ہی جو انصاف اور عدل کی نگاہ میں کسی طرح جائز
نہیں تھیں مگر مفلس کے افلاس اور ضرورتمند کی ضرورت نے ان کے سامنے سرِ تسلیم
خم کرنے پر مجبور کر دیا۔

(ح) پس اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضامندی سے بھی طے پاجائیں تب بھی
اسلام اور خدائے کائنات کے نزدیک باطل اور ظلم ہیں اور "صالح معاشی نظام"
میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں خواہ ان کے ظاہری فائدے کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ
ہوں اس لئے کہ اس قسم کے کاروبار کا آخری نتیجہ عوام کی فلاکت و افلاس اور ایک
مخصوص طبقہ کی مالی اجارہ داری کے سوائے اور کچھ نہیں ہی۔ اس لئے یہاں مہاجنی سود
کا کاروبار بھی ملعون ہے اور سودی بنکوں کا سسٹم بھی مذموم و مطرود، اور یہاں مسئلہ جور
کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں جنمیں اجیر کے جائز اور عادلانہ اجرت و حقوق
کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو اور
اجیر کی وہ خیانت بھی ناجائز جس سے صاحب سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچانے کی سعی کی جاتی ہو
بہرحال "معاشی نظام سے متعلق" ان آیات میں قرآنِ عزیز نے جن نصوصِ قطعیہ کو بیان کیا
ہے اور معجزانہ بلاغت اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ راہنمائی فرمائی ہی" اسلام کا معاشی نظام" ان
ہی نوامیسِ الٰہی کی شرح و تفسیر ہے پس آئندہ صفحات میں جو کچھ بھی سپردِ قلم ہوگا وہ صرف
اِن ہی حقائق کی تفصیلات ہونگی کہ یہی درحقیقت "صالح معاشی نظام" کے لئے بہترین دلیلِ راہ
ہیں اور اس کے وجود کے ضامن اور کفیل۔

اب ان تفصیلات سے یہ بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ "معاشی نظام" کا جو اساسی مقصد
ہی اس کو کامیاب بنانے کے لئے" اسلام کے اقتصادی نظام" کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں ہی
یہاں مارکسزم (اشتمالیت) کی طرح مذہبی انارکی بھی نہیں ہی اور طبقاتی جنگ بھی موجود نہیں

بلکہ ایک عالمگیر اخوت و ہمدردی کا غیر فانی اعلان ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت و وسائلِ دولت کو سمیٹ کر مخصوص طبقہ کے حوالہ کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے تاکہ باطل اور ظلم کی بنیادیں کسی حالت میں بھی قدم نہ جما سکیں اور دنیائے انسانی کے کسی ایک فرد کو بھی اپنی معاشی حیات میں انسانوں کے ہاتھوں ضیق اور تنگی پیدا نہ ہو۔

اب یہ ہمارا کام ہے کہ معاشیات کی علمی کاوشوں اور فنی بحثوں سے مرعوب ہو کر اس جال میں پھنس جائیں جس نے اور سب کچھ تو کیا مگر انسانی دنیا کو امن و سلامتی اور عام خوشحالی و رفاہیت سے کبھی روشناس ہونے دیا۔ اور اس طرح اپنی بدبختی پر اپنے ہاتھ سے مہر لگا لیں، اور یا اس سادہ مگر امن و سلامتی کے شاہکار "نظام" کو اپنا قائد بنا لیں جس نے اپنی عملی زندگی کی عمر اگرچہ کم پائی اور خلافتِ راشدہ کے بعد شاہانِ اسلام نے اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر جسکو کبھی بروئے کار نہ آنے دیا۔ تاہم جس قدر بھی عمر پائی اس میں معاشی نظام کی غرض و غایت کو ایسے بے نظیر پروگرام کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا کہ دوست اور دشمن دونوں آج تک اس کی ہمہ گیر اخوت و پیامِ مساوات اور عام معاشی خوشحالی اور رفاہیت کے معترف ہیں۔
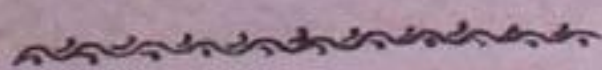
انفرادی معیشت

معیشت اور اسبابِ معیشت کا تعلق انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی سے وابستہ ہے اور چونکہ جماعت "جسم" کی حیثیت رکھتی ہے اور فرد، اس جسم کے ایک عضو کی، اس لئے اجتماعی اور انفرادی شعبہ ہائے حیات کے مابین لازم وملزوم کا رشتہ قائم ہے اور ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا ناگزیر ہے تاہم دونوں شعبوں کی تفصیلات جدا جدا قابلِ بحث ہیں اور ان میں سے قدرتی ترتیت کے لحاظ سے پہلا نمبر انفرادی معیشت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

"اسلام کے معاشی نظام" میں فرد سے متعلق احکامِ معیشت کیا ہیں؛ سعیق نظر ڈالنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں تین چیزیں فطری طور پر سامنے آتی ہیں (۱) کیا کمائیں (۲) کیا خرچ کریں (۳) کس پر خرچ کریں؛ یعنی وہ کون سی آمدنی جس کو جائز آمدنی کہا جا سکتا ہو اور اس آمدنی میں سے خرچ کیا کرنا چاہیئے؛ اور کس پر خرچ کرنا چاہیے؛ چنانچہ اسلام نے ان تینوں فطری سوالات کو حل کرنے کے لئے "انفرادی معیشت" کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں انسان کو جدوجہد کی ترغیب اور کسبِ معاش کیلئے حرکت کی دعوت دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کو اپنی معاش خود اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمانا چاہیئے کیونکہ جمود اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے کی زندگی موت کے مرادف اور اس کو حیات کہنا بے معنی ہے اور نہ اس طریقِ زندگی کو "توکل" کی زندگی کہا جا سکتا ہے۔ اور باقی تین حصوں میں ان ہی سوالات کو حل کیا گیا ہے جو معیشت کے مسئلہ میں فطری طور پر سامنے آتے ہیں۔

کسبِ معیشت کے لئے ترغیبات انفرادی مسائل معیشت میں سب سے پہلی منزل کسبِ معیشت اور ابتغاء رزق" کی منزل ہے۔ قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی استعداد کے مطابق

معیشت کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ دنیا میدانِ عمل ہے۔ یہاں جمود وخمود موت کے مرادف ہے۔ اس کارگاہِ ہستی میں خدائے تعالےٰ نے سامانِ رزق کے ذخیرے جمع کر دیئے ہیں مگر تلاش وسعی شرط ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (جمعہ)

"پس جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ۔ (عنکبوت)

"جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں سو تم تلاش کرو اللہ کے پاس سے روزی۔"

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (مزمل)

"اور کتنے اور لوگ ہیں جو پھرتے ہیں ملک میں اللہ کے فضل (روزی کو تلاش کرتے۔"

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ [1]

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ کے فریضۂ عبادت کے بعد (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔"

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اذا صلیتم الفجر فلا تنوموا عن طلب ارزاقکم [2]

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جدوجہد کے بغیر نیند (آرام) کا نام نہ لو۔"

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ صلے اللہ علیہ وسلم من الذنوب ذنوبٌ لا یکفرھا الا الھم فی طلب المعیشۃ [3]

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض گناہوں میں سے ایسے گناہ ہیں جنکا کفارہ فقط طلب معیشت کی فکر اور جدوجہد میں کاوش ہی سے ہو سکتا ہے۔"

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

"حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم

---

[1] کنز العمال ج ۲ [2] ایضاً [3] طبرانی فی الاوسط ونعیم فی الحلیہ۔

اطلبوا الرزق فی خبایا الارض قال	اپنی روزی کو زمین کے پوشیدہ خزانوں میں تلاش کرو"
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا
لا یقعد احد کم عن طلب	تم میں سے کوئی شخص بھی طلب رزق کی جدوجہد
الرزق ؎	میں پست ہو کر نہ بیٹھ جائے"

سید مرتضیٰ زبیدی شرحِ احیاء العلوم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

ای لابد للعبد من حرکۃ ومباشرۃ	"یعنی ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جائز اسباب
بسبب من اسباب یتحصل بہ طریق	معیشت میں سے کسی سبب اور وسیلہ کو ضرور
الوصول الی الرزق ؎	اختیار کرے کہ جس سے وہ رزق کو حاصل کر سکے"۔

کسبِ معاش کے اساسی اصول

ان آیات واحادیث اور احکامِ اسلامی کے پیشِ نظر جب ایک شخص کسبِ معاش کے لئے قدم اٹھائے تو کیا اس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی معیشت کے حصول میں جو طریقہ بھی چاہے اختیار کرے؟ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اس انفرادی جدوجہد میں اسکو چند ایسے اصول کا پابند بنایا گیا ہے جو "نظامِ معیشت" کو فاسد ہونے سے بچاتے اور صاحبِ معیشت کی زندگی کو معاشی رفاہیت کے ساتھ دینی اور اخلاقی رفعت عطا کرتے ہیں، چنانچہ اسکو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی انفرادی معیشت میں ہمیشہ دو اصول پیشِ نظر رکھے ایک یہ کہ جو حاصل کیا جائے وہ "حلال" ہو اور دوسرے یہ کہ جن طریقوں سے حاصل کیا جائے وہ "طیب" ہوں۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ	"اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال
حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ	طیب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی
الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (البقرۃ)	نہ کرو۔ بلاشبہ وہ تمہارے لئے کھلا ہوا دشمن ہے"۔

؎ کنز العمال ج ۲ ؎ احیاء العلوم جلد ۲ ص ۵۰ ؎ اتحاف السادۃ ج ۵ ص ۴۱۷

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۔ (مائدہ)	پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ۔"
يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (المومنون)	"اے پیغمبر! تم کھاؤ پاک چیزوں سے اور عمل کرو نیک۔ بلاشبہ جو تم عمل کرتے ہو میں اس کا جاننے والا ہوں۔"
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ۔ (اعراف)	"اور (نبی امی) حلال رکھتے ہیں تمہارے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتے ہیں خبیث چیزیں"

ان آیات میں "حلال" اور "طیب" ہر دو اصول کا ذکر کرتے ہوئے سخت تاکید کی گئی ہے کہ "شیطان کے قدموں کی پیروی" نہیں کرنی چاہئے مراد یہ ہے کہ کھانے پینے، پہننے اور اشیاء کے استعمال کرنے میں نیز تمام وسائل آمدنی میں "نظام معیشت" کی روح یہ ہے کہ ایک "مسلم" کو ایسی تمام اشیاء سے بچنا چاہئے جن کی ترکیب ان عناصر سے کی گئی ہو جو جسمانی امراض کا سبب بنتے اور اس کو فاسد کرنے میں "سمیت" کا کام کرتے ہوں اور یا قوائے حیوانی کو برانگیختہ کر کے ان کو اعتدالِ طبعی سے نکال کر امراض روحانی و اخلاقی کا باعث ہوتے ہوں اور ان اشیاء سے بھی احتراز ضروری ہے جو غرور، خود نمائی، بیجا تعیش اور جابرانہ نخوت کا سبب بنکر مساوات، اخوت اور مواساۃ باہمی کے رشتوں کو قطع کرتے اور خود غرضی، ظلم اور بداخلاقی کی جانب دعوت دیتے ہوں۔ پس اگر ہمارا کسب و اکتساب ان نجس اوصاف سے پاک ہے تو وہ "حلال" ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو شے اپنی معیشت کے لئے حاصل کی گئی ہے وہ اپنی ذات میں بھی اور حصول کے طریقوں میں بھی نفس کو پاک رکھتی اور خباثتِ نفس سے بچاتی ہو، نیز اس سے دوسرے افرادِ امت کے لئے معاشی تضیق نہ پیدا ہوتی ہو اور ظلم و سرکشی اور معاشی دستبرد کے وہ جراثیم نہ پھیلتے ہوں کہ جن سے مذموم سرمایہ داری فروغ پاتی اور عام انسانی

دنیا کو فلاکت و مسکنت کے قعرِ ہلاکت میں ڈالتی ہو، پس اگر آمدنی اور وسائلِ آمدنی میں اُن امور کا پورا لحاظ رکھا گیا تو اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے "طیب" کہا جاتا ہے چنانچہ سلف و خلف نے "حلالاً طیباً" میں "طیب" کی جو تفسیریں کی ہیں علامہ رشید رضا نے تفسیر المنار میں ان کا یہ قدر مشترک نکالا ہے۔

طیب سے مراد وہ اشیا ہیں جن کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہوا سلئے کہ نصِ قرآنی نے جن اشیا کو حرام کیا ہے ان کی حرمت تو ذاتی ہے اور اس لئے مضطر کے علاوہ کسی حالت میں کسی کے لئے ان کا استعمال درست نہیں اور ان کے علاوہ جن اشیا کی حرمت اس شے کی حقیقت اور ذات میں نہیں پائی جاتی بلکہ باہر کے اسباب سے حرمت آتی ہے ان کی ممانعت "طیب" کہہ کر کر دی گئی۔

پس جو شے ناحق لی گئی اور صحیح طریقہ کار سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ ربا، رشوت، قمار، ظلم، غصب، دھوکا، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی وہ بھی حرام ہے اس لئے کہ طیب نہیں ہے پس ہر "خبیث" شے حرام ہے خواہ وہ خبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو اور خواہ اس کے اندر موجود ہو جیسا کہ کھانے پینے کی چیز (کا) میں سڑ کر بُو آجانا (اور امراض جسمانی کا سبب بننا) [1]

قرآن عزیز اور احادیث نبوی نے "حلال" اور "طیب" کے خلاف "حرام" اور "خبیث" کی بعض اصناف بھی تفصیل کے ساتھ شمار کرائی ہیں اور بعض کو صرف اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ	تم پر حرام کر دیا گیا مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ
لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ	جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو
بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَ	.... (یعنی اللہ کے
الْمُتَرَدِّيَةُ وَ	سوا کسی غیر کے نام پر چھوڑا گیا ہو) اور گلا مروڑا ہو اور

[1] المنار عربی ج ا ص ۸۰، و ابن کثیر ج ا ص ۲۰۳

والنطيحة وما أكل السبع إلا ما ذكيتم وما ذبح على النصب وأن تستقسموا بالأزلام ذلكم فسق ۝

پتھر یا لاٹھی سے مارا ہوا اور اوپر سے گر کر مرا ہوا اور دوسرے جانور کے سینگ سے زخم کھا کر مرا ہوا اور درندہ کا پھاڑا ہوا مگر یہ کہ تم نے اس کی زندگی ہی میں ذبح کر لیا ہو۔ اور جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور تم پر حرام کر دیا گیا کہ پانسوں کے ذریعہ حصے بانٹو یہ سب تمہارے لئے فسق (گناہ) ہیں۔

مائدہ

إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون ۝

بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے ناپاکی ہیں کار شیطان سے ہیں۔ پس ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (مائدہ)

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن لبس الحرير والديباج وعن لبس القسي والمياثر والأرجوان الخ[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (مردوں) کو منع فرمایا ریشمی لباس سے اور دیبا اور قز (موٹے ریشم) کے لباس سے اور ریشمی گدوں پر بیٹھنے سے اور ارغوانی رنگ سے۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من لبس ثوب شهرة في الدنيا ألبسه الله ثوب مذلة يوم القيامة[2]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دنیا میں فخر و غرور کا لباس پہنا" اللہ تعالیٰ اس کو قیامت میں ذلت کا لباس پہنائیں گے۔

عن النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تشربوا في آنية الذهب والفضة الخ[3]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم مسلمانو (مردوں اور عورتوں) کو جائز نہیں ہے کہ سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال کرو۔

[1] بخاری کتاب اللباس [2] رزین و ابوداؤد [3] رواہ الخمسہ التاج الجامع ج ۳ ص ۱۳۲

عن حذیفۃ قال نھانا النبی صلی	حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں ہم کو نبی اکرم صلی اللہ
اللہ علیہ وسلم ان نشرب فی آنیۃ	علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ہم سونے اور چاندی کے برتن میں
الذہب والفضۃ وان ناکل فیہا	پئیں یا کھائیں اور منع فرمایا ریشم اور دیبا پہننے اور اسکے
وعن لبس الحریر والدیباج وان نجلس	بچھونے پر بیٹھنے سے۔
علیہا ایما عبد نبت لحمہ من السحت	جس انسان کا گوشت پوست ظلم اور سود سے
والربا فالنار اولی بہ ؎	بنا ہے تو اس جسم کے لئے جہنم کی آگ زیادہ بہتر ہے۔"

بہرحال "کسبِ معاش" میں اسلامی نظام معیشت یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ حاصل کردہ شے "حلال" ہو "حرام" نہ ہو اور "طیب" ہو "خبیث" نہ ہو اور حلال و طیب اور حرام و خبیث کے معنی و مفہوم کی توضیح و تشریح بھی بیان کر دیگئی تاکہ ان اصول کے سمجھنے اور پیشِ نظر رکھنے میں کسی قسم کی دقت اور گنجلک پیدا نہ ہو۔

پس اگر ایک شخص ان تمام اساسی اُمور کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی معاشی زندگی میں جدوجہد کر کے "وسائلِ معاش" بہم پہنچاتا ہے تو بے شبہ اسلامی نظامِ معیشت میں اسکی یہ کمائی "معیشتِ صالحہ" کے نام سے موسوم ہے۔

مصارف کے بنیادی اصول کسبِ معاش کے بعد دوسرا مسئلہ صرف و خرچ کا ہے اور اس باب میں تین مسائل زیر بحث ہیں ایک یہ کہ کیا خرچ کیا جائے؟ دوسرا یہ کہ کس قدر خرچ کیا جائے اور تیسرا یہ کہ کن پر خرچ کیا جائے؟

کیا خرچ کیا جائے؟ اس کا جواب تو ابھی کسبِ معاش کی بحث میں دیا جا چکا یعنی ایک شخص "حلال" اور "طیب" سے جو کچھ کمایا ہے وہی اس کا سرمایۂ معیشت ہے اور وہی اس قابل ہے کہ زندگی کی نشو و نما میں کام آئے۔

اور کسقدر خرچ کیا جائے؟ اس دوسرے سوال کا جواب قرآن عزیز نے جو کچھ دیا ہے

؎ بخاری کتاب الاوانی ۱۲

وہ دو حصوں پر تقسیم ہے ایک کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے۔ اسکے متعلق ارشاد ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (انعام) "کھاؤ اور پیو اور اعتدال سے تجاوز نہ کرو۔"

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بنی اسرائیل) "اور فضول خرچی ہرگز نہ کرو، بے شبہ (اخراجات میں) حد سے تجاوز کرنے والے شیطانوں کے بھائی (ہم پلہ) ہیں۔

ان ہر دو آیات میں اپنی جائز اور حلال کمائی کے صرف کرنے کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ایک یہ کہ "اسراف" نہ ہو اور دوسری یہ کہ "تبذیر" نہ ہو۔ علامہ ماوردی "اسراف" اور "تبذیر" کے باہمی فرق پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"کمیت یعنی مقدار خرچ میں حد سے تجاوز کرنا "اسراف" ہے اور یہ ثبوت ہے ان عائد شدہ حقوق کی مقدار سے جہالت کا جو اس کے ذمہ ہیں اور کیفیت یعنی مواقع صرف وخرچ میں حد سے تجاوز کا نام "تبذیر" ہے اور یہ شہادت ہے ان مواقع صرف سے نادان بننے کی جو صحیح اور حق مواقع ہیں [۱]

اور مولانا شبیر احمد عثمانی فوائد القرآن میں "تبذیر" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"اور خدا کا دیا ہوا مال فضول بے موقع مت اڑاؤ، فضول خرچی یہ ہے کہ معاصی اور لغویات میں خرچ کیا جائے یا مباحات میں بے سوچے سمجھے، ما خرچ کرے جو آگے چل کر تفویت حقوق (عائد شدہ) اور ارتکاب حرام کا سبب بنے۔ [۲]

اور صاحب روح المعانی آیت "كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا" کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"لَا تَطْغَوْا فِيهِ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو رزق عطا فرمایا ہے اس میں سرکشی نہ کرو یعنی ناشکری نہ کرو اور مال کو اسراف، غرور اور خدا کے احکام کی خلاف

[۱] روح المعانی ج ۱۵ ص ۵۹ [۲] فوائد القرآن سورۂ بنی اسرائیل ص ۳۶۸

خلاف ورزی اور حقوقِ واجبہ کے تلف کا ذریعہ نہ بناؤ"۔ [1]

الحاصل صرف و خرچ میں اسراف اور تبذیر معیشت فاسدہ کی علامات ہیں اسلئے "اقتصاد" اور میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے مثلاً عام حالات میں یہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ خرچ آمدنی سے بڑھ جائے اور پھر حاجت کے وقت دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے بلکہ حتی الامکان اس کی سعی کرنی چاہئے کہ ان تمام اجتماعی حقوق کی ادا کے ساتھ ساتھ جو "غنی ہونے کی صورت میں اللہ تعالےٰ نے اس پر عائد کئے ہیں" اپنی اور اہل و عیال کی حاجات و ضروریات کے لئے کچھ پس انداز ہو۔ نیز یہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ بخل اور تقتیر کو کام میں لائے اور خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے عطاء الٰہی کے باوجود معیشت کو تنگ کرے۔ چنانچہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الاقتصاد فی النفقۃ نصف المعیشۃ [2]	(آمد و صرف میں) میانہ روی معاشی زندگی کی خوشگواری کا نصف حصہ ہے"
قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امسک علیک بعض مالک فهو خیر لک قلت امسک سهمی الذی بخیبر [3]	"حضرت کعبؓ فرماتے ہیں (جب میں نے اپنے کل مال کو صدقہ کر دینے کا ارادہ کیا تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے مال میں سے کچھ بچا لو یہ تمہارے حق میں بہتر رہیگا تب میں نے عرض کیا کہ خیبر (کی زمین) میں جو میرا حصہ ہے وہ میں نے بچا لیا ہے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعهم عالۃ یتکففون الناس	ایک مالدار شخص کے اس سوال پر کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں بذریعہ وصیت دے ڈالتا ہوں، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ورثاء کو صاحب مال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ وہ محتاج رہ جائیں اور بھیک مانگتے پھریں

[1] روح المعانی سورۂ طٰہٰ ج ۱۶ [2] بیہقی کنز العمال عن ابن عمرؓ [3] بخاری باب الصدقات۔

فی ایدیھم الخ [۱]   (اس لئے تہائی مال میں وصیت کردینا کافی ہے)

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے جب "انفاق" (خرچ کرنے) کا حکم دیا تو "اسراف" سے منع فرمادیا اور میانہ روی کی تلقین فرمائی جیسا کہ دوسری آیت میں بہت صراحت کے ساتھ اسکا حکم فرمایا ہے ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا (الآیۃ)   اور (ایمان والے) وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل اختیار کرتے ہیں۔

"پھر "تبذیر" سے نفرت دلاتے ہوئے مبذر کو شیطان کا ہمسر بتایا اور اسی قسم کی اور بھی آیات ممانعت تبذیر میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: حق کے خلاف ہر قسم کے صرف و خرچ کا نام "تبذیر" ہے اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص نے "حق کی خاطر" سب کچھ خرچ کر ڈالا تو یہ "اسراف" نہیں ہے اور اگر اپنا تھوڑا سا مال بھی "ناحق" صرف کردیا تو یہ "تبذیر" ہے۔ اور قتادہؒ کہتے ہیں "تبذیر" نام ہے مال کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، ناحق اور فساد کے مواقع میں صرف کرنے کا اور امام احمدؒ بروایت ہاشمؒ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بنی تمیم کا ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں بہت مالدار ہوں اور میرے اہل و عیال بھی ہیں اور مہمان داری بھی خاصی ہوتی رہتی ہے تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ میں کس طرح خرچ کروں، اور اس معاملہ میں کیا کروں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مال سے پہلے زکوٰۃ نکال اگر وہ زکوٰۃ کی مقدار کو پہنچتا ہے اس لئے کہ زکوٰۃ مال کو خباثت سے ... پاک کردیتی ہے اور پھر اقرباء کے ساتھ ملکی صلہ رحمی کر اور سائل، پردیسی اور مسکین کے حقوق ....

---

[۱] بخاری کتاب الوصایا۔

...کی نگاہ داشت کر، اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلعم اس تمام تفصیل کو جامع اور مختصر الفاظ میں فرما دیجیے (کہ میں اس کو دستور زندگی بنالوں) تب آپ نے یہ آیت پڑھ سنادی۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ	پس ادا کرو قرابت والوں کو انکا حق اور
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا	مساکین کا اور مسافر کا اور ناحق ہرگز خرچ نہ کرو

سائل نے یہ سن کر عرض کیا کہ بس یہ میرے لئے کافی ہے [۱] الخ

اور... امام رازی آیت "وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا" کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اسراف" اور "تقتیر" کے متعلق مفسرین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں ان میں سے قوی تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ معیشت کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں نہ بیجا غلو کرتے ہیں اور نہ بے محل بخل برتتے ہیں اسی لئے قرآن عزیز میں دوسری جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى	اور اپنے ہاتھ کو نہ اپنی گردن کے ساتھ ہی باندھ لو
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ	(یعنی بخل نہ کرو) اور نہ بالکل ہی کھول دو یعنی
الْبَسْطِ الآیہ (بنی اسرائیل)	اسراف نہ کرو

اور آیۃ "کان بین ذلک قواما" میں "قوام" سے اعتدال اور میانہ راہ مراد ہے یعنی میانہ روی ان کا شعار ہے"۔ [۲] الخ

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

والظاهر ان المراد بالانفاق	اور ظاہر یہ ہے کہ انفاق سے اس جگہ عام ہے خواہ
مایعم انفاقهم علی انفسهم	وہ ان کی اپنی ذات پر ہو اور خواہ دوسروں
وانفاقهم علی غیرهم والقوام	پر اور قوام (توسط) ان سب صورتوں میں خیر ہی

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۶۳ [۲] ایضاً ج ۶ ص ۳۵۶

فِي كُلِّ ذٰلِكَ خَيرٌ وَقَد اَخرَجَ اَحمَد وَالطَّبرانِي عَن اَبِي الدَّرداءِ عَنِ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّم مِن فِقهِ الرَّجُلِ رِفقُهُ فِي مَعِيشَتِهِ۔ ؎	اور امام احمد اور طبرانی نے حضرت ابو درداء سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کی دانائی و فرزانگی میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنی معیشت میں نرمی (اعتدال) اختیار کرے"

ان تمام حوالجات کا حاصل یہ ہے کہ نصوص قرآنی اور حدیثی "معیشت" میں صرف و خرچ کے متعلق یہ چند باتیں بنیادی طور پر ضروری قرار دیتی ہیں۔

(۱) صرف مال میں نہ "اسراف" درست ہے نہ "تبذیر" اور نہ "تقتیر" اور تینوں الفاظ کا مفہوم اسلامی اصطلاح کے مطابق مراد ہے نہ کہ صرف لغوی معنی کے مطابق۔

(۲) میانہ روی (اقتصاد) ہی معیشت کی عادلانہ راہ ہے اور صالح اجتماعی نظامِ معیشت کے لئے ایک ذریعہ۔

(۳) فرد چونکہ جسم جماعت کا ایک عضو ہے اسلئے اس کی انفرادی آمدنی پر اجتماعی معیشت کے حقوق بھی عائد ہیں اور جس قدر وہ کماتا ہے اسی نسبت سے یہ حقوق اس پر زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں اس کا نام "انفاق فی سبیل اللہ" ہے۔

(۴) انفرادی معیشت میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی قوتِ لایموت اور ساتر عورت لباس اور ضرورت رہائش کے مطابق مکان تمام حقوق سے مقدم اور فرض اولین ہے اور اسکے بعد وہ تفاصیل ہیں جو گذشتہ صفحات میں زیر بحث آچکی ہیں اور جنکی اجمالی فہرست یہ ہے۔

(الف) اگر وہ صاحب نصاب ہے تو سب سے پہلے صدقات واجبہ (زکوٰۃ وغیرہ) کا ادا کرنا اسکے ذمہ فرض ہے گویا اس صورت میں اجتماعی حق، انفرادی حق پر مقدم ہے۔

(ب) صدقات واجبہ کی ادا کے باوجود "انفرادی مال" پر کچھ اور بھی اجتماعی حقوق عائد ہیں۔ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ارشاد ہے "وفی المال حق سوی الزکوٰۃ" مثلاً

؎ تفسیر کبیر جلد ۱۹ ص ۴۴

اگر بیت المال کا خزانہ ہر شخص کی انفرادی معیشت کے لئے پورا نہ ہو سکے تو "خلیفہ" بہ جبر اہل دولت سے مال حاصل کر کے اس کمی کو پورا کر سکتا ہے اگرچہ وہ ارباب دولت صدقات واجبہ کی ادائیگی سے سبکدوش ہو چکے ہوں۔

(ج) عام انسانی حالات میں صدقاتِ نافلہ یعنی "حقوق ثانوی" ایسی حالت میں ادا کئے جائیں کہ اپنے اور اہل و عیال کے لئے مال کا ایک حصہ محفوظ رہے تاکہ وہ "مفلس و قلاش" ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس کی تعبیر یوں کی جا سکتی ہے کہ اسکو مستقبل کے لئے اپنے اور اہل و عیال کے لئے کچھ پس انداز رکھنا مناسب ہے چنانچہ حدیث "خیر الصدقة عن ظهر غنى" اسی جانب مشیر ہے۔

(د) خاص حالاتِ انسانی میں "ایثار علی النفس" اولیٰ اور افضل ہے یعنی اگر انسانی نفوس ضبطِ نفس اور صبر کے درجۂ کمال پر فائز ہیں تو "انفاق فی سبیل اللہ" میں تمام مال کو صرف کر دینا محبوب ہے چنانچہ آیت "يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" ان کو اگر ذاتی حاجت بھی ہوتی ہے تب بھی وہ (صحابہ رضی اللہ عنہم) دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں اور حدیث ابوذر غفاریؓ "افضل الصدقة جهد من مقل" سب سے بہترین صدقہ اس شخص کا ہے جو قلیل المال ہو کر مال کو خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالتا ہے" اور صدیق اکبرؓ کا ایک موقعہ پر تمام مال کو خدا کی راہ میں پیش کر دینا" اس ہی مسئلہ کی جانب راہنمائی کرتے ہیں [۱]

اور اگر اس شرح کے دائرہ کو زیادہ تنگ کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی معیشت میں "اقتصاد" (میانہ روی) مطلوب اور "اکتناز" (اجتماعی حقوق کو نظر انداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا) اور "احتکار" (ناجائز وسائلِ معیشت سے مال اکٹھا کرنا) حرام اور مردود ہے اور انفرادی دولت، جماعتی دولت کے لئے ایک ذریعہ ہے نہ کہ اس کے لئے سنگِ راہ۔

---

[۱] مالی انفرادی حقوق اور اجتماعی حقوق کے بارہ میں جو آیات اور احادیث صحیحہ وارد ہیں ان سب کے درمیان تعارض و تناقض کو رفع کر کے بہترین تطبیق کی شکل وہی نکلتی ہے جو ان دفعات میں مذکور ہے تفصیل کے لئے فتح الباری ج ۳ ص ۲۲۹ و ۲۳۰ - ۱۲ قابل مراجعت ہے۔

"مصرفِ مال" کا دوسرا حصہ اجتماعی معیشت سے متعلق ہے جس کی تفصیل عنقریب آنیوالی ہے اس لئے اس بحث کا بہت کچھ تعلق اگرچہ حکومت اور فرائض حکومت سے وابستہ ہے تاہم فرد چونکہ جماعت ہی کا ایک حصہ ہے اس لئے بلا تکلف یہ مسئلہ انفرادی معیشت میں بھی زیرِ بحث آیا اور اجمالی صورت میں بھی مذکور ہوا چنانچہ قرآن عزیز نے افرادِ ملّت کو جگہ جگہ اس جانب توجہ دلائی ہے اور نظامِ معیشت میں اس کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور زکوٰۃ اور وراثت کے احکام کے علاوہ "انفاق" کے نام سے بہت زیادہ اس کو نمایاں کیا ہے۔ ارشاد ہے:-

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل)
اور قرابت والے اور مسکین اور مسافر کو انکا حق دو۔

وَاٰتُوْا حَقَّہٗ يَوْمَ حَصَادِہٖ (انعام)
اور کھیتی کٹنے کے وقت اس کا حق ادا کرو

امام شعبیؒ کہتے ہیں کہ یہ "حق" زکوٰۃِ مفروضہ (عُشر) کے علاوہ ہے:-

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ)
اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہدیجئے کہ حاجت سے زائد مال۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِہٖ عَلِيْمٌ (بقرہ)
"وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہدیجئے مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرو بس والدین کے لئے ہو اور قرابت والوں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں کیلئے اور مسافروں کے لئے اور جو نیکی بھی تم کرو بے شبہ اللہ نیکی سے واقف اور باخبر ہے۔

پہلی آیت میں "عفو" کے معنی بعض معاصر اہلِ علم نے یہ لئے ہیں "کہ راس المال" خرچ نہ کرو بلکہ اسکا منافع خرچ کرو، مگر یہ معنی کسی طرح صحیح نہیں ہیں اسلئے کہ یہاں سوال میں اس خرچ کا ذکر ہے جو "انفاق فی سبیل اللہ" سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری آیت میں مقدارِ خرج

بتانے کی بجائے کن پر خرچ کیا جائے؟ اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ پس یہ دونوں آیات یہی رہنمائی کرتی ہیں کہ یہاں نہ سوال کا ہی یہ منشا ہے جو کہ معاصر موصوف نے سمجھا ہے اور نہ جواب سے ہی یہ منشا مستنبط ہوتا ہے بلکہ اس کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سائل پوچھ رہے ہیں کہ ہم کو انفاق فی سبیل اللہ کی جو ترغیب دی جارہی ہے تو اس سلسلہ میں کس قدر خرچ کریں، جواب دیا جاتا ہے کہ ضروری حاجات سے زائد اگر ہے تو اس پر انفاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور دوسری آیت میں اسی سوال کا ذکر کرتے ہوئے یہ تعلیم دی گئی کہ بار بار خرچ کی نوعیت کا سوال غیر ضروری ہے کیونکہ تم کو ابھی بتایا جا چکا ہے اس لئے اب سوال یہ کرنا چاہئے کہ کن پر خرچ کریں؟ اور اس کا یہ جواب ہے کہ والدین، اقربا، مساکین وغیرہ پر خرچ کرو۔

جمہور مفسرین کا یہی مسلک ہے پس معاصر موصوف نے جو معنی بیان فرمائے ہیں وہ نہ منصوص اور منطوق ہیں اور نہ مستنبط و مستخرج کیونکہ یہاں اس کے استنباط کی گنجائش ہی نہیں ہے اور کیسے ہو سکتی ہے جبکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی عملی زندگی اسکے خلاف نظر آتی ہے اور وہ اس حکم کے قطعاً پابند نہیں نظر آتے بلکہ بڑے بڑے متمول صحابہؓ کے مصارف کا معمول بھی اس تحدید کے دائرہ سے خارج ثابت ہوتا ہے "کہ وہ راس المال کو محفوظ رکھتے اور صرف اس کے نفع ہی پر مصارف کا بار ڈالتے ہوں"۔ البتہ بعض وہ صحابہؓ و تابعین جو تجارت پیشہ تھے ان کا یہ معمول اسی طرح رہا ہوگا جس طرح دوسرے تاجروں کا رہتا ہے یعنی ان کا یہ عمل تجارت کے طبعی اصول کے مطابق ہوگا نہ کہ اس لئے کہ وہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیت کے معنی یہ سمجھتے اور اس کو منصوص یا مستنبط حکم کی حیثیت میں یقین کرتے تھے۔

علاوہ ازیں راس المال کو محفوظ رکھتے ہوئے صرف نفع پر مصارف کا بار ڈالنا اگرچہ "اقتصاد" کی ایک بہتر عملی شکل ہے لیکن وہ ملازمت، صنعت و حرفت، اجارہ کاشتکاری، زمینداری ہر ایک شعبۂ معیشت میں عملی شکل اختیار نہیں کر سکتا پھر ایسا حکم کس طرح عام

ہو سکتا، اور معیشت کے تمام شعبوں میں کیسے نافذ العمل قرار پا سکتا ہے؟

ان آیات کے علاوہ وہ آیات بھی قابلِ لحاظ ہیں جن میں قرآن عزیز نے "مومنین" کی امتیازی خصوصیات شمار کراتے ہوئے ان کی عبادت گذاری اور پرہیزگاری کے اوصاف کے ساتھ ساتھ "انفاق فی سبیل اللہ" کا بھی ذکر کیا ہے اور تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان مقامات میں "زکوٰۃ مفروضہ" مراد نہیں ہے۔ مثلاً سورۃ الذّٰریٰت میں ارشاد ہے:-

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ	اور صبح کے وقت وہ (مومن) اللہ سے معافی
وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ	طلب کرتے ہیں اور ان کے مالوں میں حق ہے
وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات)	مانگنے والوں کا اور معاشی زندگی سے ہارے ہوؤں کا۔

اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہے:-

اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ	اور وہ جو اپنی نمازوں پر قائم ہیں اور وہ جن کے
وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ	مال میں حصہ مقرر ہے سائل کے لئے اور معاشی
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج)	زندگی سے ہارے ہوئے کے لئے۔

اجتماعی نظامِ معیشت

حیاتِ اجتماعی (اجتماعی حیات کی قدر و قیمت تو ایک امرِ مسلّم ہے مگر اسلام اس کی اہمیت کا راز یہ بتاتا ہے کہ صالح نظامِ اجتماعی اس لئے ضروری ہے کہ وہ افرادِ امت کی صلاح و خیر کا بہترین ذریعہ ہے اور "فرد" کی انفرادیت کا صحیح نشو و نما اور اسکے شعبہ ہائے زندگی کی تکمیل، اجتماعی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان اسوقت تک معراجِ انسانیت کو نہیں حاصل کر سکتا جب تک وہ اپنے ان حقوق و فرائض کو ٹھیک ٹھیک نہ ادا کرے جو خدائے تعالےٰ کی مخلوق ہونے اور جماعت کے ایک فرد ہونیکی حیثیت سے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور یہ حقوق و فرائض اس وقت تک انجام نہیں پا سکتے جب تک کوئی "صحیح نظامِ اجتماعی" موجود نہ ہو۔ اسی لئے قرآن عزیز میں جگہ جگہ انفرادی تخاطب کے بجائے اجتماعی خطاب کو ترجیح دی گئی ہے، مثلاً وہ جب عمومی خطاب سے مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے "یٰاَیُّھَا النَّاسُ" (اے لوگو) اور اگر مسلمانوں کو خصوصی خطاب سے مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" (اے ایمان والو) اور اسی طرح "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (تم سب نماز کو قائم کرو) "اٰتُوا الزَّکٰوۃَ" (زکوٰۃ ادا کرو) "وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ" (اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے بیت اللہ کا حج کرنا) "فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ" (پس تم سب میں سے جو بھی اس مہینہ میں موجود ہو وہ رمضان کا روزہ رکھے) "لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" (اپنے اموال کو آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ) "لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا" (تم سود نہ کھاؤ) ان تمام مقامات میں جمع کا صیغہ بولکر اجتماعی خطاب ہی کو اختیار کیا گیا ہے اور ان تمام آیات سے بھی زیادہ واضح اور اس حقیقت کی آئینہ دار یہ آیات ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران)	تم جو انسانوں کی فلاح کے لئے عالم وجود میں لائے گئے ہو، بہترین امت ہو۔ تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے اور برائی سے روکتے ہو۔
اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء)	"تم سب اللہ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہو اس کی اطاعت کرو"
فَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران)	"اور تم سب ایک ساتھ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ"

ان تمام آیات کی روح یہی ہے کہ فرد کی انفرادی زندگی کی تکمیل بغیر اجتماعی نظم کے ناممکن ہے اور اس کی سعادت و فلاح کا انحصار نظم اجتماعی کی سعادت و فلاح پر موقوف۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بصراحت یہ فرمایا "لا رھبانیۃ فی الاسلام" (اسلام میں جوگیانہ زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے)

پھر جب کہ نظامِ اجتماعی کے مختلف شعبوں میں سے وہ شعبہ کہ "بہ اسبابِ ظاہر" جس پر انسان کی جسمانی حیات اور اس کی بقاء کا انحصار ہے معاشیات کا شعبہ ہے اور جبکہ یہ شعبہ بھی مثل دیگر شعبہ ہائے زندگی کے انسان کی دینی اور دنیوی دونوں قسم کی عملی جدوجہد میں بڑی حد تک دخیل ہے تو بے شبہ یہ شعبہ بھی اجتماعی زندگی کا ایک اہم جزء ہے اور اس لئے عقل و فطرت بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں کے اجتماعی نظام کی سعادت و فلاح کا بہت کچھ مدار اس کے صالح اور بہتر ہونے پر ہے۔

نیز یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ "اجتماعی نظامِ معاشی" اور "نظامِ حکومت" کے درمیان چولی دامن کا سا تعلق ہے۔ کیونکہ کسی بھی اقتصادی نظام کے صالح اور فاسد ہونیکا حال اس سے وابستہ سوسائٹی کے نظام اور نظامِ حکومت سے بخوبی آشکارا ہو سکتا ہے مثلاً اگر کسی جماعت یا سوسائٹی میں مذموم سرمایہ دارانہ روح کارفرما ہے تو اسکے نظامِ حکومت میں ایسا

معاشی نظام عالم وجود میں آئیگا جس کے ذریعہ سرمایہ دارانہ اصولوں کی سربلندی، حوصلہ افزائی اور قانونی ذرائع سے ان اصولوں کے لئے ہر قسم کی سہولت کار وجود پذیر ہوسکے۔

اور اگر جماعتی زندگی میں اشتراکِ عمومی (مارکسزم) کا نظریہ جاری و ساری ہے تو بلاشبہ اس نظامِ حکومت میں وہ معاشی نظام منصۂ شہود پر آئیگا جس میں آمدنی و ذرائع آمدنی میں انفرادی ملکیت کا سدّباب کیا گیا ہو اور اگر کسی سوسائٹی کے نظامِ اجتماعی میں صرف حیاتِ دنیا اور حصولِ لذاتِ دنیا ہی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دیا گیا ہو تو اس کے نظامِ حکومت میں "معاشی نظام" کا سنگِ بنیاد ایسے فلسفہ پر مبنی ہوگا جس میں "خدا" "مذہب" اور "معاد" کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو اور بلاشبہ اس معاشی نظام میں طبقاتی جنگ ایک ضروری شے قرار پائیگی اور اگر جماعت کے نظامِ اجتماعی کی نہاد، معاش و معاد دونوں سے وابستہ ہے بلکہ وہ صالح معاشی نظام کی ضرورت ہی اس نظریہ کے ماتحت سمجھتی ہے "کہ اسکے بغیر انسان نہ خدا کا سچا فرمانبردار بن سکتا ہے اور نہ مخلوقِ خدا کا ہمدرد، اور نہ ایسی حالت میں، وہ "وحدتِ عام" کا داعی ہوسکتا ہے" تو یقیناً اسکے نظامِ حکومت میں ایسا معاشی نظام بروئے کار آئیگا جو فلسفیانہ موشگافیوں، خوبصورت معاشی نظریوں، اور عملی نظام میں بڑے بڑے دفاتر اور محکموں، اور بجٹ، اور اعداد و شمار کی فراوانیوں، کی بجائے اپنے اندر مخلوقِ خدا کی عام خوشحالی، باہمی اخوت و ہمدردی، طبقاتی کشمکش سے گلو خلاصی، اور اخلاقِ کریمانہ کی سربلندی رکھتا اور ان کا کفیل و ضامن بنتا ہو۔

پس اسلام نے جس اجتماعی نظام کی بنیاد ڈالی ہے وہ ایسے اصولوں پر مبنی ہے جسمیں حکومت، سیاست اور معیشت کو ایک طرف خدا پرستی اور مذہب کے ساتھ جوڑا گیا اور دوسری جانب معاشیات میں اس روح کو داخل کیا گیا جس سے عام خوشحالی۔ عام اخوت و ہمدردی اور مساوات و مواساۃ باہمی، کارفرما ہوجائے۔ اس نے کہا کہ تمام کائنات ذی روح حقِ معیشت میں مساوی ہے اور وہ تمام معاشی طریقے ناجائز و مردود ہیں جن کی بدولت مذموم سرمایہ داری

نشوونما پاتی ہے۔ یعنی ایسے طریقے جو دولت کو مخصوص طبقوں میں سمیٹ کر جمع کر دیتے اور عام مخلوق خدا کے افلاس اور فقر و فاقہ کے موجب بنتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ اس نے "اکتناز" و "احتکار" کو حرام قرار دے کر ان تمام ذرائع کا سدِ باب کر دیا جو حقِ معیشت کی مساوات میں رخنہ انداز ہو سکیں۔

نیز اس نے اعلان کیا کہ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت اور انفرادی ملکیت کا انکار بھی غلط اصول پر مبنی ہے کیونکہ قانونِ قدرت (فطرت الٰہی) کی جانب سے اس کارگاہِ ہستی میں جو تنوع پایا جاتا۔ اور قوائے علم و عمل میں جو تفاوت نظر آتا ہے اسکا میدان معیشت کی جدوجہد پر اثرانداز ہونا بلاشبہ فطری اور قدرتی امر ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے ثمرات و نتائج میں تفاوت نہ ہو۔ پس یہی وہ تفاوت اور تنوع ہے جو شعبۂ معیشت میں "تفاوتِ درجات" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"تفاوتِ درجات" کا انکار اس لئے بھی غیر فطری شعور ہے کہ یہ کائناتِ انسان کے قوائے عمل میں بڑی حد تک تعطل اور جمود و خمود پیدا کر دینے کا باعث بنجاتا ہے۔

رہا یہ خطرہ کہ ایسی صورت میں پھر تفاوتِ درجات کے مذموم اور غیر فطری نظام کے بروئے کار آجانے کا اندیشہ بلکہ قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے اسلئے صحیح نہیں ہے کہ اگر فطری درجات تفاوت کے تسلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی نظامِ معاشی کی تمام حدود و قیود کارفرما رہیں تو ناممکن اور محال ہے کہ غیر فطری تفاوت اور غربت و امارت کا مذموم سماجی تنوع کسی حالت میں بھی وجود پذیر ہو سکے چنانچہ آنیوالی تفصیلات سے بخوبی اس کا اندازہ ہو جائیگا۔ اور اس اجمال کی تفصیل اور اس کی حقیقت کی وضاحت "انشاء اللہ" بہت جلد آئندہ صفحات میں معاشی نظام کی شرح سے معلوم ہو جائے گی۔

بہرحال اسلام نے تمام خوشحالی اور حق معیشت کی عام مساوات کو اپنے نظامِ معاشی میں "ریڑھ کی ہڈی" تسلیم کیا ہے اور ایک صالح معاشی نظام کو بروئے کار لانے میں جماعتی

نظام اور نظامِ حکومت (خلافت) کو ایسے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے جو متذکرہ صدر اصولوں کی بنیادیں استوار کرتا اور عالمِ انسانی کو باہم معاشی دست بُرد اور رقابت کے فتنہ سے بچاتا اور عالمگیر اخوّت و ہمدردی کو قائم کرتا ہے۔

یہی وہ نظام ہے جو خلافتِ راشدہ کے دَور میں کارفرما رہا اور تاریخِ ماضی شاہد ہے کہ اپنی عملی افادیت اور معاشی مقصد کے حصول میں اس دَور کا اسلامی معاشی نظام، کائنات کے جدید و قدیم نظامہائے معاشی کے مقابلہ میں عام مرفہ الحالی اور عالم اخوت و ہمدردی کے لئے زیادہ کامیاب ثابت ہوا:

اور اگر روم و ایران کے اختلاط نے خود مسلم حکمرانوں کو شہنشاہیت، قیصریت اور کسرویت کی حرص و آز میں مبتلا اور اسلامی نظامِ حکومت (خلافت) کو خود اپنے ہاتھوں تباہ و برباد نہ کیا ہوتا تو یقیناً دنیا کی تاریخ کا رُخ آج دوسرا ہوتا اور مادیین کو اس نکتہ چینی کا کبھی موقعہ میسر نہ آتا "کہ اگر اسلام کا معاشی نظام ممکن العمل ہوتا تو اس کا دورِ حیات اس قدر قلیل نہ ہوتا، انھیں کیا معلوم کہ اسلام کے "نظریاتِ معاشی" علمی اور تجربانی زندگی میں تمام معاشی نظریات سے زیادہ بلند اور کامیاب ثابت ہوئے لیکن بمصداق ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مسلم حکمرانوں نے اپنی ذاتی حکمرانی کے لالچ میں اس بہترین نظام کو خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالا۔ کیونکہ وہ یہ برداشت نہ کر سکے کہ خلافت تنفیذِ قوانینِ الٰہی کے لئے صرف "نیابت" اور "خدمتِ خلق" کی حیثیت میں ظاہر ہو اور وہ ذاتی اقتدارِ اعلیٰ اور شخصی حکومت و صولت کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے ایک عرصہ تک اگرچہ نام خلافت ہی استعمال کیا مگر ہمیشہ اسکے پردہ میں شاہنشاہی اور سلطانی کو مسندِ اوا بنائے رکھا (انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نظامِ حکومت | الحاصل اسلام نے جب حریتِ انسانی کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اسکے اجتماعی نظام میں حکومت، کارفرمائی، اور وضعِ قانونِ اساسی کا معاملہ دنیا کے

کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس کا حقیقی مؤسس صرف خدائے واحد ہے اور وہی واضع قوانین ہے اور "خلیفہ" اس کے اساسی قانون کی روشنی میں "نیابت" اور "تنفیذ" کی خدمت انجام دیتا ہے۔ [1]

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ (یوسف)	حکم خدا کے سوا کسی کا حق نہیں ہے۔
مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ	وہ (خدا) ملک کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے دیدیتا ہے
وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران)	اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔
اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ	بلاشبہ زمین اللہ کے لئے ہی ہے وہ اپنے بندوں میں
یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ	سے جس کو چاہتا ہے اس کو وارث کر دیتا ہے اور
لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ (اعراف)	انجام متقیوں کے لئے ہی ہے۔
مَلِکِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (الناس)	وہ (خدا) انسانوں کا بادشاہ (ہے) انسانوں کا خدا ہے
اَلَا لَهُ الْحُکْمُ (انعام)	خبردار ہو "حکم" اسی "خدا" کا ہے۔

حیثیت امیر اسی لئے اس نے "حکومت علیٰ منہاج النبوۃ" کے صاحب اقتدار (نائب) کے لئے شاہنشاہ، ڈکٹیٹر اور صدر جمہوریہ اور نیابت کے لئے شاہنشاہیت، ڈکٹیٹر شپ اور جمہوریت [2]، کی تعبیر نہیں کی بلکہ "خلیفہ" اور "خلافت" کے عنوان کو اختیار کیا تاکہ ابتدائی تخیل میں ہی یہ واضح رہے کہ یہاں "نیابتِ الٰہی" اور "خدمتِ خلق" کے علاوہ شخصی اور پارٹی اقتدار کا کوئی مقام نہیں بن سکتا چنانچہ حضرت آدمؑ کے لئے ارشادِ ربانی ہے۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ)	میں زمین پر اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں۔

[1] حدیث "السلطان ظل اللہ فی الارض" کی تسلیم صحت کے بعد اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر سلطان اسلام خلیفہ کا طرز حکومت منہاج نبوت کے عین مطابق اور نیابت کا صحیح نمونہ ہے تو بلاشبہ وہ اللہ کا سایہ ہے، ورنہ سلطان بمعنی مطلق العنان شخصی حکمراں کے لئے اسلامی نظام حکومت میں قطعاً کوئی جگہ نہیں ہے۔ [2] اس جگہ جمہوریت کی نفی اس معنی میں ہے جس کا مظاہرہ آج کل امریکہ، انگلستان اور بعض دوسرے ممالک یورپ میں نظر آتا ہے۔

اور حضرت داؤدؑ کے لئے ارشاد ہے :-

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ (ص)	اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بناکر بھیجا ہے۔
کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی و سیکون بعدی خلفاء فیکثرون قالوا فما تامرنا؟ قال اوفوا ببیعۃ الاول۔ (بخاری ومسلم)	بنی اسرائیل کی سیاست (تدبیر امور) ان کے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں تھی جب کسی نبی کا انتقال ہوتا تو اس کی جگہ دوسرے نبی جانشین ہوجاتے اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور عنقریب میرے بعد خلفاء (خلیفہ ہائے خلافت) ہونگے اور زیادہ ہوجائیں گے صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ انکے متعلق ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا جمہور نے جس کو اول چن لیا ہے اسکے ہاتھ پر بیعت کرو۔

بیشک اسلام کے نظامِ حکومت میں خلیفہ کی شخصیت نمایاں ہے مگر ذاتی اور پارٹی کے اقتدار کی خاطر نہیں بلکہ قلمروِ خلافت کے ہر فرد کی خدمت کیلئے بلاشبہ اس میں جمہوریت کا عنصر روشن ہے لیکن جمہور کے حقوق کی حفاظت کے لئے نہ کہ وضع قوانین وطرز حکومت میں مخالف اور موافق جماعت قائم کرنے اور اقلیت و اکثریت کی بحث جاری رکھنے کیلئے اسلئے۔ اسلام کا طرزِ حکومت (خلافت) قدیم وجدید طریقہ ہائے حکومت میں سے کسی کے ساتھ تعبیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ ان سب سے الگ ایک ایسا روشن نظام ہے جس میں عدل وانصاف کی یکسانیت اور افرادِ امت کی خدمت اصل بنیاد واساس ہے۔ وہ ایک ایسا "شوروی نظام" ہے جس میں "خلیفہ" راہِ حق کا راہنما بھی ہے اور خدمت خلق کا خادم بھی۔ وہ نیابتِ الٰہی کے منصب سے اگرچہ تمام افرادِ امت کا والی ہے لیکن اس کے عزل ونصب میں افرادِ امت دخیل وسہیم ہیں اور مہماتِ امور میں

"شوریٰ" کا پابند ہے اور اہل الرائے کی مشاورت ہی اسکا "عزم" ہے۔ غرض اسلام نے "خلافت" کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جس میں امیر و مامور اور خلیفہ اور جماعت کے درمیان ایک لمحہ کے لئے بھی حاکم و محکوم کا علاقہ قائم نہیں ہونے پاتا اور عدل و انصاف میں مساوات عام کو اساس بناکر جماعتی اور شخصی اقتدار کی جنگ کا خاتمہ کر دیتا ہے چنانچہ حسب ذیل آثار سے امیر اسلام کی حیثیت کے متعلق ایک جھلک معلوم ہو سکتی ہے۔

عن الحسنؒ قال کتب عمرؓ الی ابی موسیٰؓ ان الاعمال مؤداۃ الی الامیر ما ادی الامیر الی اللہ عزوجل۔ ؎۱

حسنؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰؓ اشعریؓ کو ایک خط لکھا جس میں مذکور تھا "بلاشبہ رعایا کے اعمال اسوقت تک "امیر" کی طرف رجوع رہینگے جبتک امیر "خدا" کی طرف رجوع رہیگا اور نیابت الٰہی کی ذمہ داری کو ادا کرتا رہے گا۔"

قال انس بن مالکؓ عن معاذ بن جبلؓ قال یا رسول اللہ ارأیت ان کان علینا امراء لا یستنون سنتک ولا یاخذون بامرک فما تأمرنا فی امرہم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا طاعۃ لمن لم یطع اللہ۔ رواہ احمد۔ ؎۲

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلعم آپ یہ فرمائیں کہ اگر ہم پر ایسے (امیر) مسلط ہو جائیں جو نہ آپ کی سنت پر عمل کرتے ہوں اور نہ آپ کے ارشادات کی پرواہ کرتے ہوں تو ان کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتا تو مخلوق پر اس (امیر) کی اطاعت باقی نہیں رہتی۔

قال علی بن ابی طالب علیہ السلام کلمات اصاب فیہن الحق، قال

حضرت علیؓ فرماتے ہیں چند کلمات ہیں جنہیں حق کہا گیا ہے فرمانے لگے "امام پر واجب ہے کہ قانون عزیز کے مطابق فیصلے دے اور امانت کو شعار بنائے۔

؎۱ کتاب الاموال ص ۵۔ ؎۲ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۲۲۵۔

يحق على الامام ان يحكم بما انزل الله وان يودي الامانة فاذا فعل ذلك فحق على الناس ان يسمعوا له و يطيعوا و يجيبوه اذا دعاه

پس اگر اس نے ایسا کر لیا تو لوگوں پر واجب ہے کہ اس کی سنیں اور اطاعت کریں اور اگر وہ کسی امر کے متعلق بلائے تو اسکو قبول کریں" ورنہ نہیں"

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما من امتي احد ولي من امر الناس شيئا لم يحفظهم بما حفظ به نفسه و اهله الا لم يجد رائحة الجنة۔ ؎

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا میری امت میں سے اگر کوئی شخص لوگوں کے معاملات کا والی بنا اور اس نے انکے معاملات کی اس طرح حفاظت نہ کی جس طرح اپنی اور اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتا ہے تو جنت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

التزامِ جماعت واطاعتِ امیر

پس اگر خلیفہ، امیر یا امام، نیابتِ الٰہی کے بنیادی اصولوں کا پابند ہے تو پھر اسلام نے جمہور کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ نیابتِ الٰہی کے حامل "خلیفہ" کی پیروی کریں کیونکہ یہ پیروی اس کی شخصیت کی پیروی نہیں ہے بلکہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسولؐ کی پیروی ہے۔ اور اس مسئلہ کو اس درجہ اہم قرار دیا ہے کہ مسلمانوں کے ہر قسم کے جماعتی نظم اور روزمرہ کی زندگی میں بھی "امارت" کے مسئلہ کو دخیل اور کارفرما بنایا ہے چنانچہ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی ان حقائق کے لئے شاہد عدل ہیں۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (نساء)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور حاکموں (امیر) کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (الانفال)

اور اللہ کی پیروی کرو اور اس کے رسولؐ کی اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ایسا کرو گے تو تمہاری قوت سست پڑ جائیگی اور ہوا اکھڑ جائیگی اور

؎ کتاب الاموال ص ۹۵ ؎ طبرانی معجم صغیر واوسط منقول از مجمع الزوائد ج ۵

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۔ (آل عمران)

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کا یہ حال ہے کہ ان کے پاس خدا کی بیّنات آئیں مگر ان کے بعد بھی وہ ٹکڑے ٹکڑے ہی رہے۔

عن ابی ہریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء کلما ہلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون بعدی خلفاء (الحدیث) [۱]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء انجام دیتے تھے جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو دوسرا نبی پہلے کا قائم مقام آجاتا۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور قریب ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کی سیاست خلفاء انجام دینگے۔

لا یحل لثلاثۃ یکونون فی الفلاۃ من الارض الا امروا علیہم احدہم [۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمی اگر چٹیل میدان میں بھی موجود ہوں تو ان کے لئے بغیر اس بات کے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں زندگی گذارنا جائز نہیں ہے"

عن ابی ہریرۃ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من خرج من الطاعۃ وفارق الجماعۃ فمات میتۃ جاہلیۃ [۳]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے جو شخص اطاعت (امیر) سے باہر ہو گیا اور جماعت سے علیحدہ ہو گیا اس کی موت جاہلیت کی موت ہے فاروق اعظمؓ نے فرمایا، اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے اور

لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ ولا امارۃ الا بطاعۃ [۴]

جماعت امارت کے بغیر نہیں اور امارت بغیر طاعت و پیروی کے نہیں ہے۔

---

[۱] بخاری و ترمذی باب الخلافہ [۲] مسند احمد، و مشکوٰۃ باب الامارۃ [۳] مسلم ج ۲ ص ۱۲۸ [۴] جامع لابن عبد البر ص ۶۲۔

عن عروۃ قال خطب ابو بکر رضی اللہ عنہ فحمد اللہ واثنی علیہ ثم قال اما بعد فانی ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکنہ نزل القرآن وسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلمنا فعلمنا وان اقواکم عندی الضعیف حتی اٰخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی اٰخذ منہ الحق۔ ایھا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان انا احسنت فاعینونی وان انا زغت فقومونی اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم۔ [1]

حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا، اول اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی پھر فرمایا "بعد حمد وصلوٰۃ میں تمہارا امیر بنادیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، لیکن قرآن عزیز نازل ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت (حدیث) کو بیان فرمایا، ہم نے ان کو سیکھا اور ان پر عمل کیا اور بلاشبہ تمہارے زبردست میرے لئے اسوقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق نہ لیلوں، اور بلاشبہ تمہارے زبردست میرے پاس اس وقت تک زبردست ہیں جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلیلوں لے لوگو! میں (احکام اسلام کا) پیرو ہوں کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں۔ بس اگر میں نیکی کی زندگی اختیار کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کردو۔ میں یہی باتیں کہتا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے خدا سے مغفرت چاہتا ہوں۔

عن سلمان قال۔ ان الخلیفۃ ھو الذی یقضی بکتاب اللہ ویشفق علی الرعیۃ شفقۃ الرجل علی اھلہ فقال کعب الاحبار صدق۔ [2]

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ صحیح معنی میں "خلیفہ" وہی ہے جو کتاب اللہ قرآن کے مطابق فیصلہ کرے اور رعیت پر اسی طرح شفقت کرے جسطرح ایک شخص اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے؟ کعب احبارؓ نے یہ سنا تو کہا، سلمانؓ نے سچ کہا۔

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۶۶ [2] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۳۱۔

شوریٰ | اور جس طرح "امتِ مسلمہ" پر لزومِ جماعت اور اطاعتِ امیر کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح امیر (خلیفہ) پر یہ واجب کیا کہ وہ مہماتِ امور میں اہلِ حل وعقد سے مشورہ کرے اور حسب اقتضاء معاملات جمہور سے بھی مشورہ کرنا اپنے اہم فرائض میں سمجھے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے:-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران)	اور ان (صحابہ) سے معاملات میں مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم قائم ہو جائے تو پھر صرف اللہ پر بھروسہ رکھو۔

علمائے اسلام کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے اولوالعزم پیغمبر کیلئے کہ اُن پر شب و روز وحی نازل ہوتی رہتی تھی اور اس لئے مشورہ کے محتاج نہیں تھے "مشورہ حاصل کرنیکا حکم نازل ہوا تو خلفاءِ اسلام کے لئے تو یہ امر بلاشبہ وجوب کا درجہ رکھتا ہے اور اسی لئے "حکومتِ اسلامی کو" شورائی طرزِ حکومت "کہا جا سکتا ہے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

لا غنی لولی الامر عن المشاورۃ فان اللہ امر بھا نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فغیرہ صلے اللہ علیہ وسلم اولی بالمشورۃ۔ لـ	امیر (خلیفہ) کو مشورہ کے بغیر چارہ نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے تو پھر آپ کی ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے تو بہت زیادہ مشورہ کے محتاج ہیں۔

اور جب "امیر" مشورہ کرلے تو پھر وہ اہل الرائے کے مشورہ کا پابند ہے اسلئے کہ وہ مشورہ ہی دراصل اس کا وہ "عزم" ہے جسکا ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ میں یہ نصِ صریح قطعی اور فیصلہ کُن ہے۔

عن علیؓ قال سئل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن العزم	حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آیتِ قرآنی میں عزم

لـ السیاستہ الشرعیہ ص ۷۵۔

فقال مشاورۃ اھل الرأی ثُمَّ اتباعھم۔ ؎	سے کیا مراد ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر انکے مشورہ کا پابند ہونا ہی عزم ہے۔

اور دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔ (شوریٰ)	اور انکے (مسلمانوں کے) معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

اور ان آیات کی وضاحت جس طرح حضرت علیؓ کی حدیث سے ہو چکی ہے اسی طرح حسبِ ذیل آثار و احادیث بھی اس حقیقت کو بخوبی روشن کرتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں "خلافت" اور "شوریٰ" کے درمیان کیا نسبت ہے؟

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوکنت مستخلفا احداً عن غیر مشورۃ لاستخلفت ابن ام عبد۔ ؎	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی شخص کو بغیر مشورہ کے خلیفہ بناتا تو عبد اللہ بن مسعودؓ کو بناتا۔
عن عمر بن الخطاب قال لا خلافۃ الا عن مشورۃ۔ ؎	حضرت عمر بن الخطاب نے فرمایا کہ خلافت بغیر مشورہ کے "خلافت" نہیں ہے

غزوۂ اُحد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور معمر و جلیل القدر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے مگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور نوجوانوں کی رائے یہ ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کی جائے جب آپ نے یہ دیکھا کہ اکثریت باہر نکل کر جنگ کرنیکے حق میں ہے تو اسی کے مطابق "عزمِ جنگ" کیا اور مسلح ہونے کے لئے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔ اس دوران میں معمر صحابہؓ نے نوجوانوں کو عار دلائی کہ تم نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے عندیہ کا لحاظ کئے بغیر ذاتِ اقدس کو تکلیف میں ڈالا، یہ سن کر نوجوان متاثر ہوئے اور معذرت

ؔ۱ تفسیر ابن کثیر و دُر منثور عن ابن مردویہ بسند حسن۔ ؔ۲ مستدرک حاکم۔ ؔ۳ کنز العمال۔

کرنے کے لئے حجرہ کے سامنے جمع ہو گئے آپ جب باہر تشریف لائے اور نوجوانوں کی معذرت کو
سُنا تو فرمایا کہ "عزم" کے بعد اب نبیؐ کی شان نہیں ہے کہ مقصد حاصل کئے بغیر غیر مسلح ہو جائے
چلو اب مدینہ سے باہر ہی میدانِ جنگ قائم ہوگا۔ ؎۵

عراق و شام کی فتح پر خلیفۃ المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہوئی کہ ان ملکوں
کی زمین کو مجاہدین و غانمین میں تقسیم نہیں ہونا چاہئے بلکہ خلافت (اسٹیٹ) کی ملکیت
میں رہنی چاہئے تاکہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی ضروریات اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں اسکی
آمدنی خرچ ہوتی رہے مگر بعض صحابہؓ نے جب اس سے اختلاف کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے
اہلِ حل و عقد سے مشورہ کیا اور جب ان میں بھی بات طے نہ ہو سکی اور اختلاف ہنوز باقی رہا
تب آپ نے مسجدِ نبوی میں "اجلاس عام" طلب فرمایا۔ اور جمہور کے جمع ہونے پر حمد و ثنا کے بعد خطبہ
دیا جسکے حسب ذیل جملے قابلِ غور ہیں اور ان سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نظامِ
حکومت میں "امیر" کی امارت اور "خلیفہ" کی کیا حیثیت ہے:۔

انی لم ازعجکم الا لان تشرکوا فی	میں نے تمکو خواہ مخواہ تکلیف نہیں دی بلکہ اسلئے جمع کیا ہے
امانتی فیما حملت من امورکم فانی	کہ آپ بھی میری اس امانت میں شرکت کریں جو ان
واحد کاحدکم وانتم الیوم	امور سے متعلق ہے جسکا بوجھ آپ نے میرے کاندھوں پر
تقرون بالحق خالفنی من خالفنی	ڈالا ہے بلاشبہ میں بھی تمہاری ہی طرح ایک فرد ہوں اور
ووافقنی من وافقنی ولست ارید	تم آج حق کا اعلان کرو گے جسکو مجھ سے اختلاف ہو
ان تتبعوا ھذا الذی ھوای معکم	وہ صاف صاف اپنی رائے ظاہر کرے اور جس کو وافقی
من اللہ کتاب ینطق بالحق. فو	اتفاق ہو وہ اتفاق ظاہر کرے میں ہرگز یہ نہیں چاہتا
اللہ لئن کنت نطقت بامر	کہ آپ میری رائے اور خواہش کی پیروی کریں اسلئے کہ
اریدہ ما ارید بہ الا	تمہارے پاس خدائے تعالیٰ کی دی ہوئی کتاب (قرآن) ہے جو

؎۵ فتح الباری ج ۷، باب غزوۂ احد۔

الحق۔ ۳؎ حق کیلئے تنا حق ہے بخدا میں اگر کوئی بات کہتا ہوں تو میرا ارادہ اس گفتار میں حق کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

نیز اسلام کے نظامِ حکومت میں "خلیفہ" کا مقام "خلافت" کے ادائے فرائض کے علاوہ ہر ایک شعبہ ہائے زندگی میں "قانونِ اسلام" یعنی عدل وآئین کی نظر میں دوسروں کے مقابلہ میں کوئی برتری نہیں رکھتا اور اس حیثیت میں امیر و مامور اور راعی و رعایا سب مساوی ہیں۔ چنانچہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ بن عمرو نے ایک مصری کو کوڑے سے پیٹا، اس نے حضرت عمرؓ کے پاس جا شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاص کو ان کے بیٹے سمیت مدینہ بلوایا اور ان کی موجودگی میں مصری کو حکم دیا کہ وہ عبداللہ بن عمرو سے اپنا بدلہ لے، عمرو بن العاصؓ دیکھ رہے تھے اور ان کا بیٹا مصری کے ہاتھ سے پٹ رہا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

مذ کم تعبد تم الناس وقد	تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنا لیا حالانکہ ان کی
ولدتهم امهاتهم احرارا۔ ۴؎	ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کیا۔

یا امیر المومنین لم اعلم ولم	اے امیر المومنین۔ اس واقعہ کی مجھے مطلق خبر نہیں
یأتنی۔ ۵؎	ہوئی اور نہ یہ مصری میرے پاس آیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عمال (گورنروں) کو موسم حج میں بلایا اور پھر تمام لوگوں کو جمع کر کے تقریر فرمائی کہ میں نے ان "عمال" کو اس لئے بلایا ہے کہ یہ تمہاری جان تمہارے مال اور تمہاری آبرو کے محافظ ہیں نہ کہ مصیبت وتکلیف پہنچانے کے لئے بھیجے گئے ہیں اس لئے ان میں سے اگر کسی نے بھی کوئی ظلم کیا ہو اور کوئی داد رسی کا خواہاں ہے تو کھڑا ہو کر کہے تاکہ داد رسی کی جائے یہ سن کر صرف ایک شخص کھڑا ہوا کہ فلاں عامل (گورنر) نے بلاوجہ میرے

۳؎ کتاب الخراج ص ۱۵۔ ۴؎ و ۵؎ حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۰۱۔

سو کوڑے مارے اور مجھ کو ستایا۔ تحقیقِ حال کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے شخص تو برسرِ عام اس گورنر کے کوڑے لگا اور اس سے اپنا انتقام لے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ گورنرِ مصر نے یہ دیکھا تو کہا کہ آپ ایسا نہ کریں ورنہ عاملین میں عام بددلی پیدا ہو جائیگی اور آئندہ کے لئے یہ دستور بنجائیگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

الا اقیدہ منہ وقد رأیت رسول	میں کس لئے اس سے بدلہ دلاکر انصاف نہ کروں
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقید	جب کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
من نفسہ۔ قم فاستقد۔	دیکھا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ اقدس کو بھی بدلہ کیلئے
؎	پیش فرما دیتے تھے اے شخص کھڑا ہو اور اپنا بدلہ لے۔

تب حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کیا آپ اجازت دیں تو میں اس مظلوم سے بات کروں حضرت عمرؓ نے اجازت دیدی تو عمرو بن العاصؓ نے اس شخص کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ایک کوڑے کے بدلہ میں دو دینار قبول کر لے اور اس طرح دو سو دینار دیت دیکر عامل کو چھٹکارا دلایا۔ ؎

اس روایت میں حضرت عمرؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غزوۂ بدر میں آپؐ ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں سیدھی کر رہے تھے سواد بن غزیہؓ صف سے کچھ الگ تھے آپ نے چوکا دیکر فرمایا سواد! برابر کھڑے ہو۔

فقال یا رسول اللہ اوجعتنی وقد	سوادؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ نے مجھکو
بعثک اللہ بالحق والعدل فاقدنی	تکلیف دی حالانکہ اللہ نے آپکو حق و انصاف کیلئے مبعوث
فکشف رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کیا ہے بس آپ اجازت دیجئے کہ میں آپسے بدلہ لوں رسول
وسلم عن بطنہ فقال استقد	اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا بطنِ مبارک کھولدیا
قال فاعتنقہ فقبل بطنہ الخ	اور فرمایا سواد! اپنا بدلہ ضرور لو سواد فوراً آپ کے
؎	گلے سے چمٹ گئے اور بطنِ مبارک کو چوم لیا۔

؎ و ؎ کتاب الخراج ص ۱۱۶۔ ؎ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۷۱۔

عدل وانصاف میں مساوات سے متعلق اسلامی خلافت کے سینکڑوں واقعات میں سے نمونہ کے طور پر صرف یہ دو واقعے نقل کئے گئے ہیں اب معاشی شعبۂ حیات کے چند واقعات بھی ملاحظہ ہوں۔

عن عائشة قالت لما استخلف ابوبکر قال لقد علم قومی ان حرفتی لم تکن تعجز عن مؤنة اهله و شغلت بامر المسلمين فياكل آل ابوبكر عن هذا المال ويحترف للمسلمين فيه۔ [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے خطبہ میں کہا یہ بات میری قوم بخوبی جانتی ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل وعیال کی کفالت سے عاجز نہیں ہے مگر اب میں مسلمانوں کے معاملات (خلافت) میں مشغول کردیا گیا ہوں۔ لہٰذا اب ابوبکرؓ کے اہل وعیال کی "قوت لا یموت" بیت المال سے ملیگی۔ اور ابوبکر مسلمانوں کی خدمت انجام دیگا۔"

وکان عمر یرزق العامل بحسب حاجته و بلده۔ [2]

"اور حضرت عمرؓ ہر گورنر کو اسکی ضروریات اور شہر کے حالات کے پیش نظر مشاہرہ دیا کرتے تھے۔"

جمع عمر المسلمين لاول عهده و قال ما يحل للوالی من هذا المال فقالوا جميعا اما الخاصة فقوته و قوت عياله لاوکس ولاشطط وکسوتهم وکسوته للشتاء و الصیف ودابتان الی جهاده وحوائجه وصلوته وحجه و

حضرت عمرؓ نے اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا، خلیفہ کے لئے اس (بیت المال) سے کسقدر لینا حلال ہے۔ سب نے باتفاق کہا اسکو صرف اپنی ضروریات اور اپنے عیال کی ضروریات کے لئے قوت لا یموت لینا چاہیے جس میں کسی قسم کی کمی زیادتی نہونے پائے اور اپنے لئے اور عیال کے لئے سردی اور گرمی کے کپڑے اور جہاد، روزانہ کی ضرورت نماز

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۶۶ [2] الاسلام والحضارة العربیہ ج ۲ ص ۱۳۱۔

عمرتہ والقسم بالسویۃ ۔ لہ

حج اور عمرہ کے لئے دو سواری کے جانور اور مال غنیمت وغیرہ میں سب مسلمانوں کے برابر اس کا حصہ ہے اور بس

قال عمر انما انا و مالکم معطی الیتیم ان استغنیت استعففت و ان افتقرت اکلت بالمعروف ۔ کہ

"حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھکو تمہارے مال (بیت المال) میں اتنا ہی حق ہے جس قدر کہ یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں اگر میں رفاہیت میں ہونگا تو کچھ نہ لونگا اور اگر حاجتمند ہونگا تو دستور کے مطابق کھانے کو لونگا

اور یہی حضرت عمرؓ تمام خوشحالی کیلئے یہ جذبات رکھتے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچا گئے

اما واللہ لئن بقیت لادعن ارامل العراق لادعنھم لا یفتقرون الی امیر بعدی ۔ سہ

"قسم بخدا ۔ اگر میں زندہ رہا تو اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسا کر جاؤنگا کہ میرے بعد وہ کسی امیر کے پاس حاجتمند بن کر پیش نہوں ۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہونے سے پہلے بڑے شاہانہ انداز میں رہتے تھے لیکن جب خلیفہ بنائے گئے تو یہ حالت تھی ۔

ثم رأیتہ بعد ان ولی الخلافۃ یمشی مشیۃ الرھبان ۔ کہ

پھر میں نے خلافت کے بعد ان کو (عمر بن عبد العزیزؒ) دیکھا تو انکی حالت راہبوں کی سی ہو گئی ۔

یعنی موٹا پہنتے تھے اور روکھا کھاتے تھے اور یہ طبعاً نہ تھا بلکہ خلافت راشدہ کے خصوصی امتیاز کے پیش نظر تھا ۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنائے گئے تو حضرت علیؓ نے ان سے کہا :-

ان اردت ان تلحق صاحبک فارقع القمیص و نکس الازار و اخصف النعل فارقع الخف

"اگر تم چاہتے ہو کہ تم کو اپنے صاحب (ابوبکرؓ) کی رفاقت نصیب ہو تو کرتے پر پیوند ہوں ، ازار اونچا ہو جوتیوں پر پیوند ہوں ، موزے پھٹے پرانے ہوں اسی میں

لہ دوستہ الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج۱ ص ۱۲۰ سہ کتاب الخراج ص ۲۷ کہ ایضاً ص ۱۷

وقعہ الا مثل وکل دون المشبع۔ ؎	کرتا۔ ہو جائیں اور کھانا پیٹ بھر کر نہ کھایا جائے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمعہ میں تاخیر سے تشریف لائے اور اگر یہ عذر پیش کیا کہ میرے پاس ایک جوڑا کپڑوں کا ہے اسکو دھو کر خشک کرنے میں دیر ہو گئی۔ حضرت قتادہؓ اور حسن رضی اللہ عنہما، فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت عمرؓ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ انکے قمیص میں بارہ پیوند تھے اور اکثر پیوند چمڑے کے تھے۔ ؎

جب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تو آپ نے منبر پر چڑھ کر بعد حمد و صلوٰۃ یہ تقریر فرمائی:-

ایہا الناس فانی قد ولیت	لوگو! میں تم پر والی مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے
علیکم ولست بخیرکم فان	بہتر نہیں ہوں اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرو
احسنت فاعینونی وان اسأت	اور اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو سچائی
فقومونی الصدق امانۃ و	امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ انشاء اللہ تمہارا کمزور
الکذب خیانۃ والضعیف فیکم	بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا
قوی عندی حتی ارجع علیہ حقہ	حق دلا دوں اور تمہارا قوی بھی کمزور ہے تا آنکہ میں اس سے
انشاء اللہ والقوی فیکم الضعیف	دوسرے کا حق واپس دلا دوں، جو قوم جہاد فی سبیل اللہ
حتی اخذ الحق منہ انشاء اللہ	چھوڑ دیتی ہے اسکو اللہ تعالیٰ خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں
لایدع قوم الجہاد فی سبیل اللہ	بدکاری عام ہو جاتی ہے اللہ اس کی مصیبت کو بھی عام
الا ضربہم اللہ بالذل ولا تشیع	کر دیتا ہے۔ اگر میں خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت
الفاحشۃ فی قوم الا عمہم اللہ بالبلاء	کروں تو تم بھی میری اطاعت کرو لیکن جب میں خدا
اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فا	اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر بھی میری

؎ کتاب الخراج ص ۱۵ ؎ کنز العمال باب خلافۃ الفاروق و تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۱۳۴۔

عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم قوموا الی صلوٰتکم رحمکم اللہ۔ — اطاعت نہیں۔ اچھا اب نماز کے لئے کھڑے ہو۔ خدا تم پر رحم فرمائے۔

اور بعض روایات میں اس طرح منقول ہے:۔

الا وانکم ان کلفتمونی ان اعمل فیکم بمثل عمل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لم اقم بہا الا وانما انا بشر ولست بخیر من احد کم فراعونی فاذا رأیتمونی استقمت فاتبعونی واذا رأیتمونی زغت فقوّمونی الخ۔ [۵۲] — واضح ہو کہ اگر تم مجھے اس پر مجبور کرو کہ میں تمہارے معاملات نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح انجام دوں، تو میں اس قابل نہیں کہ آپ کی شخصیت کا حق ادا کر سکوں، اس لئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں اور تم میں سے ایک معمولی فرد سے بھی بہتر نہیں ہوں پس تم میری نگہبانی کرو، پس اگر میں راستی اختیار کروں تو میری پیروی کرو اور اگر مجھے کجرو پاؤ تو سیدھا کر دو۔"

ابو رواہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے اپنے عمال کو ایک مرتبہ یہ تحریر فرمایا:۔

تمام لوگوں کو اپنے نزدیک برابر سمجھو۔ ان میں قریب اور بعید انصاف اور حق کے معاملے میں سب یکساں ہیں۔ رشوت لینے اور اپنی خواہش کے تابع احکام دینے سے بچو اور اگر غصہ میں کسی سے جائز مواخذہ کرو تو حق پر قائم رہو، اور دن کی ایک ساعت میں بھی حق کے خلاف نہ ہونے پائے۔ [۵۳]

حضرت عمرؓ کا رعایا کی زندگی کو خوشحالی بنانے اور انکے ہر قسم کے حقوق کی حفاظت کرنے کی انتہائی خواہش کے سلسلہ میں راتوں کو تفتیش حالات کے لئے گشت کرنا ایک مشہور تاریخی حقیقت ہے لیکن حضرت عمرؓ اس کو بھی کافی نہیں سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:۔

اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ شب کا گشت تمام قلمرو میں پورے سال کیا کرونگا کیوں کہ میں

---

[۱] اشہر مشاہیر الاسلام ص ۲۷۴ و ۲۸۴۔ [۲] البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۰۱۔ [۳] اشہر مشاہیر الاسلام ج ۲ ص ۳۴۹

یہ جانتا ہوں کہ ہر قسم کی کوشش کے باوجود لوگوں کی بعض حاجات یقیناً پوری ہونے سے رہ جاتی ہوں گی۔ کیونکہ وہ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور عمال شاید ان کو مجھ تک نہ پہنچاتے ہوں۔ اور اس لئے دو مہینے مصر کا دورہ کرونگا۔ دو مہینے بحرین کا اور اسی طرح کوفہ وبصرہ وغیرہ کا۔ [1]

ایک مرتبہ صدیق اکبرؓ کی زوجۂ محترمہ نے کسی شیریں چیز کے کھانے کی خواہش کی صدیق اکبرؓ نے فرمایا میرے پاس اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ تمہاری یہ خواہش پوری کی جاسکے زوجۂ محترمہ نے عرض کیا۔ اجازت دیجئے کہ بیت المال سے جو وظیفہ ہم کو ملتا ہے اس میں سے چند روز تک کچھ پس انداز کر کے خود کو "حلوا" کی خریداری کے قابل بنالیں۔ صدیق اکبرؓ نے اجازت دیدی، جب ایک عرصۂ دراز تک پس انداز کرتے رہنے کے بعد انھوں نے ایک حقیر رقم پس انداز کر کے صدیق اکبرؓ کو خبر دی تو آپ نے وہ رقم انسے منگائی اور بیت المال میں داخل کردی اور فرمایا:۔

ھذا یفضل عن قوتنا واسقط	معلوم ہوا کہ ہم اپنی قوت لایموت سے اسقدر زائد لے رہے
نفقتہ بمقدار مانقصت	ہیں اور یہ کہکر اس روز سے بقدر اسکے آزوقہ میں سے کم
کل یوم وغرم لبیت المال	کردیا اور گذشتہ کے ہر دن کا حساب لگاکر مقدار زائد کو
من ملک کان لہ۔ [2]	اپنی ذاتی ملکیت میں سے بطور تاوان بیت المال کو ادا کردیا۔

صدیق اکبرؓ جب خلیفہ بنائے گئے تو ایک روزہ اپنے ہاتھ پر چند چادریں ڈالے ہوئے بازار جارہے تھے، راہ میں حضرت عمرؓ ملے انھوں نے کہا کہ "اولی الامر" بننے کے بعد یہ تجارتی کاروبار کیسا؟ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ آخر میں اہل وعیال کی معاش کی کیا سبیل کروں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ چلئے ابو عبیدہؓ آپ کی ضروریات دیکھکر بیت المال سے وظیفہ کی مقدار متعین کردینگے چنانچہ دونوں حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس پہنچے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ آپکو

---

[1] طبری عن الحسن [2] اشہر مشاہیر الاسلام ج ۱ ص ۹۳۔

ایک عام مہاجر کو جو وظیفہ ملتا ہے وہی دیا جائے نہ زیادہ نہ کم اور گرمی جاڑے کے کپڑے۔

ففرضا لہا کل یوم نصف شاۃ	پس دونوں (عمرؓ و ابو عبیدہؓ) نے ابوبکرؓ کے لئے روزانہ
وما کساہ فی الراس و	خوراک میں آدھی بکری اور اس قدر لباس کہ سر اور
البطن۔ لہ	پیٹ کو ڈھک سکے مقرر کر دیا

ابن سعیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ دوپہر کے وقت مسجد نبوی کے صحن میں کچی اینٹ کا تکیہ سر کے نیچے رکھے ہوئے آرام فرما رہے تھے۔ میں نے گھر جا کر اپنے والد سے دریافت کیا کہ ایسا حسین و جمیل شخص اس حالت میں کون تھا جو مسجد میں لیٹا ہوا تھا۔ والد نے کہا یہ امیر المؤمنین عثمانؓ ہیں ؎

ابو الفرات کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان غنیؓ نے کسی بات پر غصہ میں اپنے غلام کا کان پکڑ کر مروڑ دیا مگر فوراً ہی بعد غلام سے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی تو بھی میرا کان پکڑ کر مروڑ تاکہ بدلہ پورا ہو جائے۔ باصرار کہنے پر غلام نے معمولی طور پر کان کو ہاتھ لگا دیا فرمایا نہیں خوب زور کے ساتھ مروڑ اور پھر فرمایا۔

یا حبذا القصاص فی الدنیا	وہ بدلہ کس قدر اچھا ہے کہ دنیا میں ہی لے لیا جائے
لا قصاص فی الآخرۃ ؎	اور آخرت میں اسکا وبال (بدلہ) نہ بھگتنا پڑے۔

ایک مرتبہ اپنے عمال (گورنروں) کو تحریر فرمایا۔

اما بعد فان اللہ امر الائمۃ ان	بعد حمد و صلوٰۃ۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے امام یا امیر کو
یکونوا رعاۃ ولم یتقدم الیھم	یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ قوم کے نگہبان اور چرواہے ہوں
ان یکونوا جباۃ الخ	اور اس نے ان کو اس لئے امیر نہیں بنایا کہ وہ قوم
؎	کو ٹیکسوں کے بوجھ سے دبا دیں

لہ طبقات ابن سعد نہم اول جزو ۳ ص ۱۳۰ و اشہر مشاہیر الاسلام ج ۲ ص ۹۳ ؎ ابن کثیر ج ۷ ص ۲۱۳۔
؎ اشہر مشاہیر الاسلام ج ۳ ص ۴۹۰ ؎ ایضاً ج ۴ ص ۵۱۰۔

اور ابن عبد البرؒ نے استیعاب میں نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن ابی ہذیل کہتے ہیں میں نے حضرت علیؓ کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے بدن پر ایک موٹا کرتا تھا جو پرانا بھی تھا اور ایک روایت میں یہی کہتے ہیں کہ میں نے کوفہ کی مسجد میں حضرت علیؓ کو دیکھا کہ وہ موٹی چادروں میں تقویٰ، صدق گفتاری، حسن معاملت وغیرہ کی تلقین فرماتے پھرتے تھے [۱]

اور ابو نعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بیت المال میں سونا چاندی بہت زیادہ آیا اور بیت المال پُر ہوگیا تب آپ نے اس سب کو مستحقین میں تقسیم کردیا اور جب کچھ نہ رہا تو جھاڑو دلاکر وہاں دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا یہ اس لئے کیا کہ یہ زمین قیامت میں میری شہادت دے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا لوگو! میں نے تمہارے مالِ سے میں سے کچھ بھی نہیں لیا۔ صرف یہ ایک شیشی ضرور لی ہے جو در اصل میرے آزاد شدہ غلام دہقان کے حصہ میں آئی تھی اور اس نے مجھ کو ہدیہ کردی ہے۔ [۲]

"امارت" و "خلافت" کا یہی تصور اور اس کی عملی ذمہ داریوں کا یہی نقشہ ہے جس کی وجہ سے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات عالیہ میں یہ واضح فرمادیا ہے کہ جو شخص اس ذمہ داری کا اہل ہو اور وہ اپنی زندگی کو تج کر پبلک خدمت کے لئے وقف نہ ہوسکے وہ محض "اقتدار" کی خاطر اس کو قبول نہ کرے ورنہ خدا کے سامنے ذلیل و رسوا ہونا پڑیگا۔

عن ابی ذر قلت یا رسول اللہ	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے
الا تستعملنی قال انک ضعیف	ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
وانھا امانۃ وانھا یوم القیمۃ	عرض کیا کہ مجھے آپ عامل دگورنر کیوں نہیں بنادیتے
خزی وندامۃ الا من	فرمایا تم کمزور ہو اور یہ "امانت" ہے اور بلاشبہ یہ قیامت
اخذھا بحقھا وادی	کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث ہوگی مگر یہ کہ کوئی

[۱] حیات ابی طالب ص ۱۱۰ ۔ [۲] ایضاً۔

الذی علیہ فیھا ۔ ١

اسکے حقوق وفرائض کے ساتھ اسکو لے اور ٹھیک ٹھیک ان حقوق وفرائض کو انجام دے ۔

عن عبد الرحمن بن سمرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا عبد الرحمن بن سمرۃ لا تسأل الامارۃ فانک ان اعطیتہا عن غیر مسئلۃ اعنت علیہا وان اعطیتہا عن مسئلۃ وکلت الیہا ۔ ٢

حضرت عبد الرحمن بن سمرۃؓ فرماتے ہیں، مجھ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے عبد الرحمن! تم کبھی "امارت" کی خواہش نہ کرنا اس لئے کہ اگر تم کو بغیر خواہش اور طلب کے امیر بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری مدد اور اعانت کی جائیگی اور اگر تمہارے سوال پر تم کو امارت دی گئی تو اسکا سارا بوجھ تم ہی پر ڈال دیا جائیگا (یعنی خدا کی مدد سے محروم ہو جاؤ گے)

عن ابی ھریرۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیمۃ ۔ ٣

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ وقت قریب ہے کہ بلا شبہ تم امارت (خلافت) پر متمکن ہونیکے لالچی بن جاؤ گے اور یقیناً وہ قیامت کے دن تمہارے لئے ندامت کا باعث ہوگی۔

الغرض اسی مقدس تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ خلفاء راشدین "خلافت" کے حقوق و فرائض کو بدرجۂ اتم انجام دینے کے باوجود بھی یہی محسوس کرتے رہے کہ ہم اس اہم خدمت سے پوری طرح عہدہ برآ نہ ہو سکے اور اس لئے خدا تعالےٰ کے یہاں جوابدہی کے خوف سے لرزہ براندام نظر آیا کئے سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ عبد الرحمن بن عامر کہتے ہیں حضرت عمرؓ فریضۂ خلافت کی اہمیت اور ذمہ داری کو جب زیادہ محسوس فرماتے تو زمین سے مٹی اٹھا لیتے اور فرماتے۔

"اے کاش میں مٹی ہوتا بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا اور میری ماں مجھ کو نہ جنتی۔" ٤

---

١ مسلم کتاب الزکوٰۃ ٢ بخاری ومسلم باب الامارۃ ٣ بخاری ومسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔
٤ کنز العمال ج ٦ باب فضائل الفاروقؓ

اور آخر وقت میں جب لوگوں نے آپ کی خلافت کے زمانہ کے مناقب بیان کر کے ان کو آخرت کے اجر کی بشارتیں سنائیں تو فرمانے لگے۔

ولوددت انی نجوت من هذا الامر کفافاً لالی و لاعلی۔ ؎	اور میں تو یہی محبوب رکھتا ہوں کہ کسی طرح اللہ تعالےٰ کے یہاں اس امر خلافت کے مواخذہ سے برابر سرا بر نجات پا جاؤں، نہ مجھ سے مواخذہ ہو اور نہ انعام ملے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ساری رات مصلےٰ پر بیٹھے روتے رہے صبح کو زوجہ محترمہ نے اس غیر معمولی رنج و غم کا حال دریافت کیا تو فرمایا۔

میرا حال یہ ہے کہ اسود و احمر تمام امت مسلمہ کا میں والی ہوں تو سوچتا ہوں کہ دور دور اقطاع و امصار میں ایسے ناتواں مسافر ہونگے جو قناعت اور تنگ حالی کی وجہ سے برباد ہو رہے ہونگے بہت سے محتاج فقیر، بہت سے مجبور قیدی اور اسی طرح بہت سے کمزور ناتواں ہونگے۔

فعلمت ان اللہ تعالیٰ سائلنی عنھم وان محمداً حجیجی منھم فخفت ان لا یثبت لی عند اللہ عذر ولا یقوم لی مع محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ فخفت علی نفسی الخ۔ ؎	پس مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارہ میں مجھ سے ضرور سوال کریگا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جانب سے ضرور مجھ سے جھگڑینگے سو میں ڈر رہا ہوں کہ اسوقت اللہ کے حضور میں کوئی عذر پیش نہ کر سکوں گا اور نہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کوئی حجت لا سکوں گا تو یہ رنج و غم اسی خوف کیوجہ سے ہے۔

الحاصل یہ ہے "اسلامی حکومت" کا وہ مختصر خاکہ جو خلافت اور نیابت الٰہیہ کے نام سے قائم ہوتی اور جماعت کے نظام اجتماعی کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق و فرائض میں راعی اور رعیت یا امیر اور مامور غرض جماعت کے ہر فرد کو "مساوات عدلی" کی ترازو میں

؎ اشہر مشاہیر الاسلام ج ۳ ص ۴۰۰۔ ؎ کتاب الخراج ص ۱۷۔

وزن کرتی ہے اور اسی ماحول میں ایسے "اقتصادی اور معاشی نظام" کو بروئے کار لاتی ہے "جو صلح ہونیکی بدولت جماعت کے ہر فرد کے خوش حال ہونے اور مطمئن زندگی بسر کرنے میں ہر قسم کی مدد دیتا ہے۔

اور اس کے برعکس اس نظامِ حکومت کو اسلام "ملعون" قرار دیتا ہے جو انسانوں کے درمیان اس لئے بروئے کار لایا جائے کہ اس کے ذریعہ صرف شخص واحد یا کسی پارٹی اور جماعت کی جابرانہ اغراض کو پورا کیا جاتا ہو اور اس کی وجہ سے خدا کی مخلوق کے مابین اخوت و مواسات اور باہمی ہمدردی کے بجائے ظالم و مظلوم کا تعلق قائم ہوتا اور ایک دوسرے کے خلاف معاشی دست برد یا جماعتی رقابت و طبقاتی جنگ کے نمایاں ہونے میں مدد ملتی ہو۔

چنانچہ اسی قسم کے نظامِ حکومت کے متعلق قرآن عزیز نے اس طرح ذکر کیا ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ (القصص)	بلاشبہ فرعون نے (خدا) زمین میں اودھم مچا رکھا ہے اور اسکے (مصر کے) باشندوں میں پھوٹ ڈال کر اس نے پارٹیاں بنادی ہیں، ان میں سے ایک گروہ (یعنی اسرائیل) کو کمزور کرتا رہتا ہے، ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا اور ان کی لڑکیوں کو زیادہ باندیاں بنانے کے لئے زندہ رکھتا ہے بیشک وہ مفسدوں میں سے ہے اور ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ جو زمین (مصر) میں کمزور ہیں ان پر احسان کریں اور انکو قوموں کا پیشوا بنائیں اور (اپنی زمین کا) انکو وارث بنائیں۔

فرعونی اور طاغوتی طریقِ حکومت کا یہی سب سے بڑا نمایاں امتیاز ہے جو حکومتِ ربانی کے مقابلہ میں اپنے اسلحۂ شر و فساد سے مسلح ہو کر سامنے آتا اور وہ بادشاہ، ڈکٹیٹر یا صدرِ جمہوریہ اور یا کسی پارٹی اور جماعت کے جابرانہ اقتدار کی ترقی کے لئے ایسے قوانین بناتا ہے کہ جس سے ظلم و حکومت کے مختلف عناصر میں پھوٹ ڈالی جائے اور کسی کو کمزور اور کسی کو قوی بنا کر جماعتی رقابت

پیدا کیجائے تاکہ اخوتِ عام اور ہمہ گیر مواسات کبھی بروئے کار نہ آسکیں اور خدا کی یہ تمام مخلوق ایک ایک کنبہ اور ایک برادری نہ بن سکے۔ اسی لئے تابعین خلافت ہمیشہ عمالِ خلافت کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ ایسا نہ ہو حکومتِ حقہ (خلافت) حکومتِ طاغوتی کی شکل اختیار کرلے۔

وکتب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ الی ابی موسیٰ: اما بعد فان اسعد الرعاۃ عند اللہ من سعدت بہ رعیتہ وان اشقی الرعاۃ من شقیت بہ رعیتہ وایاک ان تزیغ فتزیغ عمالک۔[1]	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ کو لکھا: بعد حمد وصلوٰۃ یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر والی وہ ہے جس کی رعایا خوشحال اور امن کے ساتھ ہو اور سب سے بدبخت والی وہ ہے جس کی رعایا بدحال اور پریشان بال ہو تجھکو کجی سے بچنا چاہئے تاکہ تیرے کارندے (ماتحت افسر) بھی ظلم و کجی نہ کر سکیں۔

اور اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اس قسم کے ارشاداتِ گرامی سے متذکرہ بالا حقیقت کو واضح فرماتے رہے۔

کلکم بنو آدم وآدم خلق من تراب۔[2]	تم سب انسان اولاد آدمؑ ہو اور آدمؑ کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔
الخلق کلھم عیال اللہ فاحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ۔[3]	تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے پس اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے حق میں مفید ہو۔

بہرحال اسلام نے نظامِ حکومت کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس میں نہ مذموم سرمایہ داری کا گذر ہو سکتا ہے اور نہ طبقاتی جنگ کا امکان ہے۔ اس کا معاشی نظام نہ افراد کے انفرادی حقوق کو سلب کر کے تعطل وجمود پیدا کرتا ہے اور نہ افراد کو جماعتی زندگی سے کاٹ کر بالکل آزاد چھوڑتا ہے اور بلاشبہ اس کا معاشی نظام نفع بازی کی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانوں کی حاجت روائی کی اساس پر قائم ہے۔ اس کی معیشت کا دسترخوان فاتح ومفتوح، آزاد وغلام اسود واحمر

[1] سیرت عمر بن الخطاب ج ۲ [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ حجرات و مجمع الزوائد باب البر والصلۃ [3] جامع صغیر بحوالہ طبرانی

اور مسلم و کافر سب کے لئے وسیع ہے وہ زیردستوں پر ارباب قوت کو مسلّط نہیں ہونے دیتا اور ارباب دولت کو حصولِ دولت میں اس طرح آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ غریبوں کو اپنا آلۂ کار بنالیں وہ سب کو بخشتا ہے اور کسی کو محروم نہیں کرتا اور مزدور کاشتکار ہی نہیں بلکہ ہر زیردست کو بلند کرتا اور جماعت کے ہر فرد کے درمیان اخوتِ عام اور عالمگیر مواسات کا رشتہ قائم کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام نے کیا خوب لکھا ہے۔

"اسلام نے سوسائٹی کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بنجائیں تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائیگا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہونگے نہ مفلس و محتاج طبقے ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائیگی۔" [1]

غرض اس کا معاشی نظام عام خوشحالی اور رفاہیت وطمانیت کا کفیل اور ذمہ دار ہے اور یہی "کفالت" معاشی نظام کی ضرورت کا "حاصل" ہے۔

اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ اسلام کے "معاشی نظام" کی تفاصیل کو نقل کریں اور بتائیں کہ اس نے اس سلسلہ میں جو نقشہ تیار کیا ہے وہ کیا ہے اور گذشتہ اوراق میں اجمالاً جو کچھ کہا گیا تفصیلی احکام اس کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں؟

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲۔

اجتماعی معاشی نظام

اسلام نے "اجتماعی معاشی نظام" کا جو خاکہ پیش کیا ہے اگرچہ اس کا تعلق بہرصورت حکومت (خلافت) کے ساتھ ہے اور خلافت ہی کا اس پر کنٹرول ہے تاہم اپنی تفصیلات کے اعتبار سے اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ حصہ جس کا تعلق براہِ راست "خلافت" کے ساتھ ہے اور دوسرا وہ حصہ جو پبلک اور جماعت کے اعمال کے واسطہ سے "خلافت" سے متعلق ہے۔

جس حصہ کا تعلق براہِ راست خلافت سے ہے اس کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) "بیت المال کا قیام" یعنی ایک ایسے مالی مرکز کا قیام جو حکومت کے معاشی نظام اور نظامِ حکومت کی مالی ضروریات کا کفیل ہو۔ چنانچہ معاشی نظام کے سلسلہ میں اعداد و شمار کا نظم، وظائف، وسائلِ معیشت کی توسیع و احکام اور ہر فرد کے حق معیشت کی کفالت اسی شعبہ سے متعلق ہے۔

(۲) "زمین سے متعلق احکام" یعنی مفتوحہ علاقوں میں "زمین" کو خلافت کی ملک "رکھنے" یا افرادِ امت میں تقسیم کر دینے، نیز زمین کی ملکیتِ انفرادی میں حکومت کی مداخلت و عدم مداخلت کے اختیارات کی تفصیل، چنانچہ زمینداری سسٹم کے متعلق اسلامی رجحانات اور زمیندار و کاشتکار کے حقوق و فرائض کی تقسیم جیسے مسائل اسی شعبہ سے متعلق ہیں۔

(۳) "جملہ شعبہ ہائے مال پر کنٹرول" یعنی انفرادی ملکیت کو صحیح تسلیم کر لینے کے باوجود حکومت "خلافت" کے اختیارات امتیازی کے معاملات۔ چنانچہ انفرادی ملکیت کی تحدید اور مالی شعبوں میں حکومت کی مداخلت و عدم مداخلت کے مسائل اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔

اور جس حصہ کا تعلق جماعت اور پبلک کے واسطہ سے حکومت (خلافت) سے ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) "انفاق کا وجوب" زکوٰۃ صدقات (یعنی ذاتی ملکیت پر ٹیکس) وراثت (یعنی تقسیمِ دولت کا قانون) اور وقف اسی شعبہ سے متعلق ہیں۔

(۲) "اکتناز و احتکار کی حرمت" سود، قمار اور مذموم سرمایہ داری کا انسداد، تجارتی بدعنوانیوں کی بندش اور عقود و اجاراتِ فاسدہ کا انکار، اسی شعبہ کی شاخیں ہیں۔

(۳) "حلال و طیب کسبِ معیشت" یعنی جائز تجارت اور صنعت و حرفت کی ترغیب، جائز وسائل و ذرائع معاشی میں افرادِ امت کے لئے سہولتیں، اور زمین سے متعلق انفرادی ملکیت کی خاص صورتیں، اسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

معاشی نظام کے بیان کردہ ہر دو حصص اور ان کے متعلقات کو ایک سلک میں منسلک کرنے اور مسائل معاشی کو مناسب طریقہ پر بیان کرنے کے لئے اس طرح مرتب فہرست کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

حصہ اول کے شعبے	حصہ دوم کے شعبے
(۱) بیت المال کا قیام	(۱) صدقاتِ نافلہ
(۲) اعداد و شمار کا انتظام	(۲) اوقاف
(۳) وظائف کا تقرر	(۳) ہبہ
(۴) وسائلِ معیشت کی توسیع	(۴) وصیت
(۵) انفرادی ملکیت کی تحدید	(۵) قرض حسنہ
(۶) سرمایہ و محنت میں توازن کے اصول	(۶) عاریت
(۷) زمین سے متعلق خصوصی احکام	(۷) امانت

حصۂ اوّل کے شعبے

بیت المال

سرکاری خزانہ یا مالی مرکز

اسلام کے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کے لئے حکومتِ ربانی (خلافتِ اسلامی) کے لئے خزانۂ سرکاری کا وجود ضروری ہے اور اس خزانہ کے محفوظ مقام کو "بیت المال" کہتے ہیں۔ اور اگرچہ کبھی کبھی بیت المال کا اطلاق وسعت کے ساتھ پورے مالی نظام پر بھی کردیا جاتا ہے۔ تاہم عام اصطلاح کے مطابق مرکزی خزانہ کے محفوظ مقام ہی پر اسکا اطلاق پر بھی ہوتا ہے۔ مرکزی بیت المال کی صوبہ وار اور ضلع وار شاخیں بھی ہوتی ہیں اور انسے مقامی ضروریات کی کفالت مرکز کے احکام کے مطابق انجام پاتی ہے "بیت المال" قلمروِ خلافت کی ان تمام آمدنیوں کا حامل ہوتا ہے جو اسلامی احکام کے مطابق خزانۂ سرکاری میں داخل ہونی چاہئیں اور اسی طرح وہ ان تمام مصارف کا بھی کفیل ہے جو حاجات، وضروریات اجتماعی و انفرادی کے پورا کرنے کے لئے ضروری قرار دیئے جائیں۔ اسی لئے بیت المال "آمدنی" اور اسکے "مصارف" کے اصولوں کو اسلامی نظامِ حکومت میں متعین کردیا گیا ہے البتہ ان کی تفصیلات اور اصول کے ماتحت جزئیات کے انطباق خلیفہ اور اس کی مجلسِ شوریٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اصولی طور پر ان مدات کی فہرست اس طرح دیجا سکتی ہے:۔

مدات آمدنی	مدات صرف
(۱) عُشر	(۱) رفاہِ عامہ
(۲) خراج	(۲) وظائف تعلیمی وفوجی وانفرادی
(۳) جزیہ	(۳) مصارفِ تعمیریہ
(۴) زکوٰۃ	(۴) شعبہ ہائے حکومت کے مصارف

(۵) صدقات

(۶) فیٔ

(۷) خمس

(۸) ضرائب

(۹) (کراء الارض)

(۱۰) عشور

(۱۱) وقف

(۱۲) اموالِ فاضلہ

یعنی مسلمانوں کی مملوکہ آراضی کے ایک بڑے حصّہ کی سالانہ مالگذاری عشر کہلاتی ہے اور ذمیوں کی۔ ۔ ۔ آراضی کی سالانہ مالگذاری کا نام "خراج" ہے۔ اسی طرح سرکاری آراضی کی آمدنی "کراء الارض" (لگان) کے نام سے موسوم ہے اور مسلمانوں کے اموالِ نقود، اموالِ تجارت اور بہائم کے ریوڑ پر عاید شدہ سالانہ مقررہ ٹیکس کو "زکوٰۃ" اور غیر مقررہ کو "صدقات" کہا جاتا ہے اور ذمیوں پر سالانہ مقررہ ٹیکس کو "جزیہ" کہتے ہیں، اور بغیر جنگ کئے حاصل شدہ مال کو "فی" کہا جاتا ہے، اور جنگ کے ذریعہ حاصل شدہ مالِ غنیمت کا مقررہ حصّہ اور معدنیات اور پوشیدہ خزانہ (رکاز) کی مقررہ رقم "خمس" کے عنوان سے معنون ہے اور مستامن حربی یا ذمّی یا مسلمان کے اموالِ تجارت کی درآمد برآمد کے محصول (ڈیوٹی) کو "عشور" کہتے ہیں۔ اور رفاہِ عامہ اور وقتی ضروریات کے لئے عائد شدہ ٹیکسوں کا نام "ضرائب" ہے۔ اور سرکاری معدنیات اور متفرق آمدنی کو "اموال فاضلہ" کہا جاتا ہے۔ اور مذہبی اوقاف کی آمدنی "اموالِ وقف" سے موسوم ہے۔

اور یہ تمام مدات بیت المال کی آمدنی شمار ہوتی اور بیان کردہ انواع مصارف پر خرچ کی جاتی اور اس طرح اسلام کے معاشی نظام کا اہم جزء قرار پاتی ہیں۔ لہٰذا ان مدات

کی مختصر مگر ضروری تفاصیل محتاجِ بیان ہیں تاکہ بیت المال کے آمد و صرف کی تشریح میں مدد مل سکے۔

سوسائٹی کے افراد اور بیت المال

بیت المال سے متعلق مدات کی تشریح سے قبل اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے کہ اسلام کا "نظامِ اجتماعی" سوسائٹی کے جن افراد پر حاوی ہے ان کی تفصیلات کیا ہیں؟ اسلام کی بنیادی تعلیم پر اگر دُور رس نظر ڈالئے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ وہ ایک ایسا مذہب نہیں ہے جو صرف چند روحانی اور اخلاقی عبادات کی تعلیم دے کر - - - - - - - - کسی شخص یا جماعت کو مرتاض اور زاہدِ شب زندہ دار بنا دینا چاہتا ہے نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسے انقلاب کا داعی ہے جو عبادات و اخلاق کی برتری کے ساتھ ساتھ نظامِ اجتماعی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو۔ اور اس لئے اس نے حکومت، سیاست معیشت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئے قسم کا انقلاب برپا کر دیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "مذہب، سوسائٹی اور سماج کے بنائے ہوئے چند قوانین کا نام نہیں ہے کہ وہ حالات اور رجحانات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہیں، بلکہ وہ ایسے چند بنیادی اصول کے مجموعہ کا نام ہے جو خالقِ کائنات کے فرمودہ ہیں اور جن میں تبدیلی کا مطلق امکان نہیں ہے مثلاً خدا کی ہستی اور توحیدِ خالص کا اقرار، رسالت، کتب سماوی، ملائکۃ اللہ، آخرت، حشر و نشر اور جزا و سزا پر اس کے بتائے ہوئے نظریہ کے مطابق ایمان و اعتقاد۔

اسی طرح وہ حکومت کے متعلق یہ اعلان کرتا ہے کہ کائنات انسانی میں کسی انسان یا انسانی جماعت کو براہِ راست یہ منصب حاصل نہیں کہ وہ حاکمیتِ مطلقہ کا دعویٰ کرے خدا تعالےٰ جس طرح خالقِ کائنات ہے اسی طرح حاکمِ علی الاطلاق بھی ہے اور حکومت بشرکتِ غیر صرف اسی کے لئے ہے "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ"۔[۵] البتہ خلیفہ، امیر یا امام، خدا کی زمین

۵ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امیر یا خلیفہ "حاکم" نہیں ہوتا اور اس کا "حکم" حکم نہیں ہے کیونکہ یہ عقیدہ غلط اور خوارج کی پیدا وار ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اساسی اور بنیادی "وضع قوانین" صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں جن میں تغیر ناممکن اور خلیفہ و حاکم ان کی تنفیذ پر مامور ہے اور ان اساسی قوانین کی معرفت کا ذریعہ "قرآن" ہے۔

میں اس کی حکومت کی نیابت انجام دیتا اور خدائے تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب کہلاتا ہے اور اسی لئے وضعِ قوانین کا مسئلہ اس کے اور جمہور کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ صرف خدائے تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ [۱]

البتہ نیابت کے منصب کے پیشِ نظر اس کو اور اہل حل وعقد (مجلس شوریٰ) کو منصوص بنیادی قوانین کے ماتحت حالات وحوادث کو سامنے رکھ کر استنباط و اجتہاد کا حق ہے اس لئے کہ دراصل یہ قانون کی وضع نہیں ہے بلکہ اصول پر جزئیات وواقعات کے انطباق کا

---

[۱] یہ جو کہا گیا ہے کہ وضعِ قانون کا مسئلہ خلافتِ الٰہیہ میں صرف خدائے برتر اور اس کے واسطے سے رسول کے ہاتھ میں ہے اور اللہ اور رسولؐ کے علاوہ کسی شخص کو اس میں دخل نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قوانین مذہب وسیاست ومعیشت کے اساسی اصول کا منبع قرآن عزیز اور احادیث رسول ہیں اور "خلیفہ" کو اس بارہ میں قوتِ تنقید کے علاوہ واضع قانون کی حیثیت کسی طرح حاصل نہیں ہے چہ جائیکہ دوسرے کسی شخص کو۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمانہ کے نت نئے مقتضیات اور تغیر کوائف وحالات کے باوجود خلیفہ یا اربابِ حل وعقد ان کے حل کیلئے کوئی اقدام نہیں کر سکتے ضرور کر سکتے ہیں ورنہ تو "اجتہاد" اور استنباط کا دروازہ مسدود ہوجاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ "اسلام" میں قیاسِ صحیح اور اجتہاد کو بہت اہم جگہ حاصل ہے۔

اور اس کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اصول اور اساسی قوانین میں ادنیٰ سا بھی تغیر نہیں ہوسکتا۔ اور ان ہی قوانین کی روشنی میں ایسی جزئیات وتفصیلات اور ایسے احکام استخراج واستنباط کئے جائیں جو ایک جانب تو ان اساسی اصول کے ماتحت ہوں اور دوسری جانب مقتضیاتِ وقت اور حادثات کا بہترین حل کرتے ہوں۔

چنانچہ اسلامی علوم میں "علم الفقہ" اسی نظریہ کا عملی نشان ہے اور اگر اسلام کے بیان کردہ شرائط کے مطابق "خلیفہ" کا انتخاب ہوا ہے تو اس کو اس کے اہل حل وعقد (مجلس شوریٰ) کو یہ حق "اجتہاد" و "استنباط" ہر وقت حاصل ہے بشرطیکہ وہ اس حکم ربانی کو پیش نظر رکھیں۔

وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (توبہ)	اور اگر تم جھگڑ بیٹھو کسی معاملہ میں تو پھر اسکو رجوع کرو اللہ اور اس کے رسول کی جانب (یعنی قرآن وحدیث کو حَکم بناؤ)

قرآنِ عزیز میں ایسے ہی مواقع کے لئے ارشاد ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (نساء)	اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحب حکم واختیار ہوں ان کی، پس اگر ایسا ہو کہ کسی معاملہ میں باہم جھگڑ پڑو (یعنی اختلاف و نزاع پیدا ہو جائے) تو چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول (قرآن وحدیث) کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اس میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔
وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (نساء)	اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے تو یہ اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں اگر یہ اللہ کے رسول کے سامنے اور ان لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحب حکم و اختیار ہیں پیش کرتے تو جو اصحاب علم و نظر، بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے ہیں۔

اور اسی طرح وہ معاشرت و معیشت کے اساسی اصول بیان کرتا ہے اور اعتقادات، عبادات، معاملات، سیاسیات، عمرانیات اور معاشیات سے متعلق ان مجموعی اساسی اور بنیادی اصول کے نظامِ اجتماعی کا ہی نام "دینِ اسلام" ہے "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ" جو فرد اور جماعت دونوں کی انفرادی اور اجتماعی راہنمائی کا تنہا کفیل ہے اور دنیا کے تمام نظامہائے اجتماعی سے الگ، اپنی شاہراہِ مستقیم اور ایک انقلابِ عظیم کا داعی اور منادی ہے۔

سو جب یہ اپنے نقشہ کے تمام خانوں کو پورا کرتا ہوا دنیا کے سامنے آتا ہے تو بلاشبہ مذہب، حکومت، سیاست، معاشرت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں انسانوں کے بنائے ہوئے

نظاموں سے الگ ایک نظام پیش کرتا ہے اور اگرچہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کا یہ پسندیدہ نظام "اسلام" کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کیلئے کوئی انوکھا اور اجنبی نظام نہیں ہے بلکہ اس کی صداقت کی یہ آواز آدم (علیہ السلام) سے لیکر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک برابر کسی نہ کسی پیغمبر و رسول کے ذریعہ کائنات کو سنائی جاتی رہی ہے۔ اور آج محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچکر تمہارے سامنے موجود ہے"۔ تاہم اسکے قبول و انکار میں دنیائے انسانی دو حصوں پر تقسیم ہو جاتی ہے۔

ایک جماعت اس نظام "اسلام" کے سامنے سرِ تسلیم خم اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سپرد کر دیتی ہے اور اس کے انقیاد و اطاعت میں ہی اپنی فلاح و نجاح یقین کرتی ہے۔ اس جماعت کے افراد کو "اسلام کی اصطلاح میں "مسلم" کہتے ہیں[1]

اور دوسری جماعت اس سے انحراف، اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کر دیتی ہے اور اس جماعت کے افراد "کافر"[2] کہلاتے ہیں۔

پھر اسلام کا اجتماعی نظام جب اپنے اقتدارِ اعلیٰ (حکومت و خلافت) کی شکل میں کائنات کی رہنمائی کے لئے سامنے آتا ہے تو بے تعلقی کے باوجود غیر مسلم جماعت کا تعلق اس نظام کے ساتھ ان دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ضرور قائم ہو جاتا ہے۔

یا یہ گروہ اسلام کے اقتدارِ اعلیٰ (حکومتِ اسلامی) کا مقابل ہو جاتا اور متوازی اقتدار قائم کر لیتا ہے اور یا پھر مذہبی نظام کے علاوہ اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو قبول کرتے ہوئے اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے زیرِ نگین آجاتا ہے اور اسکی سرپرستی کو تسلیم کر لیتا ہے۔

پس ان میں سے جو جماعت "خلافت کے متوازی نظام قائم رکھتی ہے وہ اگر اسلامی اقتدارِ اعلیٰ

---

[1] لفظِ مسلم "سلم" سے ماخوذ ہے جس کے معنی سپردگی اور اطاعت کے بھی ہیں اور صلح و آشتی کے بھی۔

[2] لفظ کافر "کفر" سے ماخوذ ہے جس کے معنی انکار کے ہیں یعنی "منکر" اور چونکہ منکر ہر قسم کے انکار پر کہا جاسکتا ہے اس لئے اسلام کے نظام کے منکر کے لئے "کافر" کی اصطلاح قرار پائی۔

(خلافت) سے ٹکراتی رہتی ہے تو وہ "حربی" کہلاتی ہے اور اس کے دائرہ اقتدار کو "دار الاسلام" کے مقابلہ میں "دار الحرب" کہا جاتا ہے۔

اور ان میں سے جس جماعت نے اپنے متوازی نظام کے باوجود اسلام کے اقتدار اعلیٰ سے مقہور و مغلوب ہو کر کوئی معاہدہ یا صلح کا معاملہ کر لیا ہے تو وہ غیر مسلم ہونیکے باوجود "معاہد" اور "مسالم[1]" کہلاتی ہے۔

اور "دار الحرب" کی ان دونوں جماعتوں کے اگر بعض افراد، تجارت یا اور بعض وقتی ضروریات کے لئے خلیفہ یا اس کے عمّال کی اجازت سے "دار الاسلام" میں آتے اور چند روز قیام کرتے ہیں تو ان کو "مستامن[2]" کہتے ہیں۔

اور جو جماعت اسلام کے اقتدار اعلیٰ سے شکست کھا کر یا کسی دوسرے عوارض کی بنا پر اپنے متوازی نظام کو چھوڑ کر اسلام کے سیاسی و معاشی نظام کو قبول کر لیتی اور اس کے اقتدار اعلیٰ کی سر پرستی منظور کر لیتی ہے وہ "ذمی[3]" کہلاتی ہے۔

منکرین اسلام کی ان جماعتوں کے متعلق قرآن عزیز میں مستقل احکام ہیں جن کا تعلق زیادہ تر "نظام حکومت" کی بحث سے وابستہ ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند امتیازی اصول نقل کر دینا ہی کافی ہیں تاکہ ان جماعتوں کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

کافر جماعت اگر "حربی" ہے اور اسلامی اقتدار کے بقاء و تحفظ کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے یا اس کے ساتھ برسر جنگ ہے تو اسکے خلاف "جہاد" فرض ہے اور اس کے مفسدانہ اقتدار کو شکست و ریخت کر دینا ضروری ہے اس جماعت کیلئے سورۂ توبہ میں یہ حکم ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ	پس مارو (حربی) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ
وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ	اور پکڑو اور گھیرو اور انکی تاک میں ہر جگہ بیٹھو

[1] مسالم، سلم بمعنی صلح سے ماخوذ ہے اور صلح رکھنے والے کو کہتے ہیں [2] مستامن، امن چاہنے والا
[3] مسلمانوں کی ذمہ داری میں آجانے والا۔

كُلَّ مَرْصَدٍ (توبہ)

اور حربی مستامن کے لئے یہ ارشاد ہے :-

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ (توبہ)

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دیدے تاآنکہ سن لیں وہ اللہ کے کلام کو پھر پہنچادو اسکو اس کے امن کی جگہ۔

اور "معاہد و سالم" کے متعلق یہ حکم ہے :-

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (انفال)

اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تو بھی صلح کے لے جھک جا۔ پھر خدا پر بھروسہ رکھ، بلاشبہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (توبہ)

مگر وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور جنھوں نے وفائے عہد میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی۔ انکے ساتھ مدت معاہدہ کے ختم ہونے تک تم اپنے عہد پر قائم رہو۔

اور "ذمی" کے لئے یہ کہا گیا ہے۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ (توبہ)

ان سے برابر لڑتے رہو یہانتک کہ وہ ذلیل ہوکر جزیہ دینے پر آجائیں (یعنی اگر ذمی ہونا قبول کرلیں تو پھر ان پر تلوار نہ اٹھائی جائے)

اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے

لهم ذمة الله وذمة رسوله۔ ؎

ذمی ہوجانے کے بعد وہ (کافر) اللہ اور اسکے رسول کی ذمہ داری میں آگئے۔

اور حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا۔

؎ کتاب الاموال لابی عبید

انما قبلوا عقد الذمة لتكون	انھوں نے ذمی ہونا قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ انکے
اموالھم کاموالنا ودماءھم	مال ہمارے مال کی طرح اور انکی جانیں ہماری جانوں
کدمائنا۔ الخ [1]	کی طرح محفوظ ہو جائیں۔

ان آیات کے علاوہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون و مواساۃ اور عدم تعاون و عدم مواساۃ کے لئے فیصلہ کن سورہ ممتحنہ کی یہ آیت ہے:-

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ	اللہ تمکو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا
یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ	برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے
مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا	میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں
اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝	نکالا اللہ تعالے انصاف کا برتاؤ کرنیوالوں سے محبت رکھتا
اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ	ہے صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تعالے
فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَ	تم کو منع کرتا ہے جو تم میں سے دین کے بارے میں لڑتے
ظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ	ہوں اور تمکو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور تمہارے
وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ	نکالنے میں مدد کی ہو اور جو شخص ایسوں سے دوستی
الظّٰلِمُوْنَ ۝	کریگا سو وہ گنہگار ہونگے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی بیان القرآن میں آیت "لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ" کے تحت میں فرماتے ہیں۔

"کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں موالات یعنی دوستی، مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی مواساۃ یعنی احسان و نفع رسانی۔ ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالات (دلی دوستی) تو کسی حال میں جائز نہیں ۔ ۔ ۔ اور مدارات تین حالتوں سے درست ہے ایک دفع ضرر کے واسطے دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے

[1] برہان شرح مواہب الرحمن ج ۲ ص ۳۸۷ قلمی۔

تیسرے اکرام ضیف کے لئے ... اور مواساۃ (تعاون) کا حکم یہ ہے کہ اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز۔ سورہ ممتحنہ کی آیت لَا یَنْهٰکُمُ اللّٰہُ الی قولہ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ میں اسکی تصریح کی ہے۔[1]

الحاصل۔ اسلام کے معاشی نظام اور اس کے سرکاری خزانہ "بیت المال" کا کسی نہ کسی صورت میں ان جماعتوں کے افراد کے ساتھ گہرا تعلق، اور اس کی آمدنی اور خرچ کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ان کی وابستگی ہے، اسی لئے بیت المال کی مداتِ آمد و صرف کی تشریح سے قبل ان کا تذکرہ ضروری ہوا۔

تشریح مدات دراصل پیشِ نظر مسئلہ مدات آمدنی تشریح تھا اور مسطورہ بالا مبحث اسی تقریب سے ذکر کیا گیا لہٰذا اب اصل مسئلہ قابل توجہ ہے۔

عشر اگر کوئی قوم مسلمان ہو جائے تو ان کی زراعتی زمین، عرب کی زمین، مجاہدین اور غانمین کے حصہ میں آئی ہوئی زمین، وہ افتادہ زمین جو کسی مسلمان نے آباد کی ہو، اور لاوارث ذمی کی موت پر مسلمان کے قبضہ میں آئی ہوئی زمین "عشری زمین" کہلاتی ہے۔ اور "عشر" اس حصۂ مقررہ کا نام ہے جو زکوٰۃ کی طرح زمین کی پیداوار پر واجب ہوتا، اور پیداوار ہی میں سے لیا جاتا ہے۔ پس اگر عشری زمین ندی، تالاب، یا دریا سے سیراب شدہ ہے یا بارانی ہے یعنی صرف بارش کے ذریعہ پیداوار ہوئی ہے تو اس زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے اور اگر چاہی ہے یعنی کنوئیں کھود کر پانی دیا گیا ہے تو اسکی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جاتا ہے۔[2]

"عشر" کے وجوب کے لئے قرآن عزیز میں نص صریح وارد ہے "وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ" اور تم ادا کرو (پیداوار) زمین کا حق اس کے کٹ جانے کے وقت اور حدیث صحیح میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔[3]

---

[1] بیان القرآن ج ۲ ص ۱۱ و ۱۲ یعنی جو مسلمانوں سے جنگ کریں ان سے تعاون منع ہے اور جو ایسا نہ کریں انکے ساتھ تعاون درست ہے [2] کتاب الخراج ص ۱۰۵ شامی ج ۲ ص ۶۷، ۶۶ ج ۳ ص ۳۵ [3] شامی ج ۲ ص ۶۶۔

عن عبد اللّٰہ عن النبی صلے اللّٰہ علیہ وسلم انہ قال فیما سقت السماء والعیون لوکان عشریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر ۔[1]	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس زمین کی آبپاشی، بارش، چشموں، یا ندیوں سے ہو، اس کی پیداوار کا دسواں حصہ لیا جائے گا اور جس کی پانی کھینچ کر یعنی کنوئیں کھود کر، آبپاشی کی گئی ہو، اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائیگا۔

حدیث میں بیان کردہ فرق کی بنیاد یہ ہے کہ اگر زمین کی آبپاشی میں ضروری محنت و اجرت کے صرف کے علاوہ زائد محنت و اُجرت کا دخل نہیں ہے تو اس پیداوار پر اجتماعی ٹیکس زیادہ عائد ہونا چاہیئے اور اگر زمین میں ضروری محنت اور بیج کے خرچ کے علاوہ آبپاشی میں بھی زائد محنت کرنی پڑے جیسا کہ مثلاً کنویں کھود کر پانی دینا، نہر کے پانی پر ٹیکس ادا کر کے پانی دینا یا ٹیوب ویل پر محصول ادا کر کے آبپاشی کرنا تو ان صورتوں میں اجتماعی ٹیکس کی مقدار نصف رہ جاتی ہے اور دسویں حصہ پیداوار کی بجائے اس کو بیسواں حصہ دینا پڑیگا۔[2]

خراج | اور جن ممالک پر اسلام کا غلبہ ہو گیا اور خلیفہ نے وہاں کی زمینیں مفتوحین ہی کے قبضہ میں باقی رہنے دیں اور جن غیر مسلموں سے صلح ہو گئی اور وہ حکومتِ اسلامی کے ذمہ اور عہد میں داخل ہو کر ذمی بن گئے، ان کی زمین "خراجی" کہلاتی ہیں اور "خلیفہ" ان زمینوں پر جو محصول (مالگذاری) مقرر کرتا ہے اس کو "خراج" کہا جاتا ہے۔[3]

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ "خراج" دراصل "فیٔ" کی ہی ایک قسم[4] ہے۔ کیونکہ اگر معمولی جنگ کے بعد کفار مغلوب ہو کر صلح کر لیں تو وہ مال بھی "فیٔ" میں ہی شمار ہوتا ہے تو گویا جب غلبہ

---

[1] بخاری باب الزکوٰۃ [2] جیسا کہ عنقریب ذکر آئیگا۔ اسلامی نظام معاشی میں نہروں کے پانی پر موجودہ طریقے کے مطابق محصول نہیں لیا جاتا۔ اس لئے عام کتب فقہ میں نہری زمین پر بھی دسواں حصہ عشر بیان کیا گیا ہے لیکن آج کے زمانے میں نہری اور چاہی زمینوں کا ایک ہی حکم ہے۔ بس ابوداؤد کی روایت میں جو فی السماء والعیون والانہار آیا ہے اس نہر سے ندیاں نالے مراد ہیں اور یا ایسی نہریں جن کے پانی پر محصول نہیں ہے۔

[3] کتاب الخراج ص ۶۹ و شامی ج ۳ ص ۵۲ و کتاب الاموال ص ۶۸ [4] کتاب الخراج ص ۲۳۔

غلبہ اسلام کے بعد خلیفہ نے صلح کے ساتھ کفار کی زمینوں کو غانمین میں تقسیم کرنے کی بجائے ان پر لگان (ٹیکس) مقرر کر کے ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا تو یہ ٹیکس بھی "فی" ہی شمار ہوگا پس اس صورت میں "خراج" کا وجود بھی قرآن عزیز کی اس نص کے تحت میں آجاتا ہے۔

مَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ	جو مال لوٹا دیا اللہ تعالٰی نے اپنے رسول پر بستیوں
الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى	والوں (کفار) سے سو وہ اللہ کے لئے اور رسول کے
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	اور قرابت والوں کے لئے اور یتیموں، محتاجوں اور
السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ	مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ تم میں سے دولتمندوں
الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔ (حشر)	کے درمیان ہی دائر اور محصور نہ رہے۔

جزیہ | اہل کتاب اور مشرکین عجم[1] اگر مغلوب و مقہور ہو کر اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیں اور سالانہ تھوڑا سا ٹیکس ادا کر کے اس شرط پر اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آجائیں کہ حکومت ان کے جان و مال اور آبرو کی محافظ ہے تو ایسے ٹیکس کو "جزیہ" کہتے ہیں۔

قرآن عزیز میں "جزیہ" کے متعلق یہ قانونی دفعہ بیان کی گئی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ	"ان لوگوں سے جنگ کرو جو ایمان نہیں لاتے اللہ
لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا	پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو
حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ	جس کو حرام کیا اللہ نے اور اسکے رسول نے اور نہ قبول
دِيْنَ الْحَقِّ	کرتے ہیں دین حق کو"
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا	"ان لوگوں میں سے اہل کتاب ہیں۔ یہاں تک
الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ)	کہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر"

زکوٰۃ | ساڑھے باون تولہ چاندی، ساڑھے سات تولہ سونا، مال تجارت اور مکانوں کے تجارتی

[1] مشرکین عرب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں مشرف باسلام ہو گئے تھے یا اسلامی جہاد کے مقابلہ میں مارے جا چکے تھے اور بعد ازاں جزیرۃ العرب میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب کو روا نہیں رکھا گیا۔

کاروبار پر اگر ایک سال پورا گزر جائے تو اس مال میں سے چالیسواں حصہ نکال کر خدا کی راہ میں دینا "زکوٰۃ" کہلاتا ہے۔ خدائے تعالےٰ کی جانب سے مسلمانوں پر یہ "ٹیکس" بہت اہم فریضہ ہے اور ارکانِ اسلام میں سے اہم رکن، چنانچہ قرآن عزیز میں ادائے زکوٰۃ اور فرضیتِ زکوٰۃ کے احکام کو بار بار دہرایا گیا ہے، کہیں ایمان باللہ کے ساتھ اس کا ذکر ہے کہیں آخرت کے ذکر کے ساتھ، اور کہیں مستقل اسی کو قانونی دفعہ بنایا گیا ہے:۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ه (اعراف)	اور میری رحمت ہر شے پر حاوی ہے تو میں (اسکو) ان لوگوں کے لئے لکھ دونگا جو خدا سے ڈرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔
وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ (بقرہ)	اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔
وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ (حم سجدہ)	اور خرابی ہے مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے (بھی) منکر ہیں۔
وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ه (الروم)	اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنیکے لئے دیتے ہو تو ایسے ہی لوگ اپنے مال کو (آخرت میں) دوگنا کرنے والے ہیں۔

اگرچہ پایوں کے ریوڑ چراگاہوں میں چر رہے ہوں تو ان چوپایوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور اسلامی شریعت نے ان کا نصاب جدا جدا مقرر کیا ہے جس کی تفصیل بخاری کتاب الزکوٰۃ کے اس مکتوب گرامی میں درج ہے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت انسؓ عامل بحرین کے نام تحریر فرمایا ہے۔

یعنی ریوڑ کی زکوٰۃ میں اونٹوں کے ریوڑ میں پانچ سے کم پر نہیں ہے اور گائے بھینس کے ریوڑ میں تیس سے کم پر اور بھیڑ بکری کے گلہ میں چالیس سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کو انفرادی طور پر صرف نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا بیت المال میں داخل کرنا ضروری ہے، صدیق اکبرؓ کا فیصلہ اس بارے میں ناطق ہے۔[۱]

صدقات "زکوٰۃ" کے علاوہ بھی کچھ اجتماعی حقوق ہیں۔ اسلام جن کے ادا کرنے اور اس سلسلہ میں مالی امداد دینے کی ترغیب دیتا اور بعض حالات میں ان کو واجب قرار دیتا اور بعض حالات میں مستحسن اور مستحب بتلاتا ہے۔ سو اس قسم کی مالی امداد کا نام "صدقہ" ہے اور اپنی مختلف انواع کے اعتبار سے وہ "صدقات" کہلاتے ہیں۔ قرآنِ عزیز میں جگہ جگہ صدقات کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو اسلام کی نمایاں علامت بتایا گیا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۱۹۱/۲ (بقرہ)	اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی بخل اختیار کر کے انفاق فی سبیل اللہ سے ہاتھ کھینچ کر اور مال و زر کی محبت میں جہاد فی سبیل اللہ کو ترک نہ کرو)
وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۱۹/۵۱ (الذٰریٰت)	اور ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور تنگدستوں کا حق ہے۔
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۳۸/۳۰ (روم)	پس تو رشتہ دار کو اس کا حق دے اور محتاج اور مسافر کو۔
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ ۲۵۴/۲ (بقرہ)	مسلمانو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو۔
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ ۲۶۷/۲ (بقرہ)	مسلمانو! ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں خرچ کرو۔

[۱] بخاری کتاب الزکوٰۃ روپیہ، پیسہ، چاندی، سونا جیسی اشیا، اموال باطنہ کہلاتی ہیں اور چوپائے اور اموالِ تجارت اموال ظاہرہ کہلاتے ہیں۔ فقہاء کے درمیان اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کے بیت المال میں ضروری داخل کیے جانے سے متعلق جدا جدا اقوال منقول ہیں جن کے لئے کتبِ فقہ کی جانب مراجعت ضروری ہے ۱۲

"صدقات" کے ادا، کی دو شکلیں ہیں۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ انفرادی یہ کہ خیرات کرنیوالا خود اپنے ہاتھ سے صدقہ کرے اور اجتماعی یہ کہ "مالِ صدقہ" کو خلیفہ یا نائب خلیفہ کے سپرد کر دے اور وہ بیت المال میں داخل کر کے مستحقین پر صرف کرے۔ نفلی صدقات کی ادا، تو انفرادی بھی درست ہے۔ مگر صدقات واجبہ "بیت المال" کا حق ہے۔

فیٔ اگر مسلمان کے لشکر سے کفار مغلوب و مرعوب ہو کر بغیر جنگ کئے مال چھوڑ بھاگیں، یا جنگ کے بعد ان کی زمینوں کو مقررہ ٹیکس پر ان ہی کی مقبوضہ رہنے دیا جائے یا ان پر خراج اور جزیہ مقرر کیا جائے تو ان سب صورتوں میں اس حاصل شدہ مال کو "فیٔ" کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے خراج اور جزیہ بھی "فیٔ" کی اقسام بنجاتے ہیں۔ قرآنِ عزیز کی گذشتہ آیات میں "فیٔ" کا مال "بیت المال" کا حق بتایا گیا ہے اور اس کو غانمین اور مجاہدین کے درمیان نہیں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ بغیر جنگ کئے حاصل ہوا ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ	اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول کے ہاتھ لگوایا
اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ	تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ لیکن
وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ	اللہ جس پر چاہتا ہے اپنے رسولوں کو غالب کر دیتا
يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (حشر)	ہے اور اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔

خمس مالِ غنیمت کی تقسیم اور "رکاز" دفینہ اور کانوں سے نکلے ہوئے سونے چاندی وغیرہ سے نفع حاصل کرنے سے پہلے ان میں سے پانچواں حصہ نکالنا ضروری ہے اور یہ حکومت کے بیت المال (سرکاری خزانہ) کا حق ہے اس کو "خمس" کہتے ہیں:۔

قرآنِ عزیز میں غنیمت کے ذکر میں اس حق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ	اور معلوم رہے کہ تم کسی چیز سے جتنی جو کچھ مالِ غنیمت
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى	لے سو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کے واسطے
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	ہے اور رسول کیواسطے اور اس کے قرابت والوں کے

السَّبِيلِ۔ (انفال) واسطے اور یتیموں اور محتاجوں کے واسطے۔

اور بخاری کتاب الزکوٰۃ اور بعض دوسری کتبِ حدیث کی ایک صحیح روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ "رکاز" میں بھی خمس ہے۔

وفی الرکاز الخمس — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "رکاز میں خمس واجب ہے۔

اہل عرب کے یہاں لغوی معنی کے اعتبار سے "رکاز" کا اطلاق دفینہ پر ہوتا ہے لیکن امام ابو یوسفؒ نے ایک روایت میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے "رکاز" کی تفسیر یہ بھی فرمائی ہے۔

فقیل لہ ما الرکاز یا رسول اللہ؟ — نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا
فقال الذھب والفضۃ الذی — کہ یا رسول اللہ "رکاز" کیا شی ہے؟ آپ نے فرمایا وہ
خلقہ اللہ فی الارض یوم — سونا اور چاندی جو اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر زمین
خلقت۔ ۱ — کے اندر ودیعت کر دیا ہے (یعنی کانیں)

ضرائب زمانۂ جنگ، قحط سالی، رفاہِ عام، اور عوام کی بے روزگاری، دور کرنے کے لئے زکوٰۃ اور "صدقات" کے علاوہ جو ٹیکس (مالی امداد) اغنیا، اور اہلِ ثروت پر حکومت کی جانب سے عائد کئے جاتے ہیں ان کا نام "ضرائب" ہے ٹیکسوں کا وہ مفہوم جو زمانہ موجودہ کے طریقۂ حکومت میں رائج ہے۔ اسلامی نظام حکومت میں ناپید ہے اس لئے کہ آجکل جو ٹیکس پبلک پر لگائے جاتے ہیں وہ عموماً عدل و انصاف کے خلاف اور حکومت اور ارکان حکومت کے ان مفادات کی خاطر لگائے جاتے ہیں جن کا پبلک مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلام کے دستوری نظام میں خراج، جزیہ، عشور، عشر، زکوٰۃ، فیٔ، خمس، وقف اور اسی قسم کے محاصل اسی غرض سے مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ پبلک کی، انفرادی اور اجتماعی ضروریات کے کام آئیں اس لئے وہ عام طور پر مزید ٹیکس عائد کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ البتہ اگر بیت المال کے یہ مسطورہ بالا محاصل ان ضروریات کو کافی نہوں یا ہنگامی اہم اجتماعی ضروریات ان محاصل سے

---

۱ کتاب الخراج ص ۲۳۔

فاضل آمدنی کے بغیر پوری نہ ہو سکیں تو عدل و انصاف کے ساتھ ہنگامی محاصل (Emerjency tax) اغنیاء اور اہل ثروت پر عائد کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ نے محلّی میں فقراء کی اعانت پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ اگر بیت المال کا خزانہ اور مال فی فقراء اور اہل ضرورت کی معاشی ضروریات کو پورا نہ کر سکیں تو "خلیفہ" اہل ثروت پر مزید ٹیکس عائد کر کے انکی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اور اگر اہل دول اس کے مانع ہوں تو بہ جبر ان سے وصول کر سکتا ہے۔ "ویجبرھم السلطان علی ذلک"[1] وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اپنی عمومیت کے ساتھ اس "ٹیکس" کی دلیل بن سکتی ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ[2]	اور قرابت والوں اور مسکین اور مسافر کے جو تم پر واجب ہیں وہ ادا کرو۔

اور حسب ذیل آثار اس کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

عن علی بن ابی طالب یقول: ان اللہ تعالی فرض علی الاغنیاء فی اموالھم بقدر ما یکفی فقراءھم فان جاعوا او عروا وجھدوا فیمنع الاغنیاء[3] وعن ابن عمرؓ انہ قال: فی مالک حق سوی الزکاۃ[4]	حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بلاشبہ اللہ تعالی نے دولتمندوں کے مال میں اسقدر حق فرض کر دیا ہے جس قدر کہ ان کے فقراء کو کفایت کر سکے پس اگر فقراء بھوکے ہیں ننگے ہیں اور خستہ حال ہیں تو اسکا سبب یہی ہوتا ہے کہ اغنیاء اس فرض کی ادائیں کوتاہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی دیگر حقوق ہیں۔

پس جس طرح غربا کی ضرورت پورا کرنے کے لئے خصوصی ٹیکس عائد ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جہاد اور دوسری ضروریات کے لئے بھی عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ یرموک میں اسی قسم کی اعانت کی ترغیب دی تھی جس پر پرجوش طریقے سے لبیک کہا گیا

---

[1] و [2] محلّی ج ۶ ص ۱۵۶۔ [3] و [4] محلّی ج ۶ ص ۱۵۸۔

کراء الارض امام یا خلیفہ (حکومت) کی جن زمینوں کو سالانہ اجرت (لگان) مقرر کر کے کاشت سرکاری کے لئے دیدیتا ہے ان سے وصول شدہ محاصل کا نام (کراء الارض) ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ایسی سرکاری زمینوں کو جن سے نہ عشر لیا جاتا ہے اور نہ خراج بلکہ ان کو اجرت پر کاشت کے لئے دیا جاتا ہے "ارض المملکۃ" یا "ارض المخورہ" کہتے ہیں اور یہ زمین یا وہ ہوتی ہے جو لاوارث ہو کر بیت المال کی جانب منتقل ہو جائے اور یا لشکر کشی سے فتح ہونے کے بعد وقف للمسلمین بن کر اجیروں کو اجرتِ مقررہ پر دیدی جائے۔[1]

"کراء الارض" کا یہ معاملہ ان ہی آیات و احادیث کے تحت میں آتا ہے جو عشر و خراج کی بحث میں ذکر کی جا چکی ہیں۔

عشور ایران اور روم کی سلطنتوں کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی مسلمان تاجر ان کی سرحد میں مال تجارت لیکر داخل ہوتا تو وہ اس سے مقرر محصول (کسٹم ڈیوٹی) لیا کرتے تھے اور اگر وہ سال میں متعدد مرتبہ آمد و رفت رکھتا تو ہر دفعہ اسی قدر محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جب غیر مسلم اسباب تجارت لیکر اسلامی ممالک میں آتے تو وہ اس قسم کے محصول سے بری رہتے۔ اس طرح گویا مسلمانوں کو تجارتی خسارہ تھا اور غیر مسلم اس خسارہ سے محفوظ تھے۔ چنانچہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ آپ نے مفصل روئداد سن کر صوبوں کے عاملوں (گورنروں) کو تحریر فرمایا کہ تم بھی اموالِ تجارت پر اسی قسم کا ٹیکس لیا کرو، اور نہ صرف غیر مسلموں سے بلکہ جو مسلمان یا ذمی بھی دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان تجارتی کاروبار کو جاری رکھے ہیں ان سے بھی یہ محصول لیا جائے۔ مگر جس شخص سے ایک مرتبہ وصول کر لیا جائے، اندرونِ سال وہ کتنی ہی مرتبہ آمد و رفت کا سلسلہ کیوں نہ جاری رکھے دوبارہ اس سے نہ لیا جائے۔ نیز مسلمان، ذمی، اور کافر حربی کے درمیان محصول کی مقدار میں تفاوت رہے۔ نیز یہ مال دو سو درہم[2] یا بیس مثقال[3] کی قیمت سے کم ہو ورنہ تو محصول سے معاف رہیگا۔

پس اس طریقہ سے حاصل شدہ محصول کا نام "عشور" ہے۔ اور یہ محصول مسلمان کے

---

[1] شامی ج ۳ ص ۳۵۲ باب العشر والخراج والجزیہ [2] ایک درہم ۳ آنہ کا ہوتا ہے [3] بیس مثقال بشکل سکہ ۷۱/۲ تولہ سونا ہوتا ہے۔

مالِ تجارت میں سے چالیسواں اور ذمی کے اسبابِ تجارت سے بیسواں اور حربی کے مال تجارت سے دسواں حصہ لیا جاتا ہے[1]

وقف جو اشیاء منقولہ یا غیر منقولہ ذاتی ملکیت سے نکال کر فی سبیل اللہ دیجائیں وہ اسلامی اصطلاح میں "وقف" کہلاتی ہیں اور اوقاف کی وہ تمام آمدنی جو فی سبیل اللہ دی گئی ہے بیت المال کا حق منصور ہوتی ہے۔

اسلام میں جائداد غیر منقولہ کے پہلے "واقف" حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ کتبِ تفاسیر میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئیں "مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے" لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک اس شے میں سے خرچ نہ کرو جسکو تم محبوب رکھتے ہو" تو حضرت طلحہؓ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرا فلاں باغ جو مجھے بہت پیارا ہے وہ خدا کے لئے دیتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا اجعلہ فی فقراء قومک تم اسکو اپنی قوم کے محتاجوں کے لئے (وقف) کردو[2]

اموالِ فاضلہ مسطورہ بالا آمدنی کے طریقوں کے علاوہ جو بھی متفرق آمدنیاں بیت المال کی مِلک قرار دی جائیں ان سب کو "اموال فاضلہ" کہا جاتا ہے مثلاً اگر کسی مسلمان یا ذمی کا انتقال ہوجائے اور وہ لاوارث ہو تو اس کا مال "بیت المال" کا حق ہے اسی طرح اگر کوئی ذمی بغاوت کرکے یا کوئی مسلمان العیاذ باللہ "مرتد ہوکر دار الحرب کو فرار ہوجائے تو انکا تمام مال ضبط ہوکر "بیت المال کی ملکیت" ہوجاتا ہے۔[3]

مصارف بیت المال قرآن عزیز کی ان تفصیلات کے پیش نظر جو اہلِ مصارف کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں، اسلامی فقہ میں تصریح ہے کہ بیت المال کے متحصل کو چار مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے "چار بیوت اموال" قائم کرنے چاہئیں مگر یہ چاروں مرکزی بیت المال کے

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۳۲ و کتاب الاموال ص ۵۳۴ ۵۳۳ [2] حاشیہ بخاری و کتاب الاموال ص ۵۶۱ [3] بدائع الصنائع ج ۲، کتاب السیر ص ۱۳۰

تحت میں رہیں گے۔ چنانچہ چہارگانہ شعبوں کی تفصیل اس طرح مذکور ہے۔

(پہلا شعبہ) مال غنیمت، کنز اور رکاز کے "خمس" اور "صدقات" سے تعلق رکھتا ہے اور

(دوسرا شعبہ) زکوٰۃ، عشر اور مسلمان تاجروں سے وصول شدہ عشور ہے۔ اور

(تیسرا شعبہ) خراج، جزیہ، غیر مسلم تجار سے وصول کردہ عشور، فی، کراء الارض اور ضرائب، اور

(چوتھا شعبہ) اموالِ فاضلہ (ضوائع[1]) سے متعلق ہے۔

اوران محاصل کے مصارف کی تفصیل یہ ہے۔

پہلے اور دوسرے شعبہ کے مصارف "مصارفِ ثمانیہ" ہیں جن کو قرآن عزیز کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ	اور معلوم رہے کہ جو کچھ تمکو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی	کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے
الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ	واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں
السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ	اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے، اگر تمکو یقین ہے
اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ	اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندہ پر فیصلہ
یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ	(جنگ بدر) کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں
شَیْءٍ قَدِیْرٌ (انفال)	اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِیْنِ	زکوٰۃ و صدقات حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں
وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ	کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانیوالوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور
وَفِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَ	ہو اور گردنوں کے چھڑانے کے لئے (یعنی قیدیوں اور غلاموں
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ	کی رستگاری کے لئے) اور لنکے لئے جو تاوان کے بوجھ سے
فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ	دبے ہوئے ہیں (یعنی قرضدار اور ضامن) اور اللہ کے راستہ میں

[1] مثلاً لاوارث مال، لقطہ، بلاوارث کا ترکہ اور لاوارث مقتول کی دیت۔ شامی ج ۳ ص ۲۸۹۔

حکیم ۵ (توبہ) | جان سے لڑنیوالوں کے لئے اور مسافروں کیلئے یہ مقرر ہو خدا کی جانب سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

پہلی آیت میں "اللہ" کا نام برکت کے طور پر مذکور ہے اور بعض علماء کے نزدیک اس سے کعبۃ اللہ اور مساجد اللہ کے مصارف مراد ہیں، اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا اور آپ کے اہل قرابت (بنی ہاشم و بنی عبدالمطلب) کے حصہ کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور یتامیٰ اگر بذاتِ خود اغنیاء میں سے ہیں تو وہ بھی اس سلسلہ میں داخل نہیں ہیں ورنہ پھر فقرا اور مساکین میں شامل ہیں لہذا دونوں آیات کا مصرفِ "مصارفِ ثمانیہ" متعین ہیں جس کا مکمل بیان دوسری آیت میں مفصل ہے۔ یعنی فقرا، مساکین، عاملین، مؤلفۃ القلوب، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن سبیل۔

یہ حنفی مذہب (اسکول) کی تصریحات ہیں، امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کی تصریحات بھی اسی کے قریب قریب ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ "سبیل اللہ" کا مصرف حنفی اسکول میں صرف مجاہدین کے اندر محدود ہے اور دوسرے ائمہ کے نزدیک تمام مصارفِ خیر کے لئے عام ہے۔

تیسرے شعبہ کے مصارف، ہر قسم کے وظائف اور شعبہ ہائے حکومت کے نظم و انتظام کے اخراجات ہیں اور چوتھے شعبہ کے مصارف، رفاہِ عامہ (پبلک ورکس) لاوارث بچوں کی پرورش اور دیگر امورِ خیر ہیں۔[1]

فقہا نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ امام (خلیفہ) مصالحِ خلافت کے پیش نظر بوقت ضرورت ایک شعبہ سے دوسرے شعبہ کے لئے قرض لے سکتا ہے اور جب تک اس دوسرے شعبہ میں وافر آمدنی نہو۔ دوسرے شعبوں سے اس شعبہ کی ضروری کفالت کرسکتا ہے۔ درمختار میں ہے۔

وعلی الامام ان یجعل لکل نوع بیتا یخصہ ولہ ان | اور امام کے لئے ضروری ہے کہ ہر نوع کے لئے جدا بیت المال کا شعبہ مخصوص کرے اور اس کے لئے یہ

[1] ردالمختار ص ۷۹ دو، ج ۲ و ص ۳۸۹ د ۳۸۸۔

یستقرض من احدھا	یہ درست ہے کہ ایک شعبہ سے قرض لیکر دوسرے
لیصرفہ للاخر۔ الحسنہ	شعبہ پر خرچ کردے۔

اس کے علاوہ کتب فقہ میں مختاراتِ امام کے مباحث میں بھی امام کی اس صواب دید سے متعلق کثرت سے جزئیات ملتی ہیں۔

فقہ اسلامی میں یہ بھی تصریح ہے کہ صدقاتِ واجبہ (مثلاً زکوٰۃ وعشر) کے علاوہ بیت المال کے محاصل کا تعلق جس طرح قلمروِ اسلامی کے مسلمانوں کی ضروریات وحاجات سے وابستہ ہے، اُسی طرح غیر مسلم (ذمی) کی حاجات وضروریات سے بھی متعلق ہے چنانچہ فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) نے فقراء اور مساکین میں غیر مسلموں (ذمیوں) کو بھی شامل کیا ہے امام ابو یوسف نے قانون فقہ میں اس قول کو سند ٹھیرایا ہے۔ ؎

علاوہ ازیں جبکہ امام (خلیفہ) کے ذمہ یہ واجب قرار دیا گیا ہے کہ اسلامی قلمرو میں ایک شخص بھی محروم المعیشت نہ رہے تو پھر ان مباحث سے اصل مسئلہ (اعانتِ محتاجین) پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ بہر حال امام کا فریضہ ہے۔

الحاصل، ائمہ مجتہدین کے ان جزوی اختلافات کے باوجود اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جن مصارف کے متعلق قرآن: اور حدیث کی نص وارد ہو چکی ہے وہ اسی طرح بحال رکھتے ہوئے باقی امور میں محاصل ومصارف کا معاملہ "خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ" کی صوابدید پر ہے چنانچہ قاضی ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں فئی اور خراج پر بحث کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ پر جس کا تعلق عراق کی زمینوں کو وقف للمسلمین اور حکومت کی ملک کر دینے سے ہے۔" جو ارشاد فرمایا ہے وہ اس مسئلہ کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

؎ رد المحتار ج ۲ ص ۳۰۹ وکتاب الخراج ص ۰۰۰ ۵۲ اور امام اعظمؒ اور امام محمدؒ نے تو تصریح کی ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ تمام صدقاتِ واجبہ ونافلہ مثلاً نذر وفطرہ وغیرہ ذمی فقراء کو دیئے جا سکتے ہیں اور حربی مستامن کی مدد بھی صدقاتِ نافلہ سے کیجا سکتی ہے۔ شامی باب المصرف ج ۲ ص ۹۲ وکتاب الخراج ص ۱۲۶۔

قال ابو یوسف: والذی رأی عمرؓ من الامتناع من قسمۃ الارضین بین من افتتحھا عند ما عرفہ اللہ ما کان فی کتابہ من بیان ذلک توفیقاً من اللہ کان لہ فیما صنع وفیہ کانت الخیرۃ لجمیع المسلمین وفیما راٰہ من جمع خراج ذلک وقسمتہ بین المسلمین عموم النفع لجماعتہم لان ھذا لو لم یکن موقوفاً علی الناس فی الاعطیات والارزاق لم تشحن الثغور ولم تقو الجیوش علی السیر فی الجہاد ولما أمن رجوع اھل الکفر الی مدنھم اذا خلت من المقاتلۃ والمرتزقۃ واللہ اعلم بالخیر حیث کان

(ص ۲۷)

ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ "کہ مفتوحہ اراضی کو مجاہدین میں تقسیم نہ کیا جائے" ایسی صورت میں جبکہ کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی مذکور نہیں تھا ایک بہترین فیصلہ ہے جس کی جانب خدا تعالیٰ نے ان کی رہنمائی کی اور انھوں نے یہ جو کچھ کیا (اس لئے کہ) اسی میں تمام مسلمانوں کی فلاح وبہبود مضمر تھی اور زمین کا خراج جمع کرکے عام مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچانا اجتماعی اعتبار سے بہت ہی بہتر طریق ہے کیونکہ اگر یہ اراضی مجاہدین میں تقسیم ہو جاتیں اور عام مسلمانوں کے عطایا اور وظائف کیلئے وقف نہ ہو جاتیں، تو پھر نہ اسلامی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی اور نہ جہاد کے لئے مضبوط لشکر فراہم ہو سکتا اور جب جہاد اور وظائف کا دروازہ بند ہو جاتا تو مسلمانوں کے ملک کافروں کی چڑھائی سے ہرگز مامون نہ رہتا اور اللہ ہر حیثیت سے زیادہ بہتر جاننے والا ہے۔"

اور شرح شرعۃ الاسلام میں سید علی زادہ حنفی نے فرائض امیر پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:-

ولا یدع فقیراً فی ولایتہ الا اعطاہ ولا مدیوناً الا قضی عنہ دینہ ولا ضعیفاً الا اعانہ ولا مظلوماً الا نصرہ ولا ظالماً

اور امام اپنی ولایت (مملکت) کے اندر کسی فقیر کو فقیر نہ رہنے دے اور نہ کسی قرضدار کو قرضدار باقی رکھے اور نہ کسی کمزور کو بے مددگار رہنے دے اور نہ کسی مظلوم کو دادرسی سے محروم کرے اور

الا منع عن الظلم ولا عاریا	نہ کسی ظالم کو ظلم کرنے دے اور ہر ننگے کو لباس
الا کساہ کسوۃً الخ۔	مہیا کرے۔

اور امام کو جبکہ یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ ایک شعبہ کے محاصل اس کے مصارف کو اگر کفایت نہ کریں تو وہ دوسرے شعبہ سے قرض لے سکتا ہے تو پھر فئی، خراج، جزیہ، کراء الارض، خمس، ضرائب، عشور غیر مسلم، اور اموالِ فاضلہ میں مدات کا یہ تفاوت معاشی نصب العین اور مقصد و منہاج پر اثر انداز نہیں ہوتا اور تکمیلِ مقصد کے لئے ان مدات کے مصارف میں "اولی الامر" کو حقِ مداخلت حاصل ہے۔

الحاصل بیت المال کے محاصل کو اہلِ مصرف پر خرچ کرنے کے لحاظ سے "اولی الامر" کے اختیارات اس طرح منقسم ہیں کہ زکوٰۃ اور عشر جیسے محاصل کے لئے وہ صرف محافظ ہے اور منصوص اہلِ مصرف پر ہی خرچ کر سکتا ہے اور فئی و خراج جیسے محاصل میں وہ اپنی رائے اور مجلسِ شوریٰ کے مشورہ سے مصالحِ خلافت اور مستحقین کی ضرورت کے پیشِ نظر خرچ کر سکتا ہے۔
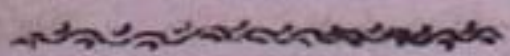
اعداد و شمار اور اُن کی اہمیت

سطحی نظر میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی۔ اور نہ یہ "اسلام کے معاشی نظام کے اندر بظاہر دخیل نظر آتا ہے۔ لیکن، در اصل معاشی مسائل میں "اعداد و شمار" کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ جب تک کسی ملک کی صحیح مردم شماری نہ کی جائے اور پھر پبلک کی معاشی زندگی کے درجات یعنی برسرِ روزگار، بے روزگار، تاجر، صناع نیز معذور، فقیر دائم المریض، اور صاحبِ حاجت، افراد کے صحیح اعداد و شمار مرتب نہ ہوں اور زمین، کارخانے، معدنیات یعنی ذرائع پیداوار اور محاصل و مصارف کی تعیین و تشخیص میں بھی اعداد و شمار کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر کوئی حکومت نہ اس مقصد کی تکمیل کر سکتی ہے "کہ قلمروِ حکومت میں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہے" اور نہ وہ معاشی عدل و انصاف کا حقیقی توازن قائم رکھ سکتی ہے۔ پس جبکہ "اعداد و شمار" معاشی مسائل کے عادلانہ توازن کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو بلا شبہ ان کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب فاروقِ اعظم (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا تو منجملہ دیگر مہماتِ اُمور کے اس امرِ اہم کی جانب بھی توجہ کی گئی اور "اعداد و شمار" کو خاص حیثیت "دیکر خلافت کے مختلف مسائل میں ان سے مدد لی گئی۔

چنانچہ جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے عصرِ خلافت میں مفتوحہ ممالک سے کثیر مال و دولت حاصل ہوا تو آپ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے مشورہ سے عطایا اور وظائف کے سلسلہ میں مردم شماری کے رجسٹر قبائل اور منازل (مکانات) کے لحاظ سے مرتب کرائے اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے تو اسکی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہانتک فرما دیا۔

اری مالاً کثیراً یسع الناس و	میں دیکھ رہا ہوں کہ مال اب اس قدر بہتات کے ساتھ حاصل
ان لم یحصوا حتی یعرف من	ہو رہا ہے کہ لوگوں کیلئے وسعت کے ساتھ کفایت کرسکتا
اخذ ومن لم یاخذ خشیت	ہے سو اگر لوگوں کی شمار کرکے ان کی تعداد کا احاطہ نہ
ان ینتشر والامر الخ۔	کیا گیا تاکہ پانیوالے اور نہ پانیوالے کا صحیح حال معلوم ہو سکے
له	تو مجھ کو خوف ہے کہ اس معاملہ میں انتشار نہ پیدا ہو جائے"

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی اس رائے کو صحیح سمجھ کر اسپر عمل کیا۔

وکتب الناس علی قبائلهم وفرض	اور لوگوں کی قبائل وار فہرست بنائی اور ان کے روزینے
لهم العطاء ٢	مقرر کئے۔
قد عا عقیل بن ابی طالب ومخرمة	حضرت عمرؓ نے عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل
بن نوفل وجبیر بن مطعم وکانوا	اور جبیر بن مطعم کو بلایا" اور یہ تینوں انساب قریش سے ماہر
من نساب قریش فقال اکتبوا	تھے" اور فرمایا کہ لوگوں کی شمار ان کے مکانات پر جا کر کرو۔
الناس علی منازلهم ٣	
قال رایت عمر بن الخطاب (رضی	خرام کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اس حالت
اللہ عنہ) یحمل دواوین خزاعة	میں دیکھا ہے کہ وہ بنی خزاعہ کا رجسٹر ہاتھ میں لئے ہوئے
حتی ینزل قدیداً فتاتیه بقدید	ہیں اور قدید میں اپنے ہاتھ سے عطایا تقسیم کر رہے
فلا یغیب عنه امرأة بکر ولا ثیب	ہیں حتیٰ کہ ایک عورت کنواری اور بیوہ ان کی شمار
فیعطیهن فی ایدیهن ثم یروح	سے باہر نہ تھی اور اپنا حق حاصل کر رہی تھی۔ اسی طرح
بعسفان فیفعل مثل ذلک ایضاً	عسفان میں جا کر انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا
حتی توفی۔	اور وفات تک ہر سال یہی کرتے رہے۔

اسی طرح خراج اور جزیہ کے سلسلہ میں مصر اور عراق کی مردم شماری کرائی گئی اور غیر مسلموں[٥]

---

۱ طبری ج ٥ ص ۲۳ و ۲۲۔ ۲ طبری ج ٥ ص ۲۲۔ ۳ ایضاً ج ٥ ص ۲۳ ۴ طبری ج ٥۔

(ذمیوں) کے روزینے مقرر کرنے کے لئے فہرستیں مرتب کرائیں [1]

"اعداد و شمار" کی اہمیت کے یہی وجوہ و اسباب تھے جن کی بدولت تدوینِ دواوین کا افتتاح ہوا۔ اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی اوّلیات میں سے اس کو شمار کیا گیا۔ [2]

(۱) والسبب فی تدوین الدواوین ان عامل عمر علی البحرین اتاہ یوماً بخمسمائۃ الف درھم فاستعظمہا وجعل علیہا حراساً فی المسجد فاستشار علیہ بعض من عرفوا فارس والشام ان یدون الدواوین یکتبون فیہا "الاسماء وما لو احد واحد وجعل الارزاق مشاھرۃ"

(۱) ابتداء میں اعداد و شمار کے رجسٹروں کی ترتیب کا سبب یہ پیش آیا کہ بحرین کے گورنر کے پاس سے پانچ لاکھ درہم موصول ہوئے، حضرت عمرؓ نے انکو بڑی تعداد سمجھتے ہوئے مسجد میں اس پر محافظ مقرر کر دیئے اور صحابہؓ سے مشورہ کیا اور بعض صحابہؓ نے جو فارس و شام کے حالات سے واقف تھے یہ مشورہ دیا کہ رجسٹروں کی ترتیب دیجائے جن میں لوگوں کے نام اور ان سے متعلق روزینہ کا تذکرہ ہو اور روزینہ کا معاملہ ماہواری ہو جاوے۔

(۲) لما توسع المسلمون فی الفتح وانتشروا فی الممالک وکثرت موارد الدولۃ وتبسطت فی مناحی العمران واخذ یزداد الفیٔ من الخراج والجزیۃ زیادۃ لا طاقۃ للخلیفۃ واعوانہ بضبطہا ولا قبل لہم باحصاء مستحقیہا وتوزیع الاعطیات

(۲) مسلمانوں کی فتوحات جب وسیع ہو گئیں اور انھوں نے بہت سے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور دولت و ثروت کا ذخیرہ بہت کافی جمع ہو گیا۔ اور ان کی عمرانی حدود بہت بڑھ گئیں اور خراج و جزیہ سے علاوہ فیٔ و غنیمت میں اس قدر اضافہ ہونے لگا کہ خلیفہ اور اعیانِ خلافت اس کے نظم و انتظام سے عاجز آنے لگے اور مستحقین مصارف اور تقسیم عطایا میں اصحابِ عطیات کا احاطہ

[1] کتاب الخراج ص ۱۲۶۔ [2] طبری ج ۵ ص ۲۲ و ج ۶ ص ۱۶۰۔

والمرتبات، حتی اربا بها بالعطاء
الا بضبطها وترتیبها علی
اصول ثابتة وقیدها فی
قیود خاصة دعا عمر رضی
الله عنه الصحابة واستشارهم
فی کیفیة تدوین الدیوان الخ ا

ناممکن ہو گیا اور تاوقتیکہ خاص قیودات اور معین
و مرتب اصول پر ان کو مرتب نہ کیا جائے۔ ان کی
ترتیب دشوار ہو گئی، تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ
نے صحابہؓ کی مجلس شوریٰ منعقد کی اور ان سے مشورہ
کیا کہ کس طرح اہل مصارف کی مردم شماری کے
اور محاصل کی تفصیلات کے رجسٹر مرتب کئے جائیں۔

حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) جب بحرین سے مال کثیر لے کر آئے تو حضرت عمرؓ نے مجلس
مشورت طلب فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

ایها الناس ان قد جاء مال
کثیر فان شئتم ان نکیل لکم
کیلا وان شئتم ان نعد لکم
عدا، وان شئتم ان نزن
لکم وزنا لکم فقال رجل من
القوم یا امیر المؤمنین دون
للناس دواوین یعطون علیها
فاشتهی عمرؓ ذالک۔ ۲ه

لوگو! یہ مال کثیر آیا ہوا ہے پس اگر تم چاہو تو میں پیمانہ
سے ناپ کر تم میں تقسیم کردوں اور اگر تمہاری
یہ خواہش ہو کہ گن کردوں تو شمار سے بانٹ دوں
اور اگر یہ مرضی ہو کہ وزن کر کے دوں تو اس طرح
تول کردوں۔

قوم میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے
کہا امیر المومنین لوگوں کی شمار کے لئے رجسٹر مرتب
کرائیے تاکہ اس کے مطابق وظائف دیئے جایا کریں
حضرت عمرؓ نے اس کو بہت پسند کیا۔

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا۔

ان کنت صادقاً لیاتین الراعی

بلال! اگر یہ سچ ہے کہ روپیہ کی مقدار وہ ہے جو تم بتاتے

ا ہ اشہر مشاہیر الاسلام ج ۲ ص ۳۷۲۔ ۲ہ کتاب الخراج ص ۴۵۔

نصیبہ من ھذا المال بالیمن ودمہ فی وجہہ الخ۔ ہو تو پھر یمن کے رہنے والے چرواہے تک کا اس مال میں حصہ ہے ، بایں حالت کہ سفر کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمایا ہوا ہو۔ [1]

یہ اور اسی قسم کے دوسرے حوالجات ہیں جو مقریزیؒ، ابن کثیرؒ، طبریؒ، ابی عبیدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بکثرت تفصیل کے ساتھ نقل کئے ہیں جن سے مختلف ضروریات کے لئے مردم شماری اور محاصل و مصارف کی تفاصیل کے سلسلہ میں "اعداد و شمار" کی اہمیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اعداد و شمار اور رجسٹروں کی ترتیب کا یہ سلسلہ تو ہر ایک حکومت میں ہوتا ہے اور مختلف ضروریات حکومت میں سے یہ بھی ایک اہم ضرورت ہے خواہ وہ حکومت سرمایہ دارانہ نظام کی حامی ہو یا اس کی مخالف و معاند ہو، پس اس کا "صالح معاشی نظام" کے بنیادی مسائل سے کیا تعلق ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ "اعداد و شمار" اور اس سے متعلق دواوین و مجلات کا ہر قسم کی حکومت کے ساتھ تعلق ہے اور کسی خاص طرز حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اس سلسلہ میں "صالح معاشی نظام" اور "فاسد معاشی نظام" کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس حکومت کا سسٹم ایسے اصول پر قائم ہے کہ اس سے مذموم سرمایہ داری عالم وجود میں آتی اور نشوونما پاتی ہے تو اس نظام حکومت میں "اعداد و شمار" کی اہمیت اس لئے ہوگی کہ اس ذریعہ سے معلوم کیا جائے کہ ملک میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی ترقی کی شکل کیا ہو اور کس طرح اس ناپاک مقصد کو ترقی دینے کے لئے عوام اور غریب طبقے کو آلۂ کار بنایا جائے۔ اور اگرچہ اس نظام میں بے روزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے کی بھی آوازیں سنی جائیں گی۔ لیکن اس آواز کے پس پردہ بھی وہی ذہنیت کارفرما ہوگی جو اس نظام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

اس کے برعکس جس حکومت کا طرز و طریق سرمایہ داری کے خلاف خلقِ خدا کی فلاح و بہبود

[1] کتاب الخراج ص ۴۶

پر قائم ہے اسکے نظام معاشی میں اس مسئلہ کی اہمیت اس طرح کار فرما نظر آئے گی کہ ہر ممکن طریقے سے اسکو عوام و خواص سب کی حاجت روائی کے لئے موثر ذریعہ خصوصاً محروم المعیشت افراد کی حق رسی کا بہترین وسیلہ بنایا جائے۔

چنانچہ اسلام کے "صالح معاشی نظام" میں اعداد و شمار کی اہمیت ان ہر دو نظریوں میں سے دوسرے نظریہ کے پیش نظر ہے اور اس لئے بلاشبہ وہ اقتصادی مسئلہ میں اساسی مقصد کا "مقدمۂ خیر ہے" "تمہید شر" نہیں ہے۔ اس لئے معاشی نظم و انتظام کے لحاظ سے ازبس ضروری ہے کہ "اولی الامر" اپنے قلمرو میں "مردم شماری" کا نظم قائم کرے اور مسلم و غیر مسلم اور ذمی و مستامن کی تفصیلات کو جدا جدا رجسٹروں میں درج کرائے۔ اور برسر روزگار، بے روزگار، مریض، معذور اصناف کے اعداد و شمار محفوظ رکھے۔ نیز محاصل و مصارف کی تفصیلات کے لئے علیحدہ رجسٹر رکھے تاکہ ہر شخص اپنے معاشی حقوق کو بآسانی حاصل کر سکے اور خلافت کا معاشی نظام "صالح نظام" کہلانے کا مستحق ہو۔

وظائف

گذشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلامی نظام حکومت میں دو قسم کی رعایا حقوق شہری سے مستفید ہوتی ہے ایک "مسلم" یعنی وہ جماعت جس نے اسلام کے مکمل نظام کو قبول کر لیا اور دینِ الٰہی کے ہر فیصلہ کو اپنا ایمان بنا لیا ہے اور دوسری (ذمّی) یعنی وہ غیر مسلم جماعت جس نے ایمانیات، عبادات اور اخلاقیاتِ دینی میں آزاد رہ کر اور اسلام سے انحراف کر کے صرف سیاسی واقتصادی اور معاشرتی امور میں حکومتِ اسلامیہ اور اسکے قوانین کی پناہ قبول کر لی ہے اور اسلامی طاقت (خلافت) کا مطیع رہنا منظور کر لیا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے اس دوسری جماعت پر اسکے مال، اس کی جان اور آبرو کی حفاظت کے باوجود نہ مقررہ ٹیکس (خراج وجزیہ) کے علاوہ ان پر کوئی ٹیکس عائد ہوتا ہے اور نہ وہ فوجی خدمات کیلئے مجبور کئے جا سکتے ہیں، اور نہ حکومت کی دوسری خدمات ان پر عائد ہوتی ہیں، لیکن پہلی جماعت (مسلم) پر یہ سب خدماتِ مالی وجانی عائد ہیں اور وہ ان خدمات کیلئے خاص خاص حالات میں مجبور بھی کیجا سکتی ہے۔

اور اس فرق باہمی کے لئے اسلام یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جبکہ پہلی جماعت نے اسلام کے مکمل نظام کو تسلیم کر لیا ہے تو اب اسلام کا حق ہے کہ وہ اپنی ہر ایک خدمت کے لئے اس کو پکارے اور حالات ومقتضیاتِ وقت کے پیش نظر حکومتِ ربّانی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو خدمت چاہے اس کے سپرد کرے اسکو انکار ومنع کا کوئی حق نہیں ہے بلکہ اسکے وفادارانہ انقیاد وتسلیم کے جوہر ایسے ہی مواقع پر کھلتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ جبکہ ملتوں کے مختلف نظامہائے حکومت کے مقابلہ میں اسلام کا یہ نظامِ حکومت خود اس کا اپنا نظام ہے تو بلاشبہ اس کا فرض ہے کہ اس نظام کی بہتری کے لئے ہر قسم کی خدمات انجام دے۔

پس جبکہ اس اصول کے ماتحت اس جماعت "مسلم" کا جان و مال، اسلام اور حکومتِ اسلامی کے لئے وقف ہے تو حکومت کے ذمہ ضروری ہے کہ ان کے بیشتر افراد کا تکفل اپنے ذمہ میں لے اور بڑی حد تک "اسٹیٹ" ہی ان کی معاشی زندگی کی ضامن ہو، تاکہ ملت کا ہر فرد اپنی دماغی اور عملی محنت کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو اور فارغ البال ہو کر رفاہیت اور پاک عیش و راحت کے ساتھ جماعتی استحکام کے لئے کارآمد "پرزہ" بن سکے۔ اور اس طرح ان کی زندگی کا بڑا حصہ خلافت، حکومت، اور ملت و ملک کی خدمات کے لئے وقف ہو جائے۔

علاوہ ازیں اس طریق کار سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ قوم و ملت کی جماعتی فلاح اور ترقی کا وہ اثر جو اس طریقہ سے پیدا ہوگا "خود افراد قوم پر پڑیگا، اور ہر فرد ملت نہ صرف اپنی معاشی زندگی ہی بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں اپنی اپنی طبعی استعداد کے مطابق بہرہ مند اور فیضیاب ہو سکے گا۔ اور یہی اقتصادی نظام کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

پس حکومت (خلافت) اس جماعت کے افراد سے مختلف شعبوں کی خدمت لیتی اور ان کی اور انکے اہل و عیال کی براہ راست کفالت کرتی ہے۔ مثلاً جہاد و اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خدمت" وصول صدقات و زکوٰۃ کی خدمت" تعلیم و تبلیغ کی خدمت" مختلف محکمہ جات کی خدمت"۔

اور جو افراد امت ان خدمات کے قابل نہیں ہیں مثلاً مریض اور معذور، یا معاشی وسائل سے قطعاً محروم ہیں مثلاً یتامیٰ و بیوگان، فقراء اور مساکین تو ان کا بار کفالت بھی حکومت ہی کے کاندھوں پر ہے تاکہ صالح معاشی نظام کا مقصد وحید فوت نہ ہونے پائے۔

حکومت کی یہی کفالت اور معاشی ذمہ داری "عطایا اور وظائف" کے نام سے نامزد ہے۔ مسطورہ بالا وجوہ و اسباب اور بیان کردہ مصالحِ عظیمہ کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے لئے زندگی کا جو دستور العمل مقرر فرمایا تھا اس کا ذکر احادیث و سیر کی کتابوں

میں اجمال و تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، چنانچہ ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں اس کا مختصر نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

فلما کثرت الاموال فی ایام عمرؓ وضع الدیوان فرض الرواتب للعمال والقضاۃ ومنع ادخار المال وحرم علی المسلمین اقتناء الضیاع والزراعۃ والمزارعۃ لان ارزاقھم وارزاق عیالھم تدفع لھم من بیت المال حتی الی عبیدھم وموالیھم اراد بذلک ان تبقوا جندا علی اھبۃ الرحیل لا یمنعھم انتظار الزرع ولا یقعدھم الترف والقصف الخ

لہ

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حکومت میں مال کی بہتات ہو گئی اور اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب ہو گئے تو حکومت کے کارکنوں، گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرے مقرر کر دیئے گئے اور مال و خزانے جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور مسلمانوں پر کاشتکاری و زمینداری ممنوع کر دی گئی۔ اسلئے کہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے روزینے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے۔ بلکہ ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے بھی، اس سے مقصد یہ تھا کہ تمام قوم عسکری بن جائے اور اس طرح وہ کوچ کے لئے چست و چالاک رہے کہ ان کے سفر کے سامنے نہ زمینداری مانع آئے نہ کاشتکاری، اور یہ گروہ بے محنت کی زندگی اور عیش و عشرت میں نہ پڑ جائے۔

ممکن ہے یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر تمام رعایا کاشتکاری اور زمینداری دونوں سے محروم کر دی جائے تو پھر خام اجناس کی پیداوار اس ملک میں کیسے ہو گی، اور جس ملک میں خام اجناس کی پیداوار نہ ہو، وہ کس طرح اپنی اقتصادی حالت کو برقرار رکھ سکتا ہے؟ سو اسکا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے یہ حکم یکسانیت کے ساتھ قائم رکھا جائیگا، بلکہ اس

لہ نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۸۳ ماخوذ از کتاب الاموال لابی عبیدؒ و کتاب الخراج لابی یوسفؒ۔

حکم سے (جیسا کہ خود اس عبارت میں درج ہے) مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ جہاد کے قیام اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بقاء کی خاطر ازبس ضروری ہے کہ تمام افرادِ ملت یہ یقین کریں کہ ان کی زندگی "اجتماعی نظام" کی حیات کے ساتھ وابستہ ہے اور انکے قویٰ عملی خود اپنے لئے نہیں ہیں بلکہ جماعت کی خدمت یا خلافتِ اسلامی کے استحکام کے لئے ہیں۔ اور اسی لئے انکی معاشی زندگی کے لئے بڑی حد تک خلافت (اسٹیٹ) خود متکفل ہے، نیز یہ کہ زمینداری سسٹم چونکہ عیش پسندی دوسروں کی محنت پر بھروسہ، اور کاہلی و بیکاری، کی دعوت دیتا ہے اس لئے بھی مسلمانوں کو اس سے جدا رکھنا مناسب سمجھا گیا۔

اور چونکہ کاشت کی یہ خدمت اس زمانہ میں مفتوحہ ممالک کے وہ تمام ذمی انجام دیتے تھے جو اسلام کی حکومت کے زیر سایہ رہنا تو قبول کر لیتے تھے لیکن اسلام ان پر اپنے اقتصادی یا سیاسی نظام کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور اس طرح خام اجناس وغیرہ ضروریات کی بہم رسانی بہترین ذریعہ حاصل تھا۔ لہذا اس وقت کے مناسب یہی طریق کار بہتر تھا کہ مسلمان زمین سے کوئی تعلق نہ رکھیں، لیکن جب معاملہ کی یہ نوعیت باقی نہ رہے تو پھر اس شجرِ ممنوعہ کی اس حد تک اجازت باقی رہے گی جس سے اصل مقصد کسی درجہ میں بھی فوت نہ ہونے پائے۔ [۵]

اور اگر حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اگر مسلمان زمین سے استفادہ کرنے کے جواز کی آڑ لیکر زمینداری اور کاشتکاری کے جال میں نہ الجھ جاتے اور "جہاد بالحق" کو شعار بنا کر سادہ اور پاک معاشی زندگی کو اسوہ بنائے رکھتے تو بلاشبہ آج دنیا کے ہر گوشہ میں حکومتِ ربانی (خلافتِ حقہ) کا علم بلند نظر آتا۔ اور غلامی اور ذلت و افلاس کی

---

[۵] بعض روایات سے ایک مخصوص و محدود طرز کی زمینداری کا جواز ثابت ہے اور فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) کے اس اثر سے ممانعت ظاہر ہوتی ہے تو ان ہر دو قسم کی روایات میں تطبیق کی صورت یہی ہے جو اس صفحہ پر درج ہے یعنی نفسِ جواز کے قبول کے ساتھ ساتھ اسلامی مرغوبات میں سے یہی بات ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے ظاہر ہے۔

وہ صورت حال نہ پیدا ہوتی جس کا آج مشاہدہ ہو رہا ہے۔

بہر حال وظائف کا یہ نظم مختلف حیثیات کے اعتبار سے متعدد شعبوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک شعبہ کے لئے رجسٹر اور فہرستیں جدا جدا رہنا ضروری ہیں۔

پہلا شعبہ:۔ ان وظائف سے متعلق ہے جو فوجی خدمات یعنی "جہاد بالسیف" سے وابستہ ہے اور چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے ہر پیرو کے لئے "والنیٹر" ہونا ضروری اور ہر شخص کو جہاد کے لئے آمادہ رہنا واجب ہے اس لئے اس شعبہ کو دو حصوں پر تقسیم کرنا چاہئے۔ ایک وہ فوجی جماعت جو میدانِ جہاد میں عام طور سے حصہ لیتی رہتی اور باقاعدہ فوج میں شامل ہے اور دوسری وہ جماعت جو عام طور پر اپنے کاروبار میں مشغول رہتی ہے مگر وقت پر فوجی خدمت کے لئے حاضر ہو جاتی ہے ایسی جماعت کو والنیٹر (مطوعہ) کہا جاتا ہے۔

خلافتِ اسلامیہ کی جانب سے ان دونوں جماعتوں کے لئے وظائف کا تقرر کیا جاتا ہے اور ابتداء دورِ خلافتِ فاروقی میں "مہاجرین و انصار" اسی فہرست میں شامل تھے۔ اور بحرین سے مالِ کثیر آنے پر جو روزینے مقرر کئے گئے وہ اسی شعبہ سے متعلق تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جب صحابہؓ سے اس بارہ میں مشورہ کیا ہے تو ولید بن ہشامؓ نے یہ کہا۔

یا امیر المومنین قد جئت	اے امیر المومنینؓ! میں شام رہ آیا ہوں میں نے
الشام فرایت ملوکھا قد	وہاں کے بادشاہوں کے یہاں دیکھا ہے کہ انھوں
دونوا دیوانا وجندوا جندا	نے رجسٹر بنا رکھے ہیں اور لشکریوں کو باقاعدہ درج رجسٹر
فدون دیوانا وجند جندا	کر رکھا ہے آپ بھی روزینہ کے لئے رجسٹر بنوائیں اور
فاخذ بقولہ الخ۔	لشکریوں کے نام درج رجسٹر کریں، پس حضرت عمرؓ
؎۱	نے ان کی بات منظور کر لی۔"
لما فتح اللہ علیہ وفتح فارس	اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوحات کا

؎۱ طبری ج ۵ ص ۲۳۔

دار الروم جمع اناساً من اصحاب	سلسلہ وسیع کردیا اور فارس و روم بھی فتح ہوگیا تو آپ نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	صحابہؓ کی مجلس مشاورت منعقد کی اور فرمایا: میرا ارادہ
وسلم فقال: ما ترون فانی	ہے کہ مال کو بیت المال میں جمع رکھوں اس لئے کہ باعث
اری ان اجعل عطاء الناس	برکت ہوگا اور اسمیں سے لوگوں کے سالانہ روزینے مقرر
فی کل سنة واجمع المال فانه	کروں، آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم
اعظم للبرکة، قالوا اصنع ما	نے کہا جو آپ مناسب سمجھیں وہ کیجیے۔ خدا کی توفیق
رأیت فانك ان شاء الله موفق	آپ کے شامل حال ہو، بس حضرت عمرؓ نے وظائف
قال ففرض الاعطیات فدعا	کا تقرر کیا اور درج رجسٹر کرنے کے لئے تختی منگائی اور پھر
باللوح فقال بمن ابدأ فقال	پوچھا کہ پہلے کس کا نام لکھوں، حضرت عبد الرحمن بن
له عبد الرحمن بن عوف ابدأ	عوفؓ نے کہا کہ اپنے نام سے شروع کیجیے، حضرت عمرؓ
بنفسك فقال: لا والله ولکن	نے فرمایا قسم بخدا یہ تو نہ ہوگا بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ
ببنی هاشم رهط النبی صلی	وسلم کے خاندان بنی ہاشم سے شروع کرتا ہوں۔[1]
الله علیه وسلم الخ.[1]	

اس تقرر وظائف میں اگرچہ فوجی شعبہ کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے نام پائے جاتے ہیں، لیکن ابتداء میں ایسا رہا ہے مگر بعد میں ایک شعبہ کو دوسرے شعبہ سے کلیۃً ممتاز کردیا گیا تھا۔ اور جس طرح مجاہدین کے وظائف مقرر کئے گئے تھے اسی طرح ان کے اہل وعیال کے بھی وظائف مقرر تھے۔[2]

شروع شروع میں حضرت عمرؓ کسی بچہ کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہ کرتے جب تک اس کا دودھ نہ چھوٹ جاتا۔ مگر ایک مرتبہ انھوں نے رات کے گشت میں دیکھا کہ ایک عورت کا بچہ رو رہا ہے اور مچل رہا ہے مگر اسکی والدہ پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے دریافت حال کیا تو

---

[1] کتاب الخراج ص ۴۴۔ [2] کتاب الاموال ص ۲۳۰، ۲۴۱۔

عورت نے عرض کیا کہ عمرؓ کا حکم ہے کہ جب تک بچہ کا دودھ نہ چھوٹ جائے اس کا وظیفہ مقرر نہیں کیا جاتا، اور میں پریشان حال ہوں اس لئے قبل از وقت اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اس وجہ سے یہ بیتاب ہے۔ حضرت عمرؓ نے صبح ہی کو تمام قلمرو خلافت میں منادی کرادی کہ آئندہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا روزینہ مقرر کردیا جایا کریگا۔" [۱]

دوسرا شعبہ قضاۃ و عمالِ حکومت سے متعلق ہے، حکومتِ اسلامی میں جوڈیشل اور ایگزیکٹیو کے کارکنوں کے مشاہروں کا سسٹم دوسرے قدیم وجدید طرز ہائے حکومت کے سسٹم پر قائم نہیں کہ ان کی اساس وبنیاد دماغی اور تعلیمی استعدادات کا معیار قائم کر کے مقرر کی جائے اور اس طرح رضا کارانہ خدمات کو تجارتی (بزنس) سسٹم میں ڈھال دیا جائے، بلکہ ان کے لئے بھی حکومت کی جانب سے وظائف مقرر ہوتے ہیں اور ان کے تقرر میں دو باتوں کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے اول یہ کہ وہ اس مقدار میں ضرور ہو کہ ان کی اور ان کے اہل وعیال کی بخوبی کفالت کر سکے اور ان کو مجبوراً رشوت کی جانب مائل ہونا پڑے۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر ان میں تقریبی یکسانیت ہو یہ نہ ہو کہ ایک گردش پا رہا ہو تو دوسرا ایکہزار، اور ان وظائف کے تقرر کا معاملہ امام اور اولی الامر کی صوابدید پر ہے۔

قاضی ابو یوسفؒ عمال، قضاۃ، اور محکمۂ ڈاک کے کارکنان کے وظائف کے متعلق تحریر فرماتے ہیں

وتامر باختيار الثقات العدول من اهل كل بلد ومصر فتوليهم البريد والاخبار وكيف ينبغي ان لا يقبل خبر الا من ثقة عدول، ويجري لهم الرزق من بيت المال الخ [۲]

اے ہارون! تو قلمرو خلافت میں احکام بھیجدے کہ ہر شہر اور بستی میں عادل اور ثقہ لوگ چن کر ان کو ڈاک اور خبر رسانی کا محکمہ سپرد کیا جائے کیونکہ اگر عادل اور ثقہ کی خبر بھی قابل اعتماد نہ ہوگی تو اور کس کی خبر لائق وثوق ہو سکتی ہے اور ان کے لئے بیت المال سے روزینہ مقرر کر۔"

---

[۱] کتاب الاموال ص ۲۳۷ - [۲] کتاب الخراج ص ۱۸۷ و ۱۸۶ -

وكل رجل تصيره في عمل المسلمين فاجر عليه من بيت مالهم ولا تجر على الولاة والقضاة من مال الصدقة شيئاً الا والى الصدقة فانه يجرى عليه منها كما قال الله تبارك وتعالىٰ "والعاملين عليها" فاما الزيادة في ارزاق القضاة والعمال والولاة والنقصان مما يجرى عليهم فذلك اليك۔[۱]

"اور ہر وہ شخص جس کو تو مسلمانوں (حکومت اسلامی) کی خدمت پر مامور کرے اس کا روزینہ بیت المال سے مقرر کر، اور گورنروں اور قاضیوں کو زکوٰۃ کی مد سے یہ وظیفہ نہ دیا جائے صرف "عمال صدقات" کو صدقات کو صدقات میں سے وظیفہ دیا جا سکتا ہے جیسا کہ قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمادی ہے "والعاملین علیہا" (یعنی صدقات میں سے ان کو دو جو اس کے وصول کرنے پر مامور ہیں) باقی ان کے وظائف میں زیادتی کمی کا معاملہ تیری (یعنی امام المسلمین) کی صوابدید پر ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

ثم ان الامام لما كان يستطيع بنفسه ان يباشر جباية الصدقات واخذ العشور وفصل القضاء في كل ناحية وجب بعث العمال والقضاة، ولما كان اولئك المشغولين بامر من مصالح العامة وجب ان تكون كفايتهم في بيت المال الخ

"پھر جبکہ امام تنہا یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ صدقات زکوٰۃ، اور عشور کو خود وصول کرے اور ہر مقام کے جھگڑوں کو چکائے تو ضروری ہوا کہ وہ قاضیوں اور عاملوں کو ہر جگہ مقرر کرے اور جبکہ یہ مصالح عامہ اور انکی خدمت گذاری پر لگا دیئے گئے تو یہ بھی ضروری ٹھیرا کہ انکی معاشی کفالت بیت المال کرے۔

اور امام ابو عبیدؒ فرماتے ہیں۔

فانما لهم من المال بقدر سعيهم وعمالتهم الخ۔[۲]

"اور اُن عمال، حکام اور وُلاۃ مسلمین کیلئے بیت المال سے وظیفہ انکی سعی اور کام کی محنت کے پیش نظر ملنا چاہیے

---

[۱] کتاب الخراج ص ۱۸۶ ۔ [۲] کتاب الاموال ص ۶۰۶ ۔

عن مالك ليس لله ان على الصدقة فريضة مسماة انما ذلك الى نظر الامام واجتهاده

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عاملین کا روزینہ کوئی مقررہ معینہ مشاہرہ نہیں ہے بلکہ امام اور اس کے اجتہاد کی صوابدید پر ہے۔

قال ابو عبيد وكذلك قول سفيان واهل العراق وهذا عندنا هو المعمول به[۱]

ابو عبیدؒ کہتے ہیں یہی ابو سفیان اور اہل عراق کا قول ہے اور یہی ہمارا معمول بہ ہے۔

تیسرا شعبہ تعلیم و تبلیغ دین کی خدمات سے متعلق ہے یعنی جو افراد امت قرآن عزیز مسائل دین کی تعلیم اور تبلیغ اسلام کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اسلام نے تعلیم دینی اور مفید تعلیم دنیوی کو ہر فرد امت کے لئے ضروری قرار دیا ہے اس لئے وہ تعلیم و تعلم کی عام سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے اس سلسلہ میں بھی وظائف کا تقرر ضروری قرار دیتا ہے اور دینی تعلیم میں اگرچہ معلمین کی خدمات لوجہ اللہ اور فی سبیل اللہ ہونی چاہئیں، مگر جب کہ وہ اپنے کاروباری وقت کو ان پاک اور اہم مقاصد کے لئے وقف کر چکے ہیں، تو حکومت اسلامی کا فرض ہے کہ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کرے تاکہ ان کو محروم المعیشت ہو کر اس مقدس سعی سے بے تعلق نہ ہو جانا پڑے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اپنے دور خلافت میں اس شعبہ کا بہت بڑا اہتمام کیا اور معلمین و مبلغین کے وظائف مقرر فرمائے۔ ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں نقل کیا ہے۔

ان عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان كانا يرزقان المؤذنين والائمة والمعلمين الخ[۲]

حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عثمان بن عفانؓ مؤذنوں اماموں اور معلموں کو بار وظائف دیا کرتے تھے۔

اسی طرح فقہا کے وظائف کے متعلق ابن جوزی نے تفصیلات نقل کی ہیں، اور کس

۱؎ کتاب الاموال ص ۹۰۶ ۔ ۲؎ ص ۱۶۵۔

فقیہ کو کس شہر میں تعلیم فقہ پر مامور کیا گیا، اس کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے[1]۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز (رحمہم اللہ) کے زمانہ خلافت میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

بعث عمر بن عبد العزیز یزید بن ابی مالک الدمشقی والحارث بن یمجد الاشعری یفقہان الناس فی البدو واجری علیہما رزقا فاما یزید فقبل واما الحارث فابی الخ[2]	عمر بن عبد العزیز نے یزید بن ابی مالک اور حارث بن یمجد اشعری کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین سکھائیں اور ان کے لئے روزینہ مقرر فرمایا مگر یزید نے تو قبول کر لیا اور حارث نے روزینہ لینے سے انکار کر دیا (یعنی بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دی)۔

اسی طرح طلبہ کے لئے بھی وظائف مقرر کئے۔

ان عمر بن الخطاب کتب الی بعض عمالہ ان اعط الناس علی تعلم القرآن[3]	حضرت عمرؓ نے بعض عاملوں کو لکھا کہ قرآن سیکھنے والوں کے لئے وظیفہ مقرر کریں۔

اس حکم پر عامل نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن سیکھنے کی رغبت کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنیکی خاطر طالب علم بننا اختیار کر لیا ہے مگر حضرت عمرؓ نے اسکے باوجود وظیفہ بند نہیں کیا۔

چوتھا شعبہ۔ فقرا، مساکین اور محروم المعیشت افراد کے وظائف سے تعلق رکھتا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے اس شعبہ کا مقصد یہ ہے کہ قلمرو خلافت کا ایک فرد بھی معیشت سے محروم نہ رہے یعنی جو اشخاص مرض، ضعف پیری، نقص اعضا، یتیمی و بیوگی، یا دوسرے اسباب کی بناء پر کسب معیشت سے معذور ہیں وہ افراد امت پر بار دوش نہ بن جائیں بلکہ حکومت "بیت المال" سے ان کے وظائف مقرر کر کے انکے حق معیشت کو پورا کرے۔

اس شعبہ کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کی آیات صدقات و زکوٰۃ ہیں اور وہ حدیث صحیح ہے جس میں تصریح ہے کہ:۔

توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم	ان کے مالداروں سے صداقت لئے جائیں اور انکے حاجتمندوں پر صرف کئے جائیں۔

[1] کتاب الاموال ص ۲۸۰ - [2] ایضاً ۲۸۲ - [3] ایضاً ۲۶۱ -

اور وہ صحیح روایات ہیں جن میں فقراء کی تنگیٔ معیشت کے انسداد کیلئے حکم دیا گیا ہے

وعن جریر رضی اللہ عنہ قال اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قوم حفاۃ عراۃ مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف عامتہم من مضر بل کلہم من مضر فتمعر وجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لما رای بہم من الفاقہ فدخل ثم خرج فقال یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الآیہ) اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا" والآیہ التی فی الحشر اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (الآیہ) [1]

اور جریرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک قوم پیش کی گئی جو ننگے پیر اور ننگے بدن تھے جو چیتے کے سے رنگ کی طرح کا صوف یا عبا پہنے ہوئے تھے تلواریں حمائل تھیں اور ان میں زیادہ تر قبیلۂ مضر کے لوگ تھے اور ان کے چہروں سے فاقہ کی حالت ظاہر تھی، یہ دیکھکر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے اور پھر باہر آکر صحابہؓ کے سامنے سورۂ نساء اور سورۂ حشر کی آیات پڑھکر سنائیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو وہ امیر و کبیر ہوں یا فقیر و صغیر ایک انسان آدمؑ سے پیدا کیا ہے اور یہ کہ انسان کو خدا سے ڈرنا چاہیئے کہ وہ کل قیامت کے دن خدا کے سامنے کیلئے جا رہا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اس قسم کے لوگوں کے حق خوراک سے متعلق تقرر وظائف میں یہ کیا کہ اچھی خوراک کے چند آدمیوں کو بلاکر دو وقت کھانا کھلایا اور پھر اسی اندازے سے ہر شخص کی خوراک کا وظیفہ مقرر فرما دیا۔[2] اور ایک روایت میں ہے۔

قال عمرؓ واخذ المدی بید والقسط بید: انی قد فرضت

حضرت عمر رضی اللہ ایک ہاتھ میں پیمانہ (مد) لئے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ میں پیمانہ (قسط) اور فرما رہے تھے

---

[1] مسلم کتاب الزکاۃ۔ [2] فتوح البلدان ص ۴۴۴۔

لكل نفس مسلمة في كل شهر مدي حنطة وقسطي زيت وقسطي خل فقال رجل والعبد قال نعم والعبد ان عمر صعد المنبر فحمد الله ثم قال انا اجرينا عليكم اعطياتكم وارزاقكم في كل شهر وفي يده المدي والقسط[١]

کہ میں نے ہر مسلمان کے لئے ہر مہینہ دو مد گیہوں اور دو قسط روغن زیتون اور دو قسط سرکہ مقرر کر دیا ہے تب ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا، کیا غلام کے لئے بھی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں غلام کیلئے بھی؛ حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا ہم نے تمہارے لئے ہر مہینہ عطایا اور روزینوں کا تقرر کر دیا ہے اور حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں مدیٰ اور قسط دو پیمانے تھے۔

حضرت عثمانؓ نے خبّار نہدی کے ضعفِ پیری اور کثرتِ اہل وعیال کو دیکھ کر ان کے بچوں کی تعداد دریافت کرنے کے بعد ان کا اور ان کے بچوں کا جداگانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا[٢]

صفحات گذشتہ میں جن وظائف کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ابتداء دورِ فاروقی میں فوجی اور غیر فوجی دونوں قسم کے وظائف کا خلط رہا ہے مگر بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو جدا جدا رجسٹروں میں درج کرا کر ممتاز کر دیا تھا اور والنٹیروں کا رجسٹر (دیوان) علیحدہ تھا اور فقراء اور صاحب حاجات کا جدا رجسٹر (دیوان) تھا چنانچہ ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں اس فرق کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ فوجی وظائف کا تعلق زیادہ تر "فیٔ" سے تھا اور فقراء اور صاحب حاجات کا زکوٰۃ عشر، عشور اور دوسرے ہر قسم کے "صدقات" سے تھا[٣]

علاوہ ازیں بیت المال کے مصارف کی بحث میں کتب فقہ میں باب الزکوٰۃ، باب الجہاد باب السیر کے اندر بصراحت بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ کے ذمہ فقراء، مساکین، یتامیٰ، بیوگان، مسافر اور متوحش، کی کفالت ضروری ہے اور حسب ضرورت سالانہ ششماہی یا ماہوار انکے لئے وظائف مقرر کرنا چاہئے[٤]۔

لے کتاب الاموال ص ۲۴۶، و فتوح البلدان ص ۴۶۲۔ ٢ے مدی ٢، ٢/١ صاع قسط نصف صاع ٣ے کتاب الاموال ص ۲۴۷ تا ۲۵۳ ٤ے کتاب الاموال ص ۲۳۴ و ۲۳۳۔

بہر حال بحث کا یہ نقطہ اسلامی حکومت کے اس جزو سے متعلق ہے جو "مسلم" کہلاتا ہے رہا دوسرا جزء یعنی غیر مسلم (ذمی) سو اس کے متعلق بھی اسلام نے یہ تصریحات کی ہیں کہ بغیر جبر و اکراہ کے "ذمی" بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر برضا و رغبت جنگ میں حصہ لے تو اس پر سے جزیہ معاف ہو جائیگا۔ اور مال غنیمت میں سے بھی اس کو معقول عطیہ دیا جائیگا اور اگر امام مناسب سمجھے تو اپنی صوابدید پر اس کا بھی فوجی وظیفہ مقرر کر سکتا ہے چنانچہ ایسی صورت میں جزیہ اٹھا لینے کی تصریح۔ ان معاہدوں میں موجود ہے جو خلفاء راشدین کے زمانہ میں ذمیوں سے کئے گئے ہیں۔ مثلاً فتح جرجان کے موقع پر معاہدہ میں یہ لکھا گیا۔

ومن استعان بہ منکم فلہ	اور تم (ذمیوں) میں سے جس شخص سے ہم فوجی
جزاءہ فی معونتہ عوضاً من	مدد لیں گے تو اس کی مدد کا یہ صلہ ہو گا کہ اس
جزائہ ۱؎	سے جزیہ نہیں لیا جائیگا۔

اور فتح آذربائیجان کے معاہدہ میں تحریر ہے:۔

ومن حشر منھم فی سنۃ وضع	اور جو ذمی مسلمانوں کے لشکر میں حصہ لیگا تو
عنہ جزاء تلک السنۃ ۲؎	اس سال کا جزیہ اس سے معاف کر دیا جائیگا

اور در مختار میں ان کے لئے مال غنیمت میں سے عطیہ دینے کے متعلق یہ تصریح ہے۔

لو دل الذمی علی الطریق او	(یا ذمی جنگ کے سلسلہ میں راستہ کا رہنما بنے) اس کا
مفادہ جواز الاستعانۃ بالکافر	مفاد یہ ہے کہ اسلامی ضرورت کے پیش نظر کافر ول
عند الحاجۃ وقد استعان	سے مدد لینا جائز ہے کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
علیہ الصلوٰۃ والسلام بالیھود	یہودیوں کے مقابلہ میں یہودیوں سے مدد لی بھی اور
علی الیھود ورضخ لھم ولا	ان کے لئے غنیمت میں سے عطیہ عطا فرمایا تھا اور یہ
یبلغ بہ السھم الا فی	عطیہ تقسیم غنیمت کے حصہ سے بڑھنے نہ پائے البتہ

۱؎ طبری ج ۴ ص ۲۵۴ ۔ ۲؎ طبری ج ۴ ص ۲۵۶

الذی اذا دل فیزاد علی السهم	اگر وہ راستہ کا رہنما ہے تو غنیمت کے حصہ سے بھی
لانہ کالاجرۃ الخ ۔لہ	زیادہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اجرت کی طرح ہے۔

اسی طرح امام شافعیؒ نے کتاب الام میں مشرکین سے جنگ میں مدد حاصل کرنے کے جواز میں بیان کیا ہے۔

فلا باس ان یستعان بالمشرکین	امام کے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر وہ مشرکین کے
علی قتال المشرکین اذا اخرجوا طوعاً	مقابلہ میں مشرکین سے مدد لے جبکہ وہ (ذمی مشرکین)
ویرضخ لھم الخ	بخوشی اس کے لئے تیار ہوں اور اس عمل میں ان کے
۔ٍٍلہ	لئے مالِ غنیمت میں سے بطور عطیہ کے ادا کرے۔

اور فتوح البلدان میں بلاذریؒ نے نقل کیا ہے کہ عبید اللہ بن زیاد نے بخارا کی ایک بڑی جماعت کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اسلام کی امان میں آجائیں اور یہ کہ ان کے لئے معاشی "وظیفہ" بھی مقرر کر دیا جائیگا۔ چنانچہ انھوں نے بخوشی اس کو قبول کر لیا اور بصرہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ ۔لہ

غیر مسلم (ذمی) کے یہ ان عطایا اور وظائف کا ذکر تھا جو فوجی نظام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فقراء، مساکین اور دوسرے اہلِ حاجات کے بارے میں اسلام بغیر کسی تفریق (مسلم و غیر مسلم) کے وظائف معاشی کا سلسلہ قائم کرتا ہے اور کسی ایک ذمی کو بھی محروم المعیشت رکھنا جائز نہیں سمجھتا چنانچہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت کا واقعۂ ذیل اس حقیقت کی روشن دلیل ہے۔

ایک مرتبہ فاروق اعظمؓ ایک مکان پر تشریف لے گئے دیکھا تو ایک بوڑھا نابینا بھیک مانگ رہا ہے حضرت عمرؓ نے دریافت کیا تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں "یہودی" ہوں حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ کس چیز نے تجھ کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا؟ اس نے جواب دیا کہ ادائے جزیہ، معاشی ضرورت، اور ضعف پیری نے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے مکان پر

لہ شامی ج ۳ ص ۳۲۵ لہ کتاب الام ج ۴ ص ۱۷۷ لہ فتوح ص ۳۷۶

لیجاکر جو موجود تھا اس کو دیا، پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس فرمان بھیجا کہ:۔

اُنظُر ھذا وضربائہ فواللہ ما انصفناہ ان اکلنا شبیبتہ ثم نخذلہ عند الھرم "انما الصدقات للفقراء والمساکین" والفقراء ھم المسلمون وھذا من المساکین من اھل الکتاب ووضع عنہ الجزیۃ وعن ضربائہ الخ[۱]

یہ اور اسی قسم کے دوسرے حاجتمندوں کی تفتیش کرو، خدا کی قسم ہم ہرگز انصاف پسند نہیں ہو سکتے اگر ان (ذمیوں) کی جوانی کی محنت (جزیہ) تو کھائیں اور انکی پیری کے وقت ان کو بھیک کی ذلت کیلئے چھوڑ دیں قرآن عزیز میں ہے "انما الصدقات للفقراء والمساکین" میرے نزدیک یہاں فقراء سے مفلس مراد ہیں اور مساکین سے اہل کتاب کے غرباء و فقراء، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے تمام ایسے لوگوں سے جزیہ بھی معاف کر دیا اور ان کا وظیفہ بھی بیت المال سے مقرر فرما دیا۔

اور حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہلِ حیرہ کے لئے جو عہد نامہ تحریر فرمایا اس میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ ہیں اور حقوق معاشرت میں مسلم اور غیر مسلم (ذمی) کی ہمسری کا اعلان کرتے ہیں:۔

وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابتہ آفۃ من الآفات او کان غنیا فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین وعیالہ ما اقام بدار الھجرۃ ودار الاسلام الخ[۲]

اور میں یہ طے کرتا ہوں کہ اگر ذمیوں میں سے کوئی ضعیف پیری کی وجہ سے ناکارہ ہو جائے یا آفاتِ ارضی و سماوی میں سے کسی آفت میں مبتلا ہو جائے یا ان میں سے کوئی مالدار محتاج ہو جائے اور اس کے اہلِ مذہب اسکو خیرات دینے لگیں تو ایسے تمام اشخاص سے جزیہ معاف ہے اور بیت المال ان کی اور ان کے اہل و عیال کی معاش کا کفیل ہے جب تک کہ وہ دار الاسلام میں مقیم ہیں

---

[۱] کتاب الخراج ص ۱۲۶ [۲] ایضاً ص ۱۴۴۔

اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو تو اس بارہ میں اس قدر اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ حضرت حذیفہؓ کو دجلہ کی ایک سمت میں اور حضرت عثمان بن حنیف کو دجلہ کی دوسری سمت میں خراج کی وصولیابی کے لئے روانہ فرمایا اور وہ خراج وصول کر کے واپس ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ شاید تم نے زمینوں سے ان کی طاقت سے زیادہ وصول کیا ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ جو ان کے پاس چھوڑا ہے اس کے مقابلہ میں یہ بہت ہی کم مقدار ہے اور حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ ان کے پاس اس سے دوگنا حصہ چھوڑ آیا ہوں حضرت عمرؓ نے یہ سن کر بھی معاملہ کی اہمیت کو اس طرح ظاہر فرمایا۔

اما واللہ لئن بقیت لادعن اھل	معلوم رہے بخدا اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق
العراق لا یحتاجون	کی بیواؤں کو ایسا کر چھوڑوں گا کہ میرے بعد کسی امیر کی
الی امیر بعدی الخ [1]	محتاج نہ ہیں۔

غرض اسلام اپنے معاشی نظام میں وظائف نے سسٹم کو مختلف شعبوں میں اس لئے قائم کرتا ہے کہ معاشی نظام کا جو حقیقی منشا ہے وہ بہ احسن طریق پورا ہو جائے اور اس کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ چنانچہ خلیفہ کے فرائض پر بحث کرتے ہوئے علماء اسلام نے اس حقیقت کو بار بار آشکارا کیا ہے۔ محلی ابن حزم کی عبارت گذشتہ صفحات میں نقل کی جا چکی ہے۔ اب مختصر مختار الکونین کی یہ عبارت قابل مطالعہ ہے:۔

ثم اعلم بانہ لابد للانسان من	یہ بات جان لینا چاہئے کہ انسان کی ضروریات زندگی
ثلثۃ اشیاء بلوازماتھا سواء	میں تین چیزیں لازمی ہیں، مرد ہو یا عورت سب کی
کان ذکراً او انثی لا یمکن حیاتہ	اس میں برابر ہیں اس لئے زندگی کی بقا عبادت
وفراغہ لعبادۃ ربہ وبقاء نسلہ	الٰہی کے لئے طمانیت اور بقائے نسل ان تینوں امور
الا بھا فیجب علی الامام ان	سے ہی وابستہ ہیں اس لئے امام (خلیفہ) کے ذمہ واجب ہے

[1] کتاب الخراج ص ۳۷۔

يتصل بتيسير الاشياء الثلاثة بكل
من الناس على حسب استعداده
وحاله سواء كان غنياً او فقيراً
او ذكراً او انثى اولها الطعام و
الشراب وهو سبب بحيوته
فلا يمكن حياته الا بها والثاني
اللباس سواء كان من القطن
والكتان والصوف او غيرها
الثالث التزويج لانها سبب بقاء
النسل الخ[1]

کہ وہ ہر انسان کے لئے خواہ وہ دولتمند ہو یا غریب اور فقیر
مرد ہو یا عورت اس کے حالات وضروریات کے پیش نظر
ان تین چیزوں کے حصول کے لئے ہر قسم کی آسانیاں بہم
پہنچائے (تاکہ ہر شخص اپنا معاشرتی ومعاشی حق پالے)
اور وہ تین چیزیں یہ ہیں اول کھانے پینے کی سہولت دوسری
لباس کی سہولت خواہ وہ صوف کا ہو یا کتان کا یا سوت
کا یا کسی بھی چیز کا ہو اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں انسانی
حیوٰۃ کے لئے ضروری ہیں اور تیسری ازدواجی زندگی کی
اس لئے کہ یہ بقائے نسل کے لئے ضروری چیز ہے

اور بدائع الصنائع میں نفقات کی بحث میں یہ تصریح موجود ہے کہ جس شخص کے ذمہ کسی غریب اور صاحب حاجت کا معاشی تکفل ضروری قرار دیا جائے گا تو اس تکفل میں ذمہ یہ چند چیزیں لازمی اور ضروری ہونگی۔

ويجب عليه المأكل والمشرب و
الملبس والسكنى والرضاع ان
كان رضيعاً لان وجوبها للكفاية
والكفاية متعلق بهذه الاشياء
فان كان للمنفق عليه خادم
يحتاج الى خدمته تفرض له

اور اس متکفل پر واجب ہے کہ وہ صاحب حاجت کے
کھانے پینے، لباس اور مکان کا تکفل کرے اور اگر صاحب حاجت
شیر خوار بچہ ہے تو اس کو دودھ پلانے کا بھی اسلئے کہ
اس معاشی کفالت کا وجوب صاحب حاجت کی حاجت
روائی کے لئے ہے اور حاجت روائی کے لئے یہ چیزیں
ضروری اور لازمی ہیں، اور اگر صاحب حاجت اپنی

[1] ص ۴۴ علمی مصنف نے یہ کتاب اپنے دور کے بادشاہوں کے مظالم سے متأثر ہو کر لکھی ہے اور مملکت سے متعلق اجتماعی مسائل پر یہ کتاب بے نظیر ہے

ایضاً لان ذلک من جملۃ الکفالۃ الخ۔ ؎	اہم ضرورت کی بنا پر کسی خادم کا محتاج ہے تو اس خادم کا نفقہ بھی متکفل کے ذمہ واجب ہے۔

وظائف کے سلسلہ میں اگرچہ چند شعبوں کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ "نظام معاشی" اس خاص تعداد کا پابند ہے بلکہ "خلیفۂ اسلام" کو حسب ضرورت ان میں اضافہ و بیشی کا مجاز ہے اور یہ حقیقت وہ شخص باآسانی سمجھ سکتا ہے جو دورِ رسالت اور خلفاءِ راشدین کے دورِ خلافت کی صحیح تاریخ کا حق آگاہ ہو۔

گذشتہ صفحات میں ایک مقام پر یہ ذکر آچکا ہے کہ وظائف کے تقرر میں "اسلام کے معاشی نظام" میں دماغی کاوش اور محنت کو باہم حریف بنا کر (BUSINESS) کے اصول کو مدنظر نہیں رکھا جاتا بلکہ "امام" کبھی عمل اور محنت میں فاضل و مفضول کا فرق کر کے وظائف کا تقرر کرتا ہے اور کبھی اس فرق کو بھی نظر انداز کر کے "مساوات کے اصول پر تقرر کر دیتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مساوات ہی کو "اسوہ" بنایا اور اعمال کی فضیلت کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب قلمروِ خلافت سے مالِ کثیر وصول ہوا تو صدیق اکبرؓ نے مستحقین میں برابر تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر بعض مسلمانوں نے عرض کیا، خلیفۂ رسول اللہ آپ نے اس تقسیم میں سب کو برابر کر دیا کاش کہ آپ "اہلِ سوابق و قدم" کو فضیلت دیکر دوسروں سے زیادہ دیتے۔ صدیق اکبرؓ نے یہ سن کر فرمایا۔

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذالک وانما ذلک شئی ثوابہ علی اللہ جل ثناوہٗ وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر	تم نے جو اہلِ سبقت و قدم اور اہلِ فضیلت کی سبقت اسلام اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو یہ تو مجھے تم سے زیادہ معلوم ہے مگر وہ تو ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جل ثناوہٗ کے پاس ہے اور یہ معاملہ معاش کا ہے

؎ بدائع الصنائع ج ۴ ص ۳۸۔ ؎ وہ مسلمان جنھوں نے اسلام میں سبقت کی اور جانی و مالی خدمات سب سے پہلے انجام دیں۔ جیسا کہ مجاہدین بدر۔

من اهل ثروة لها۔ سو اس میں تنگی کے مقابلہ میں مساوات ہی بہتر ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابتدائے دورِ خلافت میں "السابقون الاولون" کی سبقتِ اسلام اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے مجاہدینِ بدر اور غیر مجاہدینِ بدر جیسے فضائل کی بنا پر عطایا اور وظائف میں فرق جائز رکھا مگر آخری دورِ خلافت میں حضرت ابوبکرؓ ہی کی رائے کو مفید سمجھا اور اپنی سابق رائے سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا:

لئن عشت الی هذه اللیلة من قابل لالحقن اخری الناس باولاهم حتی یکونوا فی العطاء سواء الخ۔[1]

اگر میں آئندہ سال ان وظائف کے دنوں میں زندہ رہ گیا تو یقیناً سابقون الاولون اور بعد میں آنیوالوں کو سب کو ملادوں گا۔ اور عطیہ اور وظیفہ میں سب کو مساوی کردونگا۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ بھی صدیق اکبرؓ کی رائے کے مؤید تھے۔

وکذلک یروی عن علی التسویة ایضاً، وکلا الوجهین مذهب۔[2]

اور اسی طرح حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے بھی مساوات ہی منقول ہے۔ بہرحال دونوں طریقوں کے لئے راہِ سلوک موجود ہے۔

مگر اس جگہ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ "مساواتِ معاشی" کا یہ مسئلہ بیت المال یا خلیفۂ اسلام کے مقرر کردہ عطایا و وظائف سے متعلق ہے ذاتی ملکیت کے مسئلہ سے اسکا تعلق نہیں ہے وہ عنقریب اپنی تفصیلات کے ساتھ زیرِ بحث آنیوالا ہے۔

وظائف کے اس سلسلۂ عام کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ عمالِ حکومت اور اصحابِ حاجات کے علاوہ اگر وظائف و عطایا کا یہ انفرادی و شخصی سلسلہ اسی طرح قائم رکھا جائے جس طرح "اسلام کے معاشی نظام" میں زیرِ بحث آیا ہے تو ملک میں تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے اہم ذرائعِ معیشت صفر کے برابر ہو جائیں گے حالانکہ یہی ذرائعِ معیشت اقتصادی فلاح و ترقی کا

[1] کتاب الخراج ص ۴۳ و کتاب الاموال ص ۲۶۲ [2] کتاب الخراج ص ۴۶ و کتاب الاموال ۲۶۴ [3] کتاب الاموال ۲۶۴

مدار ہیں؟

بلاشبہ یہ سوال کافی اہمیت کا حامل اور قابلِ غور ہے چنانچہ مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں "سیاستِ مدنیۃ" پر بحث کرتے ہوئے اس بات کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک کے لئے بھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی قلمرو میں تجارت، صنعت و حرفت، اور مفید و جائز معاشی وسائل میں اضمحلال پیدا ہو جائے اور مملکت کی آبادی مفت خورانہ وظائف پر گذر اوقات بسر کرنے لگے۔ اور وہ یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ عام حالاتِ زندگی میں تمام قلمروِ اسلامی کا جہاد میں مصروف رہنا بھی ضروری نہیں ہے بلکہ ان میں تاجر، صناع، کاشتکار، سب ہی کا وجود ضروری ہے۔

او یکون توزعھم فی الاقبال علی الاکساب بحیث یضر بالمدینۃ مثل ان یقبل اکثرھم علی التجارۃ ویدعوا الزراعۃ او یکسب اکثرھم بالغزو ونحوہ وانما ینبغی ان یکون الزراع بمنزلۃ الطعام والصناع والتجار والحفظۃ بمنزلۃ الملح المصلح الخ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۴۴)

سیاستِ ملکی میں تقسیمِ کار اور مختلف منازلِ کسب و اکتساب کا ہونا ازبس ضروری ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ صورتِ حال یہ ہو کہ وہ سب ایسے کسبِ اکتساب کی جانب متوجہ ہو جائیں کہ آخر کار وہ ملک و شہر کے نقصان کا باعث بن جائے مثلاً ملک کی اکثریت زراعت کو چھوڑ بیٹھے اور صرف تجارت ہی کی جانب متوجہ ہو جائے (یعنی خام اجناس کے وسائل کے باوجود انکو پیدا نہ کیا جائے) یا اکثریت عزت غزوہ ہی میں مشغول ہو جائے اور تجارت اور صنعت و زراعت معدوم ہونے لگے، یا اسی طرح کسی ایک شغل میں ملک کی اکثریت مشغول ہو کر دوسرے ذرائع ترقی ملک کو کھو بیٹھے تو یہ سیاست مملکت کیلئے سخت مضر ہے بلکہ شہری باشندوں کو یہ سوچنا چاہیئے کہ اہلِ زراعت دنیوی حیات کے لئے بمنزلۂ طعام کے ہیں اور تاجر و صناع اور فوج و سپاہی گویا نمک برائے اصلاح طعام کی مثل ہیں۔

نیز انھوں نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مملکت کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ افرادِ ملّت ہاتھ کی کمائی اور ذاتی محنت کے ذریعہ تحصیل معاش کو چھوڑ کر اپنا بوجھ صرف "بیت المال" پر ڈالدیں اور اس کے حقیقی مصارف کے لئے باعث مصیبت بنجائیں "اگرچہ ان میں سے بعض افرادِ ملّت کا حق معیشت بیت المال سے ہی کیوں نہ متعلق ہو مثلاً مجاہدین اور علماء"

وغالب اسباب خراب البلدان فی هذا الزمان شیئان احدهما تضییقهم علی بیت المال بان یعتادوا التکسب بالاخذ منه علی انهم من الغزاة او من العلماء الذین لهم حق فیه او من الذین جرت عادة الملوك بصلتهم کالزهاد والشعراء او بوجه من وجوه التکدی ویکون العمدة عندهم هو التکسب دون القیام بالمصالح فیدخل علی قوم فیضیقون علیهم ویصیرون کلا علی المدینة الخ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۴)

اور اس زمانہ میں مملکتوں کی بربادی کا سبب غالب دو امور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بیت المال کے لئے یہ ضیق اور تنگ حالی کیا جائے یعنی ایسے افراد بھی اپنا تمام تر معیشت کا بار اس پر ڈالدیں جن کا واقعی بیت المال میں حق ہو جیسے مجاہدین اور علماء اور وہ افراد بھی جن کے لئے آج کل سے بادشاہوں نے داد و دہش کے خزانے کھول رکھے ہیں جیسے صوفی اور شاعر وغیرہ یا اسی قسم کے دوسرے مکدر اور غلط اسباب کی راہ سے بیت المال کو ذریعہ کیا جائے۔ درحقیقت ان کے دماغوں میں یہ بات آگئی ہے کہ بہترین ذریعہ معاش قوت بازو سے کمانا ہو نہ کہ اجتماعی مصالح کے قیام کی راہ سے صرف بیت المال کے روزینہ پر تکیہ کر بیٹھنا کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ مزاحمت کرتی ہے اور پھر آپس میں ایک دوسرے کیلئے مکدر اور معاش کی خرابی کا باعث بنتی ہے اور بالآخر حضارت اور مملکت کیلئے بار دوش ہو جاتی ہے۔

اور دوسری جگہ قابلِ ملامت تعیش پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایسے ملک کے باشندے معاش کے ان اصولی وسائل کو چھوڑ بیٹھتے ہیں جن پر نظامِ عالم کی بنیاد قائم ہے۔

وصار جمهور الناس عيالاً على الخليفة يتكففون منه تارة على انهم من الغزاة والمبرزين المدافعة يتوسمون برسومهم ولا يكون المقصود دفع الحاجة ولكن القيام بسيرة سلفهم وتارة على انهم شعراء جرت عادة الملوك بصلتهم وتارة على انهم زهاد وفقراء يصح من الخليفة ان لا يتفقد حالهم فيضيق بعضهم بعضا وتتوقف مكاسبهم على صحبة الملوك والرغبة بهم وحسن المحادثة معهم التملق منهم وكان ذلك هو الفن الذي تتعمق افكارهم فيه وتضيع اوقاتهم معه منها كثرت هذه الاشتغال شجر في نفوس الناس هيئات

اور باشندوں کی اکثریت خلیفہ کی عیال بنجاتی اور بیت المال پر بار ہوجاتی ہے اور کبھی وہ یہ کہکر وظیفہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ "غازی" ہیں اور ملک کے سیاسی رہنما ہیں اور اس وظیفہ طلبی میں ضروری حاجات کا دفع کرنا مقصد نہیں رہتا بلکہ باپ دادا کی رسم کو قائم رکھکر مفت خوری مقصد ہوجاتا ہے اور کبھی یہ کہکر وصول کرتے ہیں کہ وہ "درباری شاعر" ہیں اور بادشاہوں کی جانب سے شعرا پر داد و دہش ہوا ہی کرتی ہے اور کبھی یہ کہکر حاصل کرتے ہیں کہ وہ "صوفی اور درویش" ہیں اور خلیفہ انکے تفتیشِ حالات کو معیوب سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی ضیق اور تنگی کا باعث بنجاتے ہیں اور ان کا معاشی کسب و اکتساب صرف بادشاہوں کی مصاحبت ان کی خوشامد اور جی حضوری اور ان کی مدح میں چرب زبانی پر رہجاتا ہے اور آخرکار یہ ایسا فن بن جاتا ہے کہ ان کے تمام افکار اور دماغی خیالات اس بدترین فن پر صرف ہونے لگتے ہیں۔ اور تضیع اوقات کا باعث بنجاتے ہیں۔

بہرحال جب کسی قوم میں یہ اشتغال بڑھ جاتے ہیں تو لوگوں کے نفوس میں اخلاق اور رذیل افکار و خیالات

خسیسة واعرضوا عن	رونما ہونے لگتے ہیں اور پست خیالی اور دنائت
الاخلاق الصالحة[1]	ان کو اخلاقِ صالحہ سے باز رکھتی ہے۔

ان حوالجات کے مطالعہ کے بعد کیا ایک لحہ کے لئے بھی یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں "وظائف کا طریقہ" اس مذموم رسم و رواج کا حامی ہے جس کا ذکر سائل کے سوال میں کیا گیا ہے؛ نہیں ہرگز نہیں!

بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ چونکہ اس وقت "اسلام کے اقتصادی نظام" کے تمام خانوں میں جدا جدا رنگ بھرا جا رہا ہے اس لئے اس شبہ نے جگہ بنالی ورنہ جب تمام خانے اپنی اپنی جگہ فٹ ہوکر مکمل نقشہ سامنے آجائیگا تو اسکے بعد یہ سوال خود بخود حل ہو جائیگا۔

علاوہ ازیں وظائف کے تقرر کے وقت یہ سوال خود فاروق اعظمؓ سے ابوسفیانؓ نے اور حضرت فاروق اعظمؓ نے جو جواب دیا وہ باحسن وجہ اس شبہ کو حل کر دیتا ہے چنانچہ بلاذری نے فتوح البلدان میں وظائف و عطایا کی بحث میں اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے۔

فلما وضع عمر الديوان، قال	جب حضرت عمرؓ نے وظائف کے لئے رجسٹر تب
ابو سفيان بن حرب: اديوان	کرائے تو سفیان بن حربؓ نے عرض کیا "کیا آپ بھی روم کی
مثل ديوان الاصفر،	طرح وظائف کے لئے رجسٹروں کا یہ طریقہ جاری فرماتے
انك ان فرضت للناس	ہیں۔ اگر آپ نے اس طرح ان کے روزینے مقرر فرما دیے
اتكلوا على الديوان و	تو پھر یہ سب ان وظائف پر ہی بھروسہ کر بیٹھیں گے اور
تركوا التجارة: فقال عمرؓ	تجارت کو چھوڑ دینگے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میرے لئے
لا بد من هذا فقد كثر	ایسا کرنا اس لئے ضروری ہوا کہ "مال فی" کثرت سے
فى المسلمين۔[2]	بیت المال میں داخل ہو رہا ہے۔"

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۶ [2] طبقات ابن سعد قسم اول جلد ۳

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے اس مختصر سے اشارہ کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ ابوسفیان کا یہ سوال اساسی اور بنیادی سوال تھا جس کا حضرت عمرؓ نے بھی انکار نہیں فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ بیت المال سے متعلق ہمہ قسم کے مصارف کو پورا کیا جارہا ہے اور اس سلسلہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا مصرف بھی تشنہ تکمیل نہیں ہے تاہم بیت المال کا خزانہ "مال فئ" سے بہت پُر ہے تو اب میں اس کو اپنی ذات پر یا حکومت کے عمال پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں ہوں اور نہ اسکو بہت بڑا خزانہ بنانا چاہتا ہوں بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ فقراء غرباء، مساکین، یتامیٰ اور دوسرے اہل حاجات کے علاوہ افرادِ امت پر بھی اس کو خرچ کروں تاکہ اپنے کاروبار اور قوت بازو سے حاصل کردہ رقوم کے علاوہ اس ذریعے سے بھی ان میں زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوشحالی پیدا ہو جائے۔

ان جوابات کے ساتھ ساتھ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وظائف کا یہ سلسلہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ ملت کے تمام افراد ملت کے کل پرزے ہیں لہٰذا ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق ملت کی خدمت انجام دے اور ملت کا خزانہ "بیت المال" ان کی زندگی کا کفیل ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ اپنے دورِ خلافت میں اسی لئے اعلان کر دیا تھا کہ جب کہ مسلمانوں کو، ان کے اہل و عیال حتیٰ کہ ان کے غلاموں کو بھی حکومت سے وظائف مل رہے ہیں تو ان کو ہرگز ہرگز نہ زمینداری کی اجازت دی جائے گی اور نہ کاشتکاری کی۔

وسائلِ معیشت کی توسیع

"بیت المال کا قیام" "اعداد و شمار کا انتظام" "وظائف کا تقرر" ان تینوں عنوانات کے علاوہ چوتھا عنوان ——— جو براہِ راست حکومت کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے۔ "وسائلِ معیشت کی توسیع" ہے۔

علم المعیشت کی نگاہ میں معاش کے بنیادی وسائل زراعت، تجارت، اور صنعت و حرفت ہیں۔ اس لئے کہ علماء معاشین قدیم و جدید نے عاملین پیدائش کو، "جو کہ ترقی معیشت کی عمارت کے ستون ہیں" زمین، محنت اور اصل میں منحصر سمجھا ہے۔[1] زمین اور محنت تو معروف اور مشہور ہیں البتہ "اصل" کی وضاحت ضروری ہے۔

علم معیشت میں "اصل" اور "دولت" حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک ہی شئی کے دو نام ہیں۔ مگر طریق استعمال کے لحاظ سے دونوں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے اور دو علیحدہ چیزیں شمار ہونے لگتی ہیں۔ پس اگر ہم دولت کو عامل پیدائش بنائیں یعنی اس کو اس طرح کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ علم معیشت کی نگاہ میں "اصل" کہلاتی ہے اور اگر اس کو ثمرۂ پیدائش اور ما حصل سمجھیں اور اس طرح کو استعمال کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہوتی ہو تو اس کا نام دولت ہے مثلاً سکونت کا مکان "دولت" ہے اور اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جائے یا اس کو کرایہ پر دیا جائے تو وہ "اصل" بن جائے گا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی "اصل" کہلاتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی "دولت" ہے۔[2]

[1] علم المعیشت باب ۳ ص ۳۰ ۔ [2] ایضاً باب ۹ ص ۹۹

مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے معاشی نظریوں کی ان جدید کاوشوں کو ایک سادہ عبارت میں بیان فرما کر ان حقائق پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

واصول المکاسب الزرع والرعی والتقاط	زراعت، جانوروں کی پرورش، معدنیات
الاموال المباحۃ من البر والبحر من	نباتات اور حیوانات کا خشکی اور تری سے
المعادن والنبات والحیوان و	حاصل کیا جانا اور تجارتی، لوہاری، پارچہ بافی
الصناعات من نجارۃ وحدادۃ	وغیرہ کی صنعتیں یہ اور اسی قسم کی وہ تمام چیزیں
وحیاکۃ وغیرھا مما ھو من جعل	کہ جن کے طبعی جوہر سے انتفاع مطلوب حاصل
الجواھر الطبیعۃ بحیث یتاتی منھا	ہو سکے" اصول معاشیات کہلاتی ہیں۔
الارتفاق المطلوب الخ[1]	

اور یہ بھی بہت واضح بات ہے کہ ہر سہ عاملین پیدائش "زمین، محنت، اصل" کا تعلق کم و بیش فرق کے ساتھ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت، تینوں ہی کے ساتھ ہے چنانچہ علم معیشت میں اس حقیقت کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے۔

"یوں تو پیدائش دولت کے واسطے ہر سہ عاملین، زمین، محنت اور اصل کی شرکت لازمی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ شراکت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے اور صنعت و حرفت میں اصل کی کارگذاری خاص طور سے قابلِ لحاظ ہوتی ہے۔ محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے"[2]

ان تمہیدی سطور کے بعد یہ بات ... بآسانی ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ علمِ معیشت کے جدید فنی مسائل اور قدیم سادہ مسائل کے درمیان یہ بہر حال مسلّم ہے کہ معاشی وسائل کی بنیادیں "زراعت، تجارت اور صنعت" پر قائم ہیں اور انکی ترقی پر ہی معیشت کی فلاح و بہبود کا

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۴۳ باب المعاملات۔ [2] جو اشیاء اپنے جوہر طبیعت میں "باسباب ظاہر معیشت کے وجود و ترقی کا باعث بنتے ہیں" عاملین پیدائش "کہلاتے ہیں۔ (مصنف)

مدار ہے۔ لہٰذا "اسلام" نے اپنے معاشی نظام میں اگرچہ فنِ معیشت کی طرح مسائلِ معاشی میں کنج وکاؤ اور دقیق فنی مسائل کو اختیار نہیں کیا۔ مگر اس کاوش و تحقیق کے مقصد و منہاج کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسکی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے عملی حیثیت سے اپنے نظام میں نمایاں جگہ دی اور اس کو معاشی اساس قرار دیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھا کہ معاشی نظام کے بہتر اور صالح ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں ان وسائل معیشت کو نہ تو فاسد اور خراب ہونے دیا جائے کہ ان کے فساد و ضیاع سے معاشی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں اور نہ انکی ترقی و وسعت کا وہ پیمانہ اختیار کیا جائے کہ جس سے عام رفاہیت اور خوشحالی کی بجائے ایک خاص طبقہ کی مجرمانہ ترقی کو مدد ملے کہ اس سے نہ صرف معاشی نظام میں ابتری پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ تمدن و اخلاق، معیشت و معاشرت اور روحانیت تمام شعبہ ہائے زندگی کے فساد کا سبب بنجاتی ہے۔

بلکہ ان دونوں راہوں سے الگ ان کی وسعت و ترقی کا پیمانہ اس طرح تیار کیا جائے کہ اس سے انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں کو فائدہ پہنچے اور انفرادی ترقی، اجتماعی نشو و نما کا ایک جزء ثابت ہو تاکہ اجتماعی ترقی سے ہر فردِ ملت کو رفاہیت حاصل کرنیکا یکساں موقع حاصل ہو سکے چنانچہ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ (رحمہ اللہ) ارشاد فرماتے ہیں۔

وایضا لما کان الناس مدنیین	اور جبکہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے کہ ان کی معاشی
بالطبع لا تستقیم معایشھم الا	زندگی باہمی تعاون اور امداد باہمی کے بغیر مستقیم اور
بتعاون بینھم نزل القضاء	درست نہیں ہو سکتی تو خدائی فیصلہ یہ ٹھہرا کہ امداد باہمی کو
بایجاب التعاون وان لا یخلوا	واجب کر دیا جائے اور یہ کہ جس شخص کے ذریعہ بھی تمدن کو
احد منھم مما له دخل فی	فائدہ پہنچ سکتا ہو اسکو تمدنی زندگی سے علیحدہ نہ ہونا چاہئے
التمدن الا عند حاجة لا یجد	الا یہ کہ کسی خاص وجہ سے مجبوری پیش آجائے نیز معاشی
منھا بُدًّا، وایضا فاصل	وسائل کو وسیلہ بنانے کے لئے بنیادی سلسلہ یہ ہے کہ

التسبب حیازة الاموال المباحة واستنماء ما اختص به بما یستمد من الاموال المباحة کالتناسل بالرعی والزراعة باصلاح الارض وسقی الماء ویشترط فی ذلك ان لا یضیق بعضهم علی بعض بحیث یفضی الی فساد التمدن الخ [۱]

اموالِ مباح کو قبضہ میں کیا جائے یا اموالِ مباح میں سے جو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کے خصوصی جوہروں کے ذریعہ اموال مباح میں ترقی کی جائے مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل۔ آبپاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعہ زراعت وغیرہ اور اس باہمی تعاون سے حتی وسائل حل کریں یہ شرط لازمی ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصول ترقی ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی اور ضیق کا باعث نہ بن جائے کہ یہ نتیجہ نکلے کہ نظامِ تمدن فاسد اور خراب ہو کر رہ جائے۔

زراعت اللہ جل شانہ نے قرآنِ عزیز میں زرعی پیداوار کو انسانی دنیا پر عظیم الشان احسان جتا کر اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ طبعی وسائلِ معیشت میں "زراعت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (واقعہ)

بھلا بتاؤ تو تم جو کھیتی کرتے ہو اس کو تم پیداوار بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کردیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ بلاشبہ ہم پر تاوان ڈالا گیا۔ بلکہ ہم تو محروم رہ گئے۔

اور اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے زراعت کے فضائل میں گراں قدر ارشادات فرمائے ہیں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطلبوا الرزق فی خبایا الارض (رواہ البیہقی) [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رزق کو زمین کی پہنائیوں میں تلاش کرو۔

---

۱ حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۰۳ من ابواب ابتغاء الرزق۔ ۲ مجمع الزوائد بحوالہ منبع الفوائد ج ۴۔

امام سرخسی (رحمہ اللہ) اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یعنی عمل الزراعۃ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے زراعت و کاشتکاری مراد ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما من مسلم یغرس غرساً او یزرع زرعاً فیاکل منہ طیر او انسان او بھیمۃ الا کان لہ بہ صدقۃ (بخاری)[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان درخت بوتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس سے پرند، انسان اور جانور بھی خوراک حاصل کرتے ہیں تو یہ عمل اسکے حق میں صدقہ بنتا ہے یعنی اجر و ثواب کا باعث بنتا ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ "زراعت" ایسا عمل ہے کہ عامل کی نیت کے بغیر بھی اس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچتا ہے چنانچہ شیخ بدرالدین عینی اس کی شرح میں تصریح فرماتے ہیں۔

وفیہ حصول الاجر للغارس و الزارع وان لم یقصد اذلک حتی لو غرس وباعہ او زرع وباعہ کان لہ بذلک صدقۃ لتوسعۃ علی الناس فی اقواتھم الخ[2]

اور اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانیوالے اور کھیتی کرنیوالے کو اس عمل پر اجر و ثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو حتی کہ اگر اس نے درخت لگایا اور فروخت کر دیا اور کاشت کی اور اسکو فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائیگا اسلئے کہ اسکا یہ عمل مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

امام سرخسی فرماتے ہیں کہ تقرب الی اللہ کے علاوہ اس عمل کا کار خیر ہونا مسلم اور غیر مسلم دونوں کے حق میں یکساں ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے۔

عمروا بلادی تعاش فیھا عبادی۔ فلھذا قلنا ھذا الفعل حسن من کل احد الخ[3]

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری بستیوں کو آباد کرو تاکہ اسمیں میرے بندے زندگی بسر کر سکیں پس اسوجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل (زراعت) ہر کسی کے ہاتھوں بہتر عمل ہے۔

[1] کتاب المزارعۃ مسلم [2] عینی شرح بخاری ج ۵ ص ۱۰ م [3] مبسوط ج ۲۳ کتاب المزارعۃ

اور یہی سرخسیؒ نقل فرماتے ہیں کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام جرف میں زراعت کی ہے:۔

وازدرع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالجرف۔ ؎۱	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جرف میں خود کاشت کی ہے۔

آیتِ قرآنی اور ان صحیح روایات کے پیشِ نظر علماء اسلام کے سامنے یہ مسئلہ قابل توجہ رہا ہے کہ مسطورہ بالا معاشی وسائل میں سے کون سا وسیلہ دوسرے وسائل سے افضل اور اہم ہے چنانچہ ان ہی روایات کے تحت میں امام سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ بعض مشائخِ حنفیہ کا قول ہے کہ تجارت اور صنعت سے زراعت افضل ہے۔

ولهذا اقدام بعض مشائخنا رحمهم الله الزراعة على التجارة لانها اعم نفعا واكثر صدقة وفي الحديث رد على من يكره من المتعسفة الغرس والبناء الخ۔ ؎۲	اور انہی روایات کے پیش نظر ہمارے بعض مشائخ رحمہم اللہ زرعت کو تجارت سے افضل فرماتے ہیں اس لئے کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور عمل مبارک میں ان ریک خیال لوگوں کا رد ہے جو کاشتکاری اور فن تعمیر کو برا سمجھتے ہیں۔

لیکن شیخ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاری میں اس اختلاف رائے پر بحث کرتے ہوئے یہ بہترین فیصلہ دیا ہے کہ ان ہر سہ وسائل کی اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ اسلئے ہے کہ وہ مخلوق کی فلاح اور عام خوش حالی اور رفاہیت کا ذریعہ ہیں۔ لہذا جن ممالک کے طبعی ماحول یا حالات میں زراعت زیادہ مفید اور نفع بخش ہے وہ تجارت اور صنعت پر قابل ترجیح ہے اور جن ممالک کے واقعات و حالات میں تجارت یا صنعت عام رفاہیت کی کفیل ہیں تو بلاشبہ وہاں وہ لائقِ ترجیح ہیں غرض ان ہر سہ وسائل کے باہم راجح اور مرجوح کا سوال ملکوں کی طبعی حالت اور زمانہ کی ضروریات و حاجات کے پیش نظر ہے نہ کہ ذاتی فضیلت کے پیش نظر۔ شیخ صاحب کی اصل عبارت یہ ہے

؎۱ مبسوط ج ۲۳ ص ۲ ؎۲ ایضاً ج ۲۳ ص ۱۳۔

واذا كان كذلك فينبغي ان
يختلف الحال في ذلك
باختلاف حاجة الناس
فحيث كان الناس محتاجين
الى الاقوات اكثر كانت الزراعة
افضل للتوسعة على الناس
وحيث كانوا محتاجين الى
الى المتجر لانقطاع الطرق
كانت التجارة افضل وحيث
كانوا محتاجين الى الصنائع
اشد كانت الصناعة افضل
وهذا احسن الخ[1]

اور جب یہ بات متعین ہو گئی کہ ان وسائلِ معیشت
کی افضلیت کا منشاء نفع عام ہے تو پھر یہ ظاہر ہے
کہ لوگوں (اہل ملک) کی حاجات وضروریات کے
اختلاف سے ان کی باہمی افضلیت بھی مختلف ہوگی
پس جب باشندگان ملک خام اجناس کے زیادہ محتاج
ہوں تو زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کے لئے اس
کا نفع عام ہو۔ اگر کسی جگہ زراعت کے وسائل
مفقود ہوں تو وہاں تجارت کو برتری حاصل
رہے گی اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور
طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی
زیادہ حاجت ہے تو وہاں صنعت وحرفت کو فوقیت
ہوگی اور یہی فیصلہ بہتر اور خوب ہے۔

اور فیلسوفِ اسلام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ بنیادی معاشی وسائل میں سے "زراعت" کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ جس ملک میں اس کے وسائل موجود ہوں اس جگہ اگر اس سے بے اعتنائی برتی جائے تو اس ملک کی تمدنی حالت کبھی درست نہیں رہ سکتی اور اس کا فاسد اور برباد رہنا یقینی ہے اس لئے کہ خام اجناس کی پیداوار کے بغیر نہ تجارت چل سکتی ہے اور نہ صنعت وحرفت بروئے کار آسکتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

فانهم ان كان اكثرهم مكتسبين
بالصناعات وسياسة البلدة
والقليل مكتسبين بالرعي و

پس اگر باشندگان ملک کی اکثریت صنعت وحرفت
اور شہری سیاسیات ہی میں مصروف رہے اور
زراعت اور مویشیوں کی حفاظت اور پرورش کی

---

[1] عینی ج ۵ ص ۱۱۔

الی ذاتہ فسد حالھم فی الدنیا الخ له

جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیوی تمدنی زندگی فاسد اور خراب ہوجائیگی۔

اور آگے چل کر زراعت تجارت اور صنعت کو مدنی حیات کا اہم جزء قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی کو اختیار کرلیتی اور سرمایہ دارانہ سربلندیوں اور مسرفانہ رفاہیت میں باہمی مقابلہ کو معیار حیات بنالیتی ہیں تو وہ کبھی مدنی زندگی میں پھل پھول نہیں سکتیں اور انکی یہ غیر طبعی عیش کوشی انکو جلد ہی لے ڈوبتی ہے۔

فاذا اقبل جمہور عظیم منھم الی هذه الاکساب اهملوا امثالها من الزراعات والتجارات واذا انفق عظماء المدینة فیها الاموال اهملوا مثلها من مصالح المدینة وجر ذلک الی التضییق علی القائمین بالاکساب الضروریة کالزراع والتجار والصناع وتضاعفت الضرائب علیهم وذلک ضرر بهذه المدنیة یتعدی من عضو منها الی عضو حتی یعم الکل ویتجاری فیها کما یتجاری الکلب فی بدن المکلوب۔ له

پس جب باشندگانِ ملک کی بڑی اکثریت اس قسم کے غیر طبعی اور غیر مفید کسب اکتساب میں منہمک ہوجاتی ہے تو زراعت اور تجارت جیسے کسب ہنر کو چھوڑ بیٹھتی ہے اور جبکہ شہر کے رؤسا اور امراء ایسے غلط وسائل معیشت پر خرچ کرتے ہیں تو ایسے لوگ مدنی مصالح کو برباد کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ غلط انہماک ان لوگوں کی مصیبت کا باعث بنجاتا ہے جو اہم اور ضروری معاشی وسائل کی جانب مشغول ہیں مثلاً کاشتکار، تجار اور صناع نیز یہ فاسد انہماک ان پیشہ ور افراد پر بھاری ٹیکسوں کا باعث ہوجاتا ہے اور یہ مدنی زندگی کے لئے اس قدر نقصان دہ بنجاتا ہے کہ اعضاء جماعت کے ایک عضو سے متعدی ہوکر دوسرے عضو تک پہنچتا اور آہستہ آہستہ تمام اعضاء (افراد) جماعت میں داء الکلب دیوانگی کی طرح متعدی ہوجاتا ہے۔

له حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۰۶۔

اور علامہ عبد الرحمن جزائری فرماتے ہیں۔

اما الزرع فی ذاتہ سواء کان مشارکۃ اولا فھو فرض کفایۃ لاحتیاج الانسان والحیوان الیہ

لیکن زراعت، خواہ شرکت سے وجود میں آئے یا بغیر شرکت کے اپنی ذات میں فرض کفایہ ہے اس لئے کہ انسان اور حیوان سب ہی اس کے محتاج ہیں۔

مسطورہ بالا احوالجات سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ اسلام اپنے نظام معیشت میں وحدتِ عمومی کا کس درجہ قائل ہے اور اسکی کس درجہ یہ خواہش ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اور مملکتیں اگر اسلامی اقتدار اعلیٰ کو نہ بھی قبول کریں تب بھی ان معاشی وسائل میں ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوں اور معاشی دست برد کے ذریعہ ظلم کی راہ نہ کھولیں اور زراعتی ملک، تجارتی اور صنعتی ملکوں کے لئے اور تجارتی و صنعتی ممالک زراعتی ممالک کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوں نہ کہ باعثِ منافست و منازعت، اور وہ قومیں اور وہ ممالک تو بہت ہی خوش بخت ہیں جو خدائے برتر کی قدرتی فیاضیوں سے زراعتی بھی ہیں اور تجارتی اور صنعتی بھی۔ ایسے ممالک اگر صحیح جذبۂ حمیت اور نعمتِ حریت کے مالک ہوں تو نہ صرف یہ کہ وہ دوسروں کے غلام اور دست نگر نہ رہیں ان کو یہ بہترین موقع میسر ہے کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور معیشت کی عام افادیت میں پیش پیش رہ سکتے ہیں۔

اور یہ خیال پیدا نہ ہونا چاہئے کہ آج کی دنیا میں جبکہ بعض قومیں اپنے ملک میں زراعت کی قوی صلاحیت نہ ہونے کے باوجود تجارت اور صنعت و حرفت کے ذریعہ سے زراعتی ملکوں اور قوموں سے زیادہ خوشحال اور مدنی حیات میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی رہتی ہیں تو زراعتی اہمیت کہاں رہتی ہے۔

یہ خیال اسلئے صحیح نہیں ہے کہ جن قوموں کی جانب سائل کا اشارہ ہے ان کی مدنی اور معاشی ترقیات اس لئے نہیں ہیں کہ وہ تجارتی اور صنعتی ممالک کے باشندے ہیں بلکہ اس لئے ہیں کہ وہ انھوں نے اسلحہ کی طاقت سے زراعتی ملکوں کو غلام بنا کر اور ان کی تجارت و صنعت

کو مفلوج کر کے ان پر معاشی دست بُرد حاصل کر لی اور ظالمانہ دست بُرد کو ذلیل راہ بنالیا ہو مگر بقول شاہ ولی اللہؒ ایسا نظام اقتصادی دیرپا نہیں ہو سکتا اور اس کی بربادی پر قدرت کی مہر لگ جاتی ہے۔

پس جب تک "صحیح اور صالح معاشی نظام" کائنات کے لئے دلیل راہ نہیں بنے گا دنیا کی یہ باہمی دست برد اور فتنہ و حرب و ضرب برابر قائم رہیگا۔ اور صالح معاشی نظام کی جو اساس اسلام نے قائم کی ہو کائنات کے امن اور خوشحالی کے لئے اس سے بہتر نظام ناممکن ہے۔

ایک شبہ اور اس کا حل

گذشتہ اوراق میں آیات، صحیح روایات اور علماء اسلام کی تشریحات سے جبکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں بنیادی وسائلِ معیشت میں سے "زراعت" کو کافی اہمیت حاصل ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہو جو بخاری کتاب المزارعۃ میں حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے منقول ہے۔

اندرای سکۃً وشیئاً من آلۃ الحرث فقال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول فلا یدخل ھذا بیت قوم الا ادخلہ اللہ الذل۔	حضرت ابوامامہؓ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی کے بعض دوسرے آلات کو دیکھ کر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہو کہ جس گھر میں یہ آلات داخل ہو جاتے ہیں اس گھر میں اللہ تعالےٰ ذلت و مسکنت داخل کر دیتا ہے۔

اس حدیث سے تو زراعت "کے متعلق حقارت اور ذلت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ گویا زراعت پیشہ خدا کی دی ہوئی عزت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ یہ سوال اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے اور اسی لئے شروع ہی سے علماء اسلام اس کی صحیح توجیہ اور اسکا حقیقی مفہوم بیان کرتے رہے ہیں تاکہ زراعت کی اہمیت سے متعلق جو آیات اور صحیح روایات بکثرت وارد ہوئی ہیں انکے اور اس روایت کے درمیان خلاف باقی نہ رہے۔

چنانچہ امام محمدؒ اور انکے اتباع میں امام سرخسیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کا مفہوم یہ بیان

فرماتے ہیں۔

ظنوا ان المراد بالتزام الخراج وليس كذلك بل المراد ان المسلمين اذا استغلوا بالزراعة واتبعوا اذناب البقر وقعدوا عن الجهاد كر عليهم عدوهم فجعلوهم اذلة الخ ۔ ل	لوگوں نے اس حدیث سے یہ غلط مطلب سمجھ لیا کہ چونکہ اکثر غیر مسلموں کی زمینوں پر خراج لازم ہوتا ہے تو شاید اس وجہ سے زراعت ذلت کا باعث ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حدیث کی حقیقی مراد یہ ہے کہ "مسلمان" اگر زراعت کو زندگی کا مستقل مشغلہ بنالیں اور بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھریں اور "جہاد" جیسے اہم فریضہ سے غافل ہوجائیں تو ان کے دشمن ان پر حملہ آور ہوجائیں گے اور انکو ذلیل وخوار کر چھوڑینگے۔

گویا حدیث کہتی ہے کہ یہ مسلّم، کہ معاشی وسائل میں "زراعت" بہت اہم وسیلہ ہے لیکن یہی وسیلہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ذلت ورسوائی کا باعث بنجاتا ہے جبکہ مسلمان اس میں اس درجہ منہمک ہوجائیں کہ زندگی کے سب سے اہم مقصد "جہاد" کو چھوڑ بیٹھیں اور اس سے بے پرواہ ہوجائیں۔

امام بخاریؒ اور ابن حزمؒ نے بھی یہی توجیہ پسند فرمائی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ یہ ہیں۔

اعلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث بالخلافۃ العامۃ وغلبۃ دینہ علی سائر الادیان لا یتحقق الا بالجھاد واعداد الاتہ فاذا ترکوا الجھاد واتبعوا اذناب البقر احاط بھم الذل وغلب علیھم اھل سائر الادیان الخ ۔ ٢	یہ واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالمگیر انقلاب و اقتدار (خلافت عامہ) کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اور تمام مسخ شدہ ادیان پر انکے انقلابی دین کا غلبہ جہاد اور وسائل جہاد میں انہماک کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ پس اگر مسلمان جہاد کو چھوڑ بیٹھیں اور بیلوں اور گایوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھرنے لگیں تو اُن کو ہر چہار جانب سے ذلت ورسوائی گھیر لے گی اور تمام اہلِ ملل ان کو محکوم اور مغلوب بنالیں گے۔

ل مبسوط ج ۱۰ ص ۸۳ و ٢ حجۃ اللہ ج ٢ ص ۱۷۳ و المحلی ج ۸ ص ۲۱۱ ۔

اور محدث داؤدی اس حدیث کا مطلب سابق مفہوم کی مطابقت کے ساتھ کچھ محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد "عام" نہ تھا بلکہ آپ نے ایک خاص موقعہ پر دشمن سے قریب سرحدوں پر آباد مسلمانوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا۔ مگر روایت کی تعبیر نے اس کو عام کر دیا اور اصل حقیقت پوری طرح سامنے نہ آسکی داؤدی کی اصل عبارت یہ ہے۔

ھذا لمن یقرب من العدو فانہ اذا اشتغل بالحرث لا یشتغل بالفروسیۃ ویتاسد علیہ العدو واما غیرھم فالحرث محمود لھم وقال عز وجل "واعدوا لھم ما استطعتم" الآیۃ وھو لا تقوم الا بالزراعۃ ومن ھو بالثغور اوالمقاربۃ للعدو لا یشتغل بالحرث فعلی المسلمین ان یمدوھم بما یحتاجون الیہ الخ۔ لہ	یہ ارشاد نبوی اس جماعت کے لئے ہے جو دشمنوں کی سرحد کے قریب آباد ہو اسلئے اگر وہ کھیتی باڑی میں لگ جائے تو پھر غازیانہ فنون سے بے پرواہ ہو جائیگی اور دشمن اس پر غالب ہو جائیگا۔ لیکن ایسے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے زراعت کا کام پسندیدہ اور مرغوب ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "واعدوا لھم ما استطعتم" (اور تم تیاری کرو دشمنوں کے مقابلہ میں بقدر طاقت) اور ظاہر ہے کہ یہ زراعت کے بغیر ناممکن رہتی ہے کیونکہ جو لوگ سرحدوں پر اور دشمن کے قرب و جوار میں آباد ہیں وہ کاشت میں مشغول نہیں رہ سکتے پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ انکی ضروریات و حاجات کیلئے زراعت کے ذریعہ سے مدد دیں۔

مگر ان تمام توجیہات سے زیادہ بہتر توجیہ اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کی حقیقی روح وہ ہے جو مشہور محدث ابن تین نے بیان فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک زراعت سے متعلق اسلامی نقطہ نظر بیان نہیں کرتا بلکہ مستقبل میں ہونے والے ایک ایسے تکلیف دہ واقعہ کی جانب متنبہ کرتا ہے جو آج کی دنیا میں ارشاد گرامی

لہ عینی شرح بخاری ج ۵ ص ۱۲۷۔

کے مطابق بحرف بحرف صحیح نظر آرہا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت وحقانیت کا منادی ہے وہ یہ کہ دنیا کی تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ ظلم وجور کا شکار اس جماعت کو بنایا جائیگا جسکو کاشتکار کہا جاتا ہے اور سب سے زیادہ ذلت ورسوائی اور مسکنت سے انہی کو دوچار ہونا پڑیگا۔ ابن تین کے الفاظ یہ ہیں۔

ھذا من اخبارہ صلے اللہ علیہ وسلم بالمغیبات لان المشاھد الآن ان اکثر الظلم انما ھو علی اھل الحرث الخ۔	یہ ارشاد رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب کی اطلاعات (پیشنگوئیوں) میں سے ایک اطلاع ہے اسلئے کہ آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ سب سے زیادہ ظلم کا شکار وہی ہیں جو کھیتی باڑی کرنیوالے (کاشتکار) ہیں۔

یہ ابن تین کا مشاہدہ ہے جو تقریباً چھٹی صدی ہجری کا زمانہ ہے اور آج دنیا میں خام اجناس پیدا کرنے والے اور مدنیت کی ابتدائی بنیادوں کو استوار کرنیوالے اس طبقہ کاشتکار کی جو حالت ہے وہ ہمارا اور آپ کا مشاہدہ ہے تو کیا ایک حقیقت بیں نگاہ کے لئے یہ بات قابل غور نہیں ہے کہ جس نگاہِ وحی آگاہ نے بساط دنیا کے ان باریک اور دقیق نقوش تک کو خدا کی عطا کردہ روشنی میں دیکھ لیا ہو اس کا پیش کردہ "معاشی نظام" بلکہ انسانیت کا پورا نظام یقیناً افراط و تفریط سے پاک اور عام رفاہیت کا کفیل بن سکتا اور بلاشبہ وہی اخوت اور امن عام کا داعی ہو سکتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار؟

بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی اصل بحث تو یہ ہے کہ وسائل معیشت کی توسیع کے سلسلہ میں اسلام کے "معاشی نظام" نے زراعت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور وہ اس عمل کو معاشی وسائل کی بنیاد سمجھتا ہے اس لئے اس نے اسکی افزائش اور ترقی کے لئے جو ذرائع اختیار کئے ہیں وہ بلاشبہ علم معیشت کی نگاہ میں "حقیقی اور بنیادی ذرائع کہے جاسکتے ہیں۔

اسلام کے معاشی نظام کے عملی لائحۂ عمل کو اگر بغور دیکھا جائے تو آپ بلا تامل یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکی نگاہ میں "زراعت" کی ترقی کے لئے حسب ذیل امور بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

(۱) مالگذاری یا لگان کا کم ہونا (۲) کاشت کرنے والوں کے لئے خصوصی حقوق و مراعات دینا (۳) غیر مزروعہ اور بنجر زمینوں کو مزروعہ بنانے کے وسائل اختیار کرنا (۴) آبپاشی کے وسائل کو سہل اور وسیع بنانا۔

مالگذاری یا لگان

"زراعت" دو طرح عالم وجود میں آتی ہے ایک یہ کہ کوئی شخص زمین کو خود کاشت کرے اور دوسری یہ کہ اپنی زمین کو کسی قسم کے مبادلہ پر دوسرے کو کاشت کے لئے دیدے اور اس دوسری صورت میں کبھی صاحبِ زمین حکومت (اسٹیٹ) ہوتی ہے اور کبھی جماعت (پبلک) میں سے کوئی فردِ خاص[1]۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ زمین کی ملکیت افرادِ ملک ہی کے ہاتھوں میں رہے اور حکومت نے اس پر کوئی محصول مقرر کر دیا ہو پس حکومت یا فردِ جماعت اگر کسی کو ایک مقرر شرح پر کاشت کے لئے زمین دے تو اُس کو لگان کہا جاتا ہے اور اگر زمین پر سالانہ محصول لگایا جائے تو اس کو مالگذاری کہتے ہیں۔

"زراعت" کے اس طریق کار سے کسبِ معیشت میں دو اصناف باہم معاملہ کرتے نظر آتے ہیں، ایک کاشتکار، اور دوسرا زمیندار، دنیا کے نظامہائے حکومت میں ان دونوں میں سے عموماً کاشتکار کے ساتھ جو بے انصافیاں ہوتی رہی ہیں اور اس کو جس طرح مظالم کا شکار بنایا جاتا رہا ہے اور ان کی حیثیت محکوموں اور غلاموں کی طرح رہی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور اسی کا ردِ عمل آج طبقاتی جنگ کے نام پر کمیونزم کی شکل میں رونما ہے لیکن اسلام سب سے پہلے اسی مسئلہ کی جانب متوجہ ہوتا اور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جہاں تک زراعت اور کاشت کا تعلق ہے زمیندار اور کاشتکار دو برابر کے معاملہ دار ہیں اس لئے کہ ایک صاحبِ زمین اور مستاجر ہے اور دوسرا شریکِ عمل اور اجیر نہ کہ محکوم یا غلام۔ کیونکہ ایک جانب اگر دولت (زمین) ہے تو دوسری جانب دولت (بیج اور آلاتِ حرب) اور محنت دونوں ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک (زمیندار) حاکم اور آقا ہو اور دوسرا (کاشتکار) محکوم اور غلام۔

[1] زمینداری صرف حکومت کا حق ہے یا شخصی۔ اور انفرادی زمینداری بھی جائز ہے یہ مسئلہ زمین کے خصوصی احکام کی بحث میں آئیگا

اسلام کے اس نقطۂ نظر کا آپ صرف اس ایک واقعہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ غیر مسلم (ذمی) کاشتکار نے حضرت عمرؓ سے یہ شکایت کی کہ اسلامی فوج جبکہ ہمارے گاؤں سے پاس کرتی ہوئی جارہی تھی تو اس نے میری تمام کھیتی کو روند ڈالا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر بیت المال سے دس ہزار درہم بطور تاوان ادا کر دیئے۔

اتی عمر رجل فقال: یا امیر المؤمنین زرعت زرعاً فمر بہ جیش من اھل الشام فافسدہ قال فعوضہ عشرۃ آلاف۔ [1]

حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا امیر المؤمنین میں نے کاشت کی تھی۔ اتفاقاً اس جانب سے شام کا لشکر گذرا اور اس نے تمام کھیتی کو خراب کر ڈالا حضرت عمرؓ نے بیت المال سے دس ہزار درہم معاوضہ کے طور پر ادا کر دیئے۔

اہل خیبر کے یہود کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالگذاری کا جو معاملہ کیا اور جس کو اصطلاح میں "مخابرہ" کہا جاتا ہے اس سے پیدا شدہ مسئلہ "مزارعہ" کے جواز و عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے صاحبِ مبسوط نے امام ابوحنیفہؒ کی جانب سے "مخابرہ" کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ "یہود خیبر" مسلمانوں کے غلام نہیں تھے بلکہ آزاد تھے اور اسلامی حکومت کو زمین کا خراج ادا کرنے والے تھے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

وھذا اصح التاویلین فانہ لم ینقل عن احد من الولاۃ انہ تصرف فی رقابھم او رقاب اولادھم کالتصرف فی الممالیک الخ۔ [2]

اور ہر دو توجیہات میں سے یہ توجیہ بہت صحیح ہے اسلئے کہ والیوں میں سے کسی والی سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے ان یہودیوں کی ذات پر یا اُن کی اولاد پر اس قسم کا تصرف کیا ہو جیسا کہ غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی نقول موجود ہیں جو اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اسلام کے

---

[1] کتاب الخراج باب تقبیل السواد ص ۱۱۹۔ [2] مبسوط ج ۲۳ ص ۳۔

معاشی انظام میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کے بغیر خراج (مالگذاری) کے تقرر میں بھی خلیفہ کے ہر وقت پیشِ نظر رہے کہ مفتوح ہو جانے کے باوجود صاحبِ زمین اور کاشتکار حکومت کے محکوم یا غلام نہیں ہیں بلکہ صرف کاشتکار یا مال گذار ہیں بس جب کہ ایسی صورت میں "کہ وہ تمام علاقے اسلامی حکومت کے مفتوحہ علاقے ہیں"۔ ان علاقوں کے خراج گذاروں کے ساتھ اسلام کا یہ طرزِ عمل ہے تو کاشت کے باقی دوسرے عام طریقوں میں تو اس نظام میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ صورت نہیں بن سکتی۔ کہ کاشتکار، زمیندار کا محکوم یا غلام ہے۔ بلکہ بلاشبہ وہ مستاجر ہے جو حکومت (اسٹیٹ) یا کسی فردِ خاص کی زمین کو بطور اجارہ کے لیتا ہے اور یا شریک معاملہ ہے اور ایک شریک کی طرح حصہ دار ہے چنانچہ "مزارعہ" (بٹائی) کی بحث میں فقہاءِ اسلام نے تصریح کی ہے کہ اس شکلِ خاص میں کاشتکار اور زمیندار معاملۂ کاشت میں دو برابر کے شریک ہیں اور اسلامی قانون ان دونوں کو اسی حیثیت میں رکھتا ہے تاکہ اگر ان دونوں کے باہم کبھی مناقشہ پیدا ہو تو اُن کے معاملہ کو اسی اصول کے پیشِ نظر طے کیا جائے فقہِ حنفی کی مشہور و مستند کتاب بدائع الصنائع میں ہے۔

کان المزارعۃ فیہا الاجارۃ	اسلئے کہ مزارعۃ (بٹائی یا معاملہ کاشت) میں اجارہ اور شرکت
والشرکۃ تنعقد اجارۃ	دونوں معنی پائے جاتے ہیں یہ ابتداءِ معاملہ میں اجارہ ہوتا
ثم تتم شرکۃ الخ۔ ؎۱	ہے اور نتیجہ میں جاکر شرکت کا معاملہ بنجاتا ہے۔

اور امام ابو یوسفؒ مزارعۃ کے جواز و عدم جواز پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وکذلک الارض	جس طرح مضاربت درست ہے یعنی ایک شخص کا مال ہو اور دوسرے
عندی ھی بمنزلۃ	کی محنت اور دونوں نفع کے شریک، اسی طرح میرے نزدیک
مال المضاربۃ الخ	زمین بھی مال مضاربۃ ہے کہ ایک صاحب زمین ہے اور دوسرا محنت
؎۲	اور دونوں نفع میں شریک خواہ مزارعۃ کا معاملہ ہو یا اجارہ کا۔

؎۱ ج ۶ ص ۱۷۷ ؎۲ کتاب الخراج ص ۸۸

اور امام نسائی، محمد بن سیرین مشہور جلیل القدر تابعی کا یہ قول نقل فرماتے ہیں۔

روی النسائی من طریق ابن عون	محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ میرے نزدیک
قال: کان محمد یعنی ابن سیرین	زمین کی حیثیت مال مضاربۃ کی سی ہے
یقول: الارض عندی مثل مال المضاربۃ	جس قسم کے معاملات وہاں درست ہیں
فما صلح فی مال المضاربۃ صلح فی الارض	یہاں بھی جائز ہیں اور جو وہاں ناجائز ہیں
وما لم یصلح فی مال المضاربۃ لم یصلح فی الارض[1]	وہ یہاں بھی نادرست ہیں۔

یعنی زمین کا معاملہ نقد لگان پر ہو یا بٹائی پر، ہر حالت میں ایسا معاملہ ہے جیسا کہ تجارتی معاملات میں "مضاربۃ" کا اور "مضاربۃ" کے متعلق تمام علمائے اسلام متفق ہیں کہ تجارت کی یہ شکل "باہمی تعاون واشتراک کی" بہترین شکل ہے اور یہ کہ اس معاملہ میں جانبین ایک دوسرے کے شریک معاملہ ہوتے ہیں نہ کہ حاکم ومحکوم یا آقا اور غلام حتیٰ کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت اسلامی کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ آزاد ذمیوں کے ساتھ غلام اور محکوم کا سا معاملہ کرے۔
چنانچہ یہ واقعہ اس حقیقت کے لئے زندہ شہادت ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) گورنر مصر کے صاحبزادے نے ایک مصری (قبطی ذمی) کو کسی بات پر چند کوڑے مار دیئے تو اس نے دربار فاروقی میں جا کر شکایت کی، فاروق اعظمؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے صاحبزادہ کو دار الخلافہ میں طلب کیا اور قبطی مصری سے ان کے مواجہہ میں بات چیت کی اور جب جرم ثابت ہو گیا تو فاروق اعظمؓ نے قبطی مصری کو حکم دیا کہ تو عمروؓ کے بیٹے کے اسی قدر کوڑے لگا، تاکہ اس کی شیخی کا نشہ کرکرا ہو جائے اور پھر حضرت عمرو بن العاصؓ کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے عمروؓ۔

مذ کم تعبدتم الناس وقد	تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے حالانکہ ان کی
ولدتھم امھاتھم احرارا	ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے عمروؓ بن العاص نے عرض کیا

[1] نسائی باب المزارعۃ

قال یا امیر المومنین الم اعلم ولم یاتنی الموبذ — امیر المومنین! مجھے اس واقعہ کا علم ہی نہ ہو سکا اور نہ اس شخص نے میرے پاس آکر اس کی اطلاع کی۔

تخفیفِ مالگذاری و لگان۔ مسئلہ "زراعت" میں اس بنیادی نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھنے کے بعد اب تخفیفِ لگان اور مالگذاری کی بحث کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

دنیا کے معاشی نظام میں مالگذاری اور لگان کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک پیداوار میں سے حصہ مقرر کرنا اور دوسری صورت نقد لگان قائم کر دینا، اسلام کے معاشی نظام میں بھی یہی دونوں قدرتی صورتیں رائج ہیں۔ پس حکومت کے عائد کردہ لگان اور اس کی قائم کردہ مالگذاری اور افرادِ امت کے درمیان زمینداری اور کاشتکاری سے پیدا شدہ لگان کی تفصیلات حسب ذیل صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔

اگر زمین "افرادِ ملک کی ذاتی مملوکہ ہے اور حکومت اُن سے اجتماعی حق "سالانہ محصول" لیتی ہے تو اس صورت میں وہ زمین یا عشری ہوگی یا خراجی۔ اگر زمین عشری" ہے تو اس کی ہر پیداوار پر "عشر" (دسواں حصہ پیداوار) لیا جائیگا جو کہ سال میں دو یا تین مرتبہ تک ہو سکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ۔ اور اگر خراجی" ہے تو اس سے سال میں صرف ایک مرتبہ مقررہ مالگذاری لی جائیگی خواہ پیداوار سال میں دو مرتبہ ہو یا تین مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ۔[۲]

اگر خراجی زمین کو مسلمان خرید لے تو اس زمین پر خراج ہی قائم رہیگا۔ اور وہ عشری زمین نہیں بن سکتی اور اگر عشری زمین کو ذمی یا مستامن (غیر مسلم) خرید لے تو وہ خراجی ہو جائیگی اسلئے کہ غیر مسلم پر عشر (زکوٰۃ) واجب نہیں ہے اور اگر زمین کی مالک حکومت (اسٹیٹ) ہے اور وہ اجارہ پر کاشت کراتی ہے یا کسی فرد خاص کی ملکیت ہے اور وہ دوسرے کسی شخص سے اجارہ پر کاشت کراتا ہے پس اگر نقد لگان پر زمین کو دیا ہے تو وہ سال میں ایک ہی مرتبہ لیا جائیگا اور اسکو "اجارہ یا استکراء الارض"

---

[۱] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۲۔ [۲] یہ خراج موظف کہلاتا ہے اور اگر بٹائی پر امام نے معاملہ کیا ہے جیسا کہ خیبر میں ہوا تو اسکو خراج مقاسمہ کہتے ہیں (مصنف)

کہتے ہیں اور اگر بٹائی پر دیا جائے تو وہ پیداوار کے ساتھ مربوط رہے گا اور اس کو "مزارعۃ" کہا جاتا ہے اور اگر باغ کی پیداوار کا معاملہ ہے تو اس کو "مساقاۃ" کہتے ہیں۔

زراعت کی ان تمام صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ہو اسلام کے معاشی نظام میں مسلم اور کافر کی تفریق کے بغیر یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اکثر حالات میں "کاشتکار" کی مصالح کو زمیندار اور حکومت کی مصالح پر مقدم رکھا جائے اور "عشر" کے علاوہ جو کہ پیداوار کی منصوص زکوٰۃ ہے "ہر قسم کے لگان اور مالگذاری میں کاشتکار کی سہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے "تخفیفِ لگان" کو اسوہ بنایا جائے اور یہ تو کسی حال میں بھی جائز نہیں سمجھا گیا کہ لگان یا مالگذاری کی شرح زمین کی حیثیت سے بڑھ کر مقرر کر دی جائے اور ایسا کرنے کو وہ "ظلم و عدوان" سمجھتا ہے۔

تخفیفِ لگان اور کاشتکار کی سہولت، اسلام کے معاشی نظام میں کیا اہمیت رکھتی ہے ذیل کے احکام و واقعات اس کا مفصل جواب دے سکتے ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد یہود خیبر سے مخابرہ کا معاملہ کر کے ان کی زمینوں کو ان ہی کی ملکیت میں چھوڑ دیا۔ اور جب پیداوار کے وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ کو وصول یابی کے لئے بھیجا تو انھوں نے یہود سے صاف لفظوں میں یہ فرمایا۔

لم یبعثنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لآکل اموالکم وانما بعثنی لاقسم بینکم وبینہم ثم قال: ان شئتم عملت فی علیکم وکلت لکم النصف وان شئتم عملتم و عالجتم وکلتم النصف فقالوا: بہذا

مجھے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلئے نہیں بھیجا کہ میں تمہارے مال (پیداوار) کو ناحق ہضم کر جاؤں بلکہ اسلئے بھیجا ہے کہ تمہارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ کے مطابق پیداوار کو تقسیم کروں اور تمکو پورا اختیار ہے کہ اگر پسند کرتے ہو کہ میں عملداری کر کے اسکا تخمینہ کر دوں اور نصف نصف بانٹ دوں تو میں حاضر ہوں اور اگر یہ بہتر سمجھتے ہو کہ خود عملداری کر کے تمکو میرے نصف نصف کر دو تو مجھے یہ بھی منظور ہے یہ سنکر یہودی کاشتکار

قامت السّموات والارض [1]

کہنے لگے کہ یہی وہ عدل و انصاف ہے جس کی وجہ سے زمین و آسمان قائم ہیں۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ بن الیمان کو دجلہ کی اور حضرت عثمان بن حنیف کو فرات کے کنارہ کی زمینوں پر خراج وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا، جب وہ واپس آئے اور خراج کی معقول رقم پیش کی تو حضرت عمرؓ نے اسکو مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا۔

کیف وضعتما علی الارض لعلکما کلفتما اھل عملکما مالا یطیقون [2]

تم نے زمین پر خراج کس مقدار سے مقرر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کاشتکاروں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

لعلکما حملتما علی الارض مالا تطیق [3]

شاید تم نے زمین کی حیثیت سے زیادہ خراج وصول کیا ہے

یہ سن کر حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا۔

لقد ترکت فضلاً (او) وضعت علیھا امراً ھی لہ محتملۃ وما فیھا کثیر فضل [4]

میں نے انکے لئے بہت زیادہ چھوڑا ہے (یا فرمایا) میں نے زمین سے مناسب لگان وصول کیا ہے اور جس قدر اس میں چھوڑ آیا ہوں وہ بہت زیادہ ہے۔

اسکے باوجود حضرت عمرؓ نے خراج کے تقرر میں زیادہ سے زیادہ تخفیفِ لگان کو پیش نظر رکھنے کی تنبیہ فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

انظرا لا تکونا حملتما الارض مالا تطیق اما لئن بقیت لادعن اھل العراق لا یحتجن الی احد بعدی [5]

خراج مقرر کرتے یا وصول کرتے وقت خوب دیکھ بھال کر لیا کرو کہ کہیں "لگان" زمین کی حیثیت سے زیادہ تو نہیں ہو گیا اگر میں زندہ رہ گیا تو اہل عراق کی بیواؤں کو ایسا متموّل کر دونگا کہ میرے بعد پھر وہ کسی ایک کی محتاج نہ رہیں گی

[1] کتاب الخراج ص ۵۰ [2] ص ۳۶ [3] ص ۳۷ [4] ص ۳۷ [5] ص ۳۷

حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس جب عراق کا خراج وصول ہو کر آتا تو عراق کے متمدن شہروں کوفہ اور بصرہ سے دس دس آدمیوں کا وفد بلاتے اور وہ چار مرتبہ قسمیں کھا کر یہ شہادت دیتے کہ ہم سے جو کچھ وصول کیا گیا ہے بغیر کسی ظلم کے برضا و رغبت وصول کیا گیا ہے اس میں نہ کسی مسلمان پر ظلم ہوا ہے اور نہ کسی معاہد (ذمی) پر[1]

امام ابو یوسفؒ ان ہی روایات کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں۔

ثم تکون المقاسمات فی اثمار ذلک او یقوم ذلک قیمة عادلة لا یکون فیها حمل علی اهل الخراج ولا یکون علی السلطان ضرر ثم یوخذ منهم ما یلزمهم من ذلک، ای ذلک کان اخف علی اهل الخراج فعل ذلک بهم الخ[2]

پھر ان کے پھلوں کو بانٹ لیا جائے یا انکی قیمت انصاف کے ساتھ اس طرح لگائی جائے کہ وہ اہل خراج پر بوجھ نہ ہو جائے اور نہ حکومت ہی کو نقصان پہنچے، پھر ان کے ذمہ اس طرح جو لازم آئے وہ ان سے لیا جائے مگر یہ پیش نظر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہی صورت اختیار کی جائے جو اہل خراج کے لئے سہل اور آسان ہو۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

فخذہ فی رفق وتسکین لاهل الارض[3]

اور تم خراج اس طرح لو کہ اہل زمین (کاشتکار) کو اس کے دینے میں آسانی، نرمی اور تسکین رہے۔

اور ایک جگہ خراج (مالگذاری) کے بارہ میں حضرت عمرؓ کا طریقۂ وصول بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

فلم نحملهم ما لا یطیقون ولم نلخذهم من الخراج الا بما تحتمل ارضهم الخ[4]

پس ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ محاصل مقرر نہیں کریں گے اور نہ ان کی اراضی کی حیثیت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالیں گے۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۲۳ باب السواد [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۸۶ [4] کتاب الخراج ص ۴۲۔

اور عدمِ طاقت کے متعلق بحر الرائق میں یہ تصریح موجود ہے۔

وقالوا ونهاية الطاقة ان يبلغ الواجب نصف الخارج لا يزاد عليه والتنصيف عين الانصاف۔ لہ	فقہا فرماتے ہیں کہ طاقت و برداشت کی آخری حد یہ ہے کہ خراج (لگان) پیداوار سے نصف ہو اور اس سے بڑھانا جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تنصیف ہی انصاف ہے"۔
واما اذا اراد الامام توظيف الخراج على ارض ابتداءً وزاد على وظيفة عمرؓ فانه لا يجوز عند ابي حنيفة وهو الصحيح لان عمرؓ لم يزد لما اخبر بزيادة الطاقة۔ لہ	لیکن جب امام کسی زمین پر ابتداءً خراج لگائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حضرت عمرؓ کی مقدار سے زیادہ لگانا جائز نہیں اور یہی صحیح ہے اسلئے کہ اہلِ خراج کے زیادہ طاقت رکھنے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خراج نہیں بڑھایا۔

عراق فتح کر لینے کے بعد باشندگانِ ملک کو حضرت عمرؓ نے زمینوں کی کاشت سپرد کرتے ہوئے جس نسبت سے سالانہ مالگذاری مقرر فرمائی وہ ان تمام اقوال و احکام کے لئے جو سطورِ بالا میں تخفیفِ لگان سے متعلق بیان ہوئے ہیں" عملی شہادت ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت عثمان بن حنیف سے "جو کہ پیمائش کے ماہر تھے" عراق کی پیمائش کرائی تو پہاڑ، جنگل اور نہروں کو چھوڑ کر قابلِ زراعت زمین کا کل رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب قرار پایا، ان میں سے شاہی، جاگیروں، آتشکدوں کے اوقاف، لاوارثوں، مفروروں اور باغیوں کی جائدادوں، دریا برد زمینوں، شاہراہوں اور ڈاک کے مصارف کی زمینوں اور جنگل کو خالصہ قرار دیکر رفاہِ عام کے لئے وقف کر دیا جس کا تخمینہ ستر لاکھ درہم سالانہ ہوتا تھا اور باقی تمام زمینوں کو مالکانِ ملک کی ملکیت تسلیم کر کے ان پر حسب ذیل معمولی لگان مقرر فرما دیا۔

لہ سہ بحر الرائق ص ۱۱۶/۱۱۷۔

گیہوں	فی جریب	(سواد دبیگہ خام)	پون بیگہ پختہ	۲ درہم	تقریباً ۸ ر
جو	″	″	″	۱ ″	″ ۴ ر
نیشکر	″	″	″	۶ ″	″ [illegible]
روئی	″	″	″	۵ ″	″ [illegible]
انگور	″	″	″	۱۰ ″	″ [illegible]
کھجور	″	″	″	۱۰ ″	″ [illegible]
تل	″	″	″	۸ ″	″ [illegible]
ترکاری	″	″	″	۳ ″	″ ۱۲ ر

اور عمدہ پیداوار اور عمدہ زمینوں کے عتبار سے کسی کسی جگہ گیہوں پر فی جریب چار درہم اور جو پر دو درہم (۸ر) لگان مقرر ہوا۔ اس انتہائی نرمی اور سہولت کے باوجود فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں عراق کا خراج آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ درہم (دو کروڑ پندرہ لاکھ روپیہ) وصول ہوا تھا)

مصر کی حالت پیداوار نیل کے سبب سے چونکہ بہت عمدہ رہتی ہے اس لئے وہاں کے لگان کی شرح اس سے زیادہ مقرر کی گئی تھی۔ مگر اس اصول کے ساتھ کہ لگان کم سے کم ہو زیادہ سے زیادہ نہ ہو اور چونکہ نیل کی طغیانی و عدم طغیانی سے سالانہ پیداوار میں فرق پڑتا تھا۔ اسلئے ہر سال جب ادائگی قسط کا وقت آتا تھا۔ تو مقامی زمیندار، مکھیا، کاشتکار اور ماہرین تخمینہ کو جمع کر کے سب کے مشورے سے تخمینہ کرایا جاتا تھا اور پھر بھی اطمینان نہ ہوتا تھا تو فاروق اعظمؓ وصول کرنے والوں سے حلف اور قسمیں لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی سختی تو نہیں کی کہ جس میں کاشتکاروں اور لگان و مالگذاری دینے والوں پر ظلم ہوا ہو۔" اور اس کے بعد مصر کے کاشتکاروں اور زمینداروں سے اس کی تصدیق کی جاتی تھی

مصر میں فراعنہ کے زمانہ میں مالگذاری کے حسب ذیل اصول مقرر تھے۔

لہ کتاب الخراج ص ۳۶ تا ۳۸۔

(۱) خراج، نقد اور پیداوار دونوں شکل میں لیا جا سکتا ہے۔

(۲) چند سالوں کی پیداوار کا اوسط نکال کر اس کے لحاظ سے جمع بندی کی تشخیص کی جائے۔

(۳) بندوبست چار سالہ ہو۔

رومیوں نے جب مصر پر قبضہ کیا تو دو باتوں کا اور اضافہ کیا۔

(۴) خراج، مالگذاری یا لگان کے علاوہ غلہ کی ایک بہت بڑی مقدار پایہ تخت قسطنطنیہ کے لئے وصول کی جائے۔

(۵) فوج کی رسد کے لئے غلہ یہیں سے لیا جائے۔

حضرت عمرؓ نے ان پانچوں اصول میں انصاف کے پیش نظر ترمیم و اصلاح کی اور حسب ذیل قاعدے مقرر کر دیئے۔

(۱) خراج، نقد و پیداوار دونوں شکلوں میں وصول ہو سکتا ہے مگر اس میں لگان دینے والے کی سہولت کا لحاظ ضروری ہوگا۔

(۲) تشخیص کا مسطورہ بالا قاعدہ مقرر کرنا اور چند سالوں کا اوسط نکال کر جمع کرنا کاشتکاروں کی معاشرتی زندگی کے اعتبار سے سخت ظلم ہے بلکہ تشخیصِ لگان، زمین کی حیثیت اور پیداوار کی نوعیت کے پیش نظر تراضیِ طرفین سے ہونی چاہئے۔

(۳) بندوبست کے متعلق کوئی خاص وقت مقرر کرنا نہ حکومت کو مفید ہے اور نہ رعایا کو بلکہ حسب موقعہ کاشتکاروں اور مالکانِ زمین کی سہولت کا لحاظ کر کے کیا جاوے۔

(۴ و ۵) لگان کے علاوہ کچھ اور وصول کرنا نہایت ظلم ہے۔ لہٰذا رومیوں کے دونوں قاعدوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

حتیٰ کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حرمین کو جو غلہ بھیجا جاتا تھا اس کی قیمت "حکومت" پائی پائی اپنے پاس سے ادا کرتی تھی[۱]

[۱] کتاب الخطط للمقریزی ص ۷۵ تا ۷۹۔

خراج اور عشر کا امتیاز

اگرچہ یہاں یہ بحث خارج از مقصد ہے کہ مسلمانوں کی زمینوں پر "عشر" زکوٰۃ کیوں ہے اور غیر مسلموں کی زمینوں پر "خراج" کیوں، اس لئے کہ یہ بحث اسلام کے نظامِ مملکت کے تحت ہی قابلِ ذکر ہے اور الفاروق حصہ دوم "ذمی رعایا کے حقوق" میں مفصل اور بہت خوبی سے علامہ شبلی مرحوم نے بیان کی ہے جو قابلِ مراجعت ہے۔

تاہم اس قدر واضح کر دینا ضروری ہے کہ عشر خراج کے مقابلہ میں زیادہ گراں ٹیکس ہے اور اس اعتبار سے مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر مسلم زیادہ فائدہ میں ہیں مثلاً:۔

(۱) عشر پیداوار کا دسواں حصہ ایک مقرر شدہ فرض ہے جس میں کمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن خراج کی گذشتہ تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ زمین کی پیداوار کا کم سے کم ٹیکس ہے اور اس کمی کے اصول کے پیشِ نظر طرفین کی رضامندی سے حادثات کی صورت میں ترمیم کی لچک بھی رکھتا ہے

(۲) عشر سال کی مختلف فصلوں میں ہر پیداوار کے وقت لازم ہے مگر خراجِ موظف سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جاتا ہے۔

(۳) عشر پیداوار کی حالت میں کسی صورت میں معاف نہیں ہو سکتا۔ اور خراج خلیفۂ اسلام کی صوابدید پر معاف بھی ہو سکتا ہے[۱]

ان مذکورہ بالا امور کے پیشِ نظر انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ "عشر" جو درحقیقت مذہبِ اسلام کے قانونِ زکوٰۃ کا ایک جزء ہے صرف ان ہی پر نافذ ہو جو "مسلمان" کہلائے جاتے ہیں۔ لیکن جو اسلام کے عقیدہ (کریڈ) کو تسلیم نہیں کرتے ان پر اس قسم کی مذہبی پابندی عائد کرنا بلاشبہ ظلم ہوتا۔

علاوہ ازیں اگر بعض خصوصی حالات میں "خراج" کی مقدار عشر سے زیادہ بھی نظر آئے تو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ مسلمان عشر اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد بھی ٹیکسوں سے بری نہیں ہو سکتا اور اسلامی قانون کی رو سے حسبِ ضرورت اس کو فوجی ضروریات رفاہِ عام

[۱] کتاب الخراج ص ۸۶ باب نقصان الصدقۃ و زیادتہا و ضیاعہا۔

کی ضروریات، حوادث سے پیدا شدہ ضروریات کے لئے ٹیکس ادا کرنا ضروری ہے مگر اس کے برعکس "غیر مسلم جماعت" جو کہ اسلام کے عقیدہ داصول کو نہ مانتے ہوئے اسکے اقتدار اعلےٰ کے نیچے رہنا منظور کر لیتی ہے "خراج" اور "جزیہ" کے بہت ہی معمولی ٹیکس ادا کرنے کے بعد ہر قسم کے ٹیکسوں سے سبکدوش ہو جاتی ہے اور پھر تمام اقتصادی امور میں مسلم وغیر مسلم کے درمیان مساوات کا اعلان ہو جاتا ہے اور اسلامی قانون کی رو سے جان، مال آبرو اور دنیوی ترقیات میں دونوں کے درمیان فاتح و مفتوح کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

یہ تمام حوالجات حکومت کی عائد کردہ مالگذاری (خراج) کے متعلق تھے لیکن اجارہ اور مزارعۃ کا وہ معاملہ جو کہ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان ہی۔ حکومت اور رعایا کے درمیان معاملات کا سا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں دونوں معاملہ دار (متعاقدین) برابر کی حیثیت میں ہیں تو ایسی حالت میں اسلام کا معاشی نظام زمیندار کو ہرگز کاشتکار پر ترجیح نہیں دیتا بلکہ اس امر کے پیش نظر کہ مستاجر (کاشتکار) شرکت کاشت میں دولت بھی خرچ کرتا ہی اور محنت بھی اور زمیندار صرف دولت (زمین) ہی سے شرکت کرتا ہی" وہ مستاجر (کاشتکار) کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتا اور اسی لئے زمین کے لگان میں تخفیف کے اصول کو مدنظر رکھتا ہی۔

چنانچہ علامہ سرخسی نے مبسوط میں تصریح کی ہی کہ اگر ایک مستاجر (کاشتکار) نے زمین لگان پر لی یا بٹائی پر اور معاملہ ہو جانے کے بعد اُسے کسی معقول عذر کی بناء پر زمین کی کاشت سے انکار کر دیا اور کہدیا کہ میں اس کام کو اس سال کرنا نہیں چاہتا تو معاملہ فسخ ہو جائے گا اور کاشتکار کو مجبور نہیں کیا جائیگا اور دلیل یہ بیان کرتے ہیں۔

لان المزارعۃ علی قول من یجیزھا	اس لئے کہ مزارعۃ کو جن فقہا نے جائز کہا ہے وہ اسکو
اجارۃ والاجارۃ تنقض بالعذر	اجارہ مانتے ہیں اور اجارہ عذر کی وجہ سے فسخ ہو جاتا
وھذا لان الاجارۃ جوزت لحاجۃ	ہی اور یہ اس لئے کہ اجارہ کو مستاجر (کاشتکار) کی ضرورت
المستاجر ففی الزام العقد	اور حاجت کی وجہ سے جائز رکھا گیا ہے پس

اياه بعد ما بدا له ترك ذلك العمل اضر اضرا به الخ۔ له

ایسی حالت میں کہ وہ کاشت کرنا نہیں چاہتا اور اسکی رائے بدل گئی ہو اسکو معاملہ پر مجبور کرنا اسکو نقصان پہنچانا ہے۔

اور علامہ عبدالرحمٰن جزائری نے مزارعۃ کے جواز پر بحث کرتے ہوئے اپنی جانب سے جو محاکمہ بیان فرمایا ہے وہ اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کا بہترین آئینہ دار ہے چنانچہ علامہ موصوف ارشاد فرماتے ہیں:۔

واذا كان الحال على ما ذكر فانه يمكننا ان نطبق راى الفريقين على ما هو واقع فى زماننا وان نختار ما هو مناسب لمصالح الناس ومنافعهم فى زمان من يتحين فرصة حاجة العامل الشديدة الى العمل فلا يعطى له ارضه الا اذا غبنه غبناً فاحشاً وارهقه ارهاقاً شديداً فاذا ما دفعته الحاجة الى العمل فزرعها فى تلك الارض كانت نتيجة عمله للمالك خاصة فيستولى على غلتها فوق ما يفرضه عليه من مال وعمل هذا لا يجوز فى نظر الشريعة الاسلامية التى توجب مساعدة المضطر ومعونة

اور جبکہ صورت حال یہ ہے کہ جو ابھی مذکور ہوئی تو زمانہ کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے ان دونوں رایوں کے درمیان تطبیق ممکن ہے اور یہ ممکن ہے کہ لوگوں کے فائدہ اور منافع کے مناسب ہم ان ہر دو میں سے کسی ایک کو پسند کرلیں پس بعض لوگ ایسے ہیں جو عامل (کاشتکار) کی شدید ضرورت اور حاجت کی تلاش میں اور غنیمت موقع کی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کاشتکار کب کاشت کیلئے مجبور ہوتا ہے اور جب ایسی حالت میں کاشتکار ان سے معاملہ کرنے آتا ہے تو وہ اپنی زمین کو بغیر ایسی شرطوں کے نہیں دیتے کہ جس سے کاشتکار سخت نقصان میں پڑ جائے اور یہ معاملہ اسکے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہو جائے پھر وہ جب اپنی شدید حاجت کی وجہ سے کاشت پر مجبور ہو جاتا ہے تو اسکی محنت کا تمام ثمرہ زمیندار، مالک زمین کو پہنچ جاتا ہے اور کاشتکار سے مال اور عمل کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا زمین کی پیداوار میں سے اس معاہدہ سے کہیں زیادہ پر اسطرح تسلط جما لیتا ہے اور جو طریقہ شریعت اسلامی

العامل الضعيف فلهذا ينبغي
تحذير الناس عن المزارعة التي
يترتب عليها حرمان العامل من
كده واستغلال المالك اياه
لحاجته اما اذا كانت عاطفة
الخير متبادلة بين الناس
وكل من الشريكين لا يريد
الا ان ينتفع بما يستحقه
من ارض او عمل فلا يبتغي
احدهما على صاحبه ولا
يغشه في امر ولا يخونه
في عمل وكانت المصلحة تقتضي
العمل في الارض مزارعة
بقسمة ما يخرج من غلتها فانه
في هذه الحالة يفتى براي
من اجاز تاجير الارض الخ
له

کی نظر میں کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شریعت
اسلامی تو کمزور عامل (کاشتکار) کی مدد اور مضطر اور
پریشان حال کی حمایت کو واجب قرار دیتی ہے پس
ایسی زمینداری (مزارعۃ) کے متعلق جو کاشتکار کو اسکی
محنت کے پھل سے محروم کرتی ہو اور ایک حاجتمند
کی حاجت کو اپنی ازدیادِ دولت کا آلۂ کار بناتی ہو یہی
مناسب ہے کہ لوگوں کو اس سے روکدیا جائے اور اس سے
ڈرایا جائے لیکن جب لوگوں کے آپس میں نیک رجحانات
ہوں اور ہر دو شریک (زمیندار و کاشتکار) میں سے ایک
دوسرے کے لئے یہ ارادہ رکھتا ہو کہ زمین اور محنت کے
پیش نظر ہر ایک اپنے اپنے حق کو ضرور پائے اور ایک
دوسرے کے خلاف بدنیتی نہ رکھتا ہو اور زمیندار (لگان)
یا بٹائی کے معاملہ میں) بد دیانتی نہ کرے اور کاشتکار عمل اور
محنت میں خیانت کا مرتکب نہ ہو اور معاشی ضرورت
تقاضہ ہو کہ مزارعۃ کے معاملات رائج ہوں تو ان حالات
میں جو فقہا اس کے جواز کے قائل ہیں ان کے فتوے
پر اجازت دیدی جائے۔

اس مہتم بالشان عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کی نظر میں زمینداری و
کاشتکاری باہمی تعاون واشتراک اور امداد باہمی کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے اور اس
میں بھی ہر دو شرکاء میں سے اس کی زیادہ رعایت کی جائے گی جو صاحبِ حاجت اور محنت کش

له کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه ج ۳

معاش کمانے پر مجبور ہو اور اس معاملۂ خاص میں جبکہ سو فیصدی یہ بات کاشتکار پر صادق آتی ہو تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ زیادہ رفق و نرمی کا معاملہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ محنت اور زمین کی حیثیت کو سامنے رکھ کر تخفیف لگان ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے نیز یہ کہ ہر دو فریق کو اپنے مفوضہ فرائض دیانتداری سے انجام دینے چاہئیں اور اگر عام حالات اس قسم کے باقی نہ رہیں اور زمینداروں کی جانب سے محنت کش طبقہ کی شدید حاجت اور اضطراری کیفیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا جذبہ نمایاں نظر آنے لگے تو امام (خلیفہ) کو حق ہے کہ وہ اس قسم کے عقد و معاملہ کو حکماً روک دے اور اس سسٹم کو بند کر دے۔

بہر حال یہاں تو صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ اسلام کا معاشی نقطۂ نظر زمینداری اور کاشتکاری میں عامل (کاشتکار) کی محنت اور عمل کو پیش نظر رکھ کر یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ لگان اور مالگذاری میں رفق و نرمی یا بالفاظ دیگر تخفیفِ لگان کا لحاظ رکھا جائے۔

مفکر اسلام شاہ ولی اللہؒ نے اسلام کے اس نظریہ کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب کسی قومی تمدن میں بے جا عیش کوشی، مسرفانہ تعیش اور مذموم سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے معیشت کے بنیادی وسائل پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے اور گراں بار مالگذاری اور لگان عائد کر دیئے جاتے ہیں تاکہ اس طرح جلب زر کی صورت پیدا ہو اور اس طرح تمدن کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

جرّ ذالک الی التضیق علی القائمین بالاکساب الضروریۃ کالزارع والتجار والصناع وتضاعف الضرائب علیھم الخ۔[1]	اور یہ بیجا تعیش ان پیشہ وروں کی مصیبت کا باعث بنجاتا ہے جو ضروری معاش اعمال میں مشغول ہیں یعنی مثلاً زراعت پیشہ، تجارت پیشہ، اور صنعت پیشہ اور ان پر بھاری ٹیکس اور گراں بار لگان و مالگذاری کا سبب بنتا ہے۔

[1] حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۰۷۔

خصوصی حقوق ومراعات

اسلام کے معاشی نظام میں یہ مسئلہ اس عنوان سے کہیں نظر نہیں آتا۔ اسلئے کہ اس نے اس سلسلہ میں ایک ایسے صاف اور واضح اصول بیان کر دیئے ہیں کہ جنکے تحقق کے بعد اس عنوان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یعنی جو افراد ملکت زمینوں کے مالک ہیں ان کے لئے تو تخفیفِ لگان کے علاوہ زمین سے متعلق کسی رعایت اور حق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہ خود مالک زمین ہیں اور اس کے تصرف میں مرضی کے مختار، اور جو افراد زمین کو اجارہ پر لیتے ہیں اور زمین کے مالک نہیں ہیں تو فقہِ اسلامی ان کے لئے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس خاص حالت میں دو چیزیں قابلِ توجہ ہیں ایک زمین اور دوسرے اس سے استفادہ اور انتفاع پس مالکِ زمین کا حق تو صرف یہ محفوظ رہنا چاہئے کہ اس کی زمین کی ملکیت برقرار رہے اور یہ کہ اس کو خراب و برباد نہ کیا جائے اور مستاجر (کاشتکار) کا حق یہ محفوظ رہنا چاہئے کہ زمین سے انتفاع اور استفادہ کی باہمی طے شدہ تمام صورتوں میں وہ قطعاً آزاد ہو اور یہ کہ عدل وانصاف کے ساتھ باہمی طے شدہ لگان یا بٹائی کے علاوہ اور کسی قسم کا بار اس پر نہ ڈالا جائے۔ چہ جائیکہ وہ مستاجر کی حیثیت میں محکوم یا غلام سمجھا جائے۔ نیز اس کے عقد ومعاملہ میں زمیندار کے مقابلہ میں اجیر اور کاشتکار کی مصالح ومراعات مقدم رکھی جائیں۔

پس اگر دنیا میں آراضی کی کاشت کے سلسلہ میں ان ہر دو اصول کا لحاظ رکھا جاتا، تو اس نئے عنوان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اسلام سے قبل بھی اور اسلام کی صحیح حکومت (خلافت راشدہ) کے بعد بھی یہ ہوتا رہا ہے کہ کاشتکار اپنی حاجت اور ضرورتِ معیشت کی وجہ سے ہمیشہ زمیندار کے مظالم کا شکار بنا اور اپنی زندگی کو اسکے رحم وکرم پر گنتا رہا ہے اسلئے ضروری ہے کہ عنوان بالا کے تحت میں چند ایسے احکام وجزئیات کو نقل کر دیا جائے جس سے قدیم اور جدید مظالم متعلقہ کاشتکار کا سدِ باب ہو سکے اور یہ روشن ہو جائے کہ اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے اور اس نے اس ضعیف اور مظلوم جماعت پر عائد شدہ بوجھ کو کس طرح ہلکا کیا؟

اسلام سے قبل عرب سے متصل دو حکومتیں بہت بڑی شاہنشاہیت: امپیریلزم) کی مالک

تھیں، ایک ایران کی اور دوسری روم کی، ایران مجوسی مذہب کا پیرو تھا اور روم عیسائیت کا معتقد، مگر دونوں حکومتوں کا تمدن ایسے فاسد نظام اور ظالمانہ استبدادیت کا حامل تھا جس کی مختصر کہانی شاہ ولی اللہؒ کی زبانی گذشتہ اوراق میں سنائی جا چکی ہے یعنی بادشاہ، امراء، ارکانِ دولت اور تعلقہ داروں کے مسرفانہ تعیش اور معاشی دست برد نے رعایا کو اس درجہ پریشان کر دیا تھا کہ کاشتکار، مزدور، صناع اور تجار ٹیکس، لگان اور مالگزاری کی گراں باریوں کے علاوہ نت نئے مظالم کا شکار ہوتے رہتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اونچے طبقہ کے ان سرمایہ داروں نے پیشہ ور طبقوں کو عموماً اور کاشتکاروں کو خصوصاً اپنا غلام اور محکوم بنا لیا تھا اور ان پر اپنی تمام عیاشیوں کا بوجھ ڈال کر ان کو اس قدر محتاج اور ضعیف المعیشت بلکہ محروم المعیشت بنا دیا تھا کہ مجبور ہو کر انھوں نے اس غلامانہ اور محکومانہ زندگی ہی پر قناعت کر لی تھی اور اس کو تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کی زبان میں "تراضی" اور "رضا" کہا جاتا تھا۔ یعنی محکوم رعایا اور غلام کاشتکار، ان ظالمانہ شرائط کو برضا و رغبت تسلیم کرتے ہیں اور اس لئے یہ ظلم نہیں ہے۔

اسلام نے جب مدینہ منورہ میں پہنچ کر "خلافتِ حقہ" کا اعلان کیا اور آہستہ آہستہ یہ تمام ممالک اس کے زیر نگیں آ گئے تو اس نے شعبہ ہائے حکومت کے انقلابی اور اصلاحی پروگرام میں اس اصلاح کو بھی شامل کر لیا اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے ہی زمانہ میں عراق، مصر، شام وغیرہ ممالک میں اس طبقاتی ظلم کا خاتمہ کر کے عدل و انصاف کا علم بلند کر دیا گیا۔

پس مناسب یہ ہے کہ اس سلسلہ کے تمام مفاسد اور انکی اصلاحات کو ترتیب وار بیان کر کے عنوان بالا کی حقیقت کو واشگاف کر دیا جائے تاکہ حق و باطل کا موازنہ ہو سکے اور دورِ حاضر کے تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو بھی اس آئینہ میں اپنے قیصرو کسروِیانہ مظالم کا چہرہ دیکھنے اور اس سے عبرت حاصل کرنے کا موقعہ میسر آ سکے۔

(۱) ایرانی اور رومی حکومت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ کاشتکاروں کو اپنا محکوم اور غلام

سمجھ کر مالگذاری اور لگان کے وصول کرنے میں وحشیانہ سختیاں کرتے اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھتے تھے اور حاکموں کے اس رویہ کو دیکھکر تعلقہ دار اور جاگیر دار بڑے بڑے زمیندار بھی یہی عمل کرتے اور بجائے عدالت میں نالش کے ذریعہ حق خواہی کے خود ہی زدو کوب کر کے لگان اور مالگذاری وصول کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اس جابرانہ رسم کا انسداد کیا۔ قانون کے ذریعہ اس کا خاتمہ کیا اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے جبر و تشدد کو حرام قرار دیا اور نہ صرف یہ بلکہ اس قسم کے جبر و تشدد کے خلاف آخرت کے عذاب کی وعیدیں سناکر اخلاقاً بھی اس کا استیصال ضروری سمجھا اور اگر ایرانیوں کی تقلید میں کبھی کسی عامل نے اس قبیح رسم کا اعادہ کیا تو خلیفۂ اسلام نے ایسے عامل کو یا معزول کردیا اور یا سرزنش کے ذریعہ اسکا انسداد کردیا حتی کہ یہ صاف و صریح حکم دیا کہ اگر اہلِ خراج معاشی مجبوریوں کی وجہ سے وقت پر خراج (لگان) ادا نہ کرسکیں تو انکو مہلت دو تا آنکہ بسہولت ادا کرنے پر قادر ہو جائیں چنانچہ حسب ذیل احکام و نظائر اس کی روشن دلیل ہیں۔

حضرت عمرؓ شام کے ملک سے واپس آرہے تھے راہ میں دیکھا کہ کچھ آدمی دھوپ میں کھڑے ہیں حضرت عمرؓ کے دریافت حال پر معلوم ہوا کہ جزیہ ادا نہ کرنے پر سزا دیجارہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ادا نہ کرنیکی وجہ دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہ ادا کرنے سے معذور ہیں۔ آپ نے عاملوں کو بہت سختی کے ساتھ اس ظالمانہ روش پر باز پرس کی اور فرمایا

دعوهم لا تکلفوهم ما لا یطیقون	ان کو چھوڑ دو اور ان کی طاقت سے زیادہ ان کو
قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ	تکلیف نہ دو، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم یقول: لا تعذبوا الناس	علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے لوگوں کو عذاب میں نہ ڈالو
فان الذین یعذبون الناس فی	اسلئے کہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب میں مبتلا کرتے
الدنیا یعذبهم اللہ یوم القیامۃ	ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے دن عذاب میں مبتلا کریگا
وامر بهم فخلی سبیلهم۔[1]	اور پھر آپ نے حکم دیکر ان کو اس سے نجات دلائی۔

[1] کتاب الخراج ص ۷۵ و کتاب الاموال ص ۴۳۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کی یہ وصیت مشہور ہے:-

اوصی الخلیفة من بعدی باهل الذمة خیرا ان یوفی لهم بعهدهم وان یقاتل من ورائهم وان لا یکلفوا فوق طاقتهم[1]

میں اپنے بعد آنیوالے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے، ان کے عہد کو پورا کرے، ان کی حفاظت میں ان کے دشمن سے جنگ کرے اور (ادائے خراج) میں ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالے۔

عن عبد الرحمن بن جبیر بن نفیر عن ابیه ان عمر بن الخطاب اُتی بمال کثیر قال ابو عبید احسبه قال من الجزیة فقال انی لاظنکم قد اهلکتم الناس قالوا لا والله ما اخذنا الا عفوا صفوا قال بلا سوط ولا نوط؟ قالوا نعم قال الحمد لله الذی لم یجعل ذلک علی یدی ولا فی سلطانی۔[2]

عبدالرحمن بن جبیر بن نفیر راوی ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جزیہ کا بہت سا مال پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ مجھے خیال ہو رہا ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر کے یہ جمع کیا ہے عاملوں نے کہا بخدا ایسا نہیں ہوا ہم نے انکی حاجت سے فاضل مال ہی بہ رضا خوشی سے وصول کیا ہے حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا بغیر اس کے کہ پیٹ کر یا ہنٹر لگانے جیسی تکلیف کے بھرے ہوں کہا بیشک بغیر ایذا دیئے تب حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس خدا کا بے نہایت شکر ہے جس نے میرے ہاتھ پر ایسے کام نہیں کرائے اور نہ میرے دور خلافت میں اس قسم کے مظالم ہو سکے۔

ایک مرتبہ سعید بن عامر والیِ شام نے خراج بھیجنے میں دیر کی جب وہ دربار خلافت میں آئے تو حضرت عمرؓ نے سخت باز پرس کی۔ سعید بن عامر نے جواب دیا کہ آپ نے دو حکم دیئے تھے میں ان دونوں پر عامل ہوں ایک یہ کہ کاشتکاروں پر فی جریب چار دینار سے زیادہ لگان نہ لگاؤں

[1] کتاب الخراج ص ۱۲۵ [2] کتاب الاموال ص ۴۴ [3] کتاب الاموال ص ۴۴

اور دوسرے یہ کہ ادائے لگان میں نرمی سے کام لوں، سو میں اسوقت تک لگان نہیں لیتا جب تک ان کو خوب آمدنی نہیں ہو جاتی، حضرت عمرؓ نے سن کر فرمایا، یہی چاہیئے اب میں تجھ کو کبھی معزول نہیں کرونگا۔

قال امرتنا ان لا تزيد الفلاحين على اربعة دنانير فلسنا نزيدهم على ذالك ولكنا نؤخرهم الى غلاتهم فقال عمر لا عزلتك ما حييت [1]

سعید نے کہا آپ نے ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ کاشتکاروں پر چار دینار سے زیادہ لگان نہ لگائیں سو ہم اسکے پوری طرح پابند ہیں اور ہم ان سے وصول میں ان کی آمدنی آنے تک تاخیر کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا میں تجھ کو زندگی بھر معزول نہیں کرونگا۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عبد الحمید والیٔ کوفہ کو ایک مفصل والا نامہ تحریر فرمایا تھا جس میں درج تھا۔

ولا تاخذن من العامر الا وظيفة الخراج في رفق وتسكين لاهل الارض [2]

اور آباد زمینوں پر مقررہ خراج سے ہرگز زیادہ نہ لو اور جو بھی وصول کرو اہل زمین سے نرمی اور دلجوئی کے ساتھ وصول کرو۔

اور امام ابو یوسفؒ ان ہی روایات کے پیش نظر ارشاد فرماتے ہیں۔

ولا يضربن رجل في دراهم خراج ولا يقام على رجله فانه بلغني انهم يقيمون اهل الخراج في الشمس ويضربونهم الضرب الشديد ويعلقون عليهم الجرار ويقيدونهم

اے ہارون! کسی شخص کو بھی لگان (خراج) کے سلسلہ میں زدوکوب نہ کیا جائے اور نہ ایک پیر پر کھڑا رکھا جائے یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض وصول کنندہ اس قسم کی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں کہ اہل خراج کو دھوپ میں کھڑا کرتے ہیں، اور نہایت مار پیٹ کرتے ہیں اور ان کی گردنوں میں گھڑے لٹکاتے ہیں

---

[1] کتاب الاموال ص ۴۴۔ [2] ص ۴۷ و کتاب الخراج ص ۸۶

بما يمنعهم عن الصلوة وهذا عظيم عند الله شنيع في الاسلام الخ [1]

اور انکو قید کردیتے ہیں کہ وہ نماز بھی نہ پڑھ سکیں حالانکہ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہیں اور اسلام ان حرکتوں کو بدترین سمجھتا ہے۔

اور آگے ارشاد فرماتے ہیں:-

ان العدل وانصاف المظلوم وتجنب الظلم مع ما في ذلك من الاجر يزيد به الخراج وتكثر به عمارة البلاد والبركة مع العدل تكون وهي تفقد مع الجور والخراج المأخوذ مع الجور تنقص البلاد به وتخرب الخ [2]

واضح رہے کہ عدل اور مظلوم کے ساتھ انصاف اور ظلم سے پرہیز، ان باتوں میں جو کچھ اجر و ثواب ہے وہ تو ظاہر ہے اسکے علاوہ یہ فائدہ ہے کہ اس سے خراج بڑھتا ہے اور اس سے شہروں کی آبادی بڑھتی ہے اور انصاف سے برکت میں اضافہ ہوتا ہے اور ظلم سے برکت مٹ جاتی ہے اور جو لگان (خراج) ظلم سے حاصل ہوتا ہے اس سے شہر اجڑ جاتے ہیں اور ملک میں تباہی اور خرابی آجاتی ہے۔

خراج کی وصولیابی میں سہولت و نرمی و عدم ادائیگی کی صحیح اور واقعی مجبوریوں کی رعایت کے جو اصول مسطورہ بالا حوالجات میں نظر آتے ہیں یہ ان کاشتکاروں کے لئے بھی ہیں جو کاشتکار ہونے کے علاوہ حکومت کی رعایا بھی ہیں لہٰذا جو کاشتکار معاملۂ کاشت میں زمیندار کے لئے صرف شریکِ عمل کی حیثیت میں ہیں ان کے لئے کس طرح اسلام یہ روا رکھ سکتا ہے کہ زمیندار کاشتکار پر ظلم و جبر اور تشدد روا رکھے اور عملاً اسکو اپنا غلام بنالے۔

(۲) شاہنشاہیت پسند قدیم و جدید حکومتوں میں یہ عام رواج رہا ہے کہ حکومت عمالِ حکومت، تعلقہ دار، جاگیردار اور بڑے بڑے زمیندار، لگان اور مالگذاری کے علاوہ "رولج" اور "رسوم" کے نام سے مزید رقم وصول کرتے، اور اس کو اصل لگان سے زیادہ اہمیت دیتا

[1] کتب الخراج ص ۱۰۹ - [2] کتاب الخراج ص ۱۱۱ -

واجبی حق تصور کرتے تھے اور اس طرح اصحابِ زراعت کو تباہ کرتے تھے، دورِ جدید میں اگر مشاہدہ کرنا ہو تو برٹش شاہنشاہیت کے زمانہ میں ہندوستان کے تعلقداری اور زمینداری سسٹم میں تعلقہ دار، زمیندار اور ان کے کارندوں اور ٹھیکیداروں کے عمل میں یہ سب کچھ دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲) اسلام کے اقتصادی نظام نے اس کو بھی ظلم قرار دیا ہے اور عمالِ حکومت کے لئے اس کو سخت جرم مقرر کیا ہے اور اجارۂ زمین پر بحث کرتے ہوئے بابُ الاجارہ میں اس قانونی دفعہ کو بنیادی دفعہ لکھا ہے کہ اجرتِ زمین (لگان) میں جو نقد یا جنس شے معلوم کو طرفین کے درمیان جزو معاملہ بنایا گیا ہے اس کے علاوہ کاشتکار سے مستاجر ہونے کی حیثیت سے کچھ وصول کرنا ناجائز ہے اور ابواب رسوم کو معاملہ کا جزو یا شرط بنانا فاسد ہے اور ایسی شرط کا اجارہ قبول نہیں چنانچہ امام ابویوسفؒ تحریر فرماتے ہیں:

ولا یحملن منہم فی قسمتہم	اور اہلِ خراج سے وہ رقم ہرگز نہ لی جائے جو خراج کی
ما یحمل اہل الخراج منہا فی	رقم کے علاوہ "رواج" کے نام سے لی جاتی ہے مجھے
الخراج فانہ بلغنی ان الرجل	معلوم ہوا ہے کہ جب کاشتکار جن سے کوئی
منہم یأتی بالدراہم لیؤدیہا	(لگان) خراج کی رقم لاتا ہے تو اس میں سے کچھ
فی خراجہ فیقتطع منہا طائفۃ	نکال کر کہتا ہے کہ یہ تو "رواج اور رسوم" کی رقم
فیقال ہذا رواجہا وصرفہا الخ[1]	ہے اور اصل خراج میں اسی قدر باقی ہے)

اور اجارۂ فاسدہ اور مزارعۂ فاسدہ کے مباحث میں کتبِ فقہ میں یہ قانونی دفعہ مذکور ہے

لانہا کالبیع تفسد بالشروط	اس لئے کہ اجارہ بیع کی طرح کا معاملہ ہے جو فاسد
الفاسدۃ فکل ما افسد البیع	شرطوں کے ساتھ فاسد ہو جاتا ہے پس جو شرط بیع
افسدہا الخ[2]	کو فاسد بنا دیتی ہے وہ اجارہ کو بھی فاسد کر دیتی ہے۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۰۶ [2] ہدایات ابواب معاملات نصف ثانی ص ۱۵۲ و درالمختار ج ۵ ص ۳۲۹ باب الاجارۃ الفاسدۃ ص ۵ ج ۲۲ باب المزارعہ۔

او شرط فیہ شی طلا یقتضیہ العقد۔ ؎	یا ایسی شرط اس میں لگائی جو عقد اجارہ کی مقتضیات سے نہیں ہو وہ بھی موجب فساد ہے۔

امام ابو یوسف ہارون الرشید کو خراج سے متعلق احکام بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بعض تحصیلدار یہ غضب کرتے ہیں کہ اپنے ماتحتوں کو جب وصول خراج کے لئے بھیجتے ہیں تو ان کی اجرت مقرر کر دیتے ہیں اور اس کو اہل خراج سے وصول کرتے ہیں اور بعض مرتبہ یہ رقم اصل لگان سے بھی بڑھ جاتی ہے یہ سب ظلم اور سخت گناہ ہے۔ امیر المومنین کے لئے واجب ہے کہ اس قسم کے تمام امور کا قلع قمع کر دے۔ فرماتے ہیں۔

بلغنی انہ ربما وظف لہ اکثر مما	مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ اکثر اوقات (حوالہ دار) کی مطالبہ
یطالب بہ الرجل من الخراج	اجرت خراج کی اصل رقم سے بڑھ جاتا ہے اور جب
فاذا اتاہم ذلک الموجہ الیہ	(حوالہ دار) کاشتکاروں میں پہنچتا ہے تو کہتا ہے کہ خراج
قال لہ اعطنی جعلی الذی جعلہ	کے علاوہ یہ میری مزدوری اور یہ میرا حق ہے پس اگر
لی الوالی فان جعلی کذا و	المخول نے اس کا مطالبہ نہ دیا تو ان کو مارتا، ڈراتا
کذا فان لم یعط ضربہ و	ظلم وجبر کرتا ہے غریب کاشتکاروں کی گائے بیل
عسفہ وساق البقر والغنم	اور بکریوں سے کھینچ لیتا اور جو بھی ہاتھ لگتا ہے سب کو مال بطور
ومن امکنہ من الضعفاء والمزارعین	قبضہ میں کر لیتا ہے الا یہ سب ظلم و جبر سے
حتی یاخذ ذلک منہم	وصول کرتا ہے تو واضح رہے کہ یہ اہل خراج (لگان)
فلما دعا دانا وہذا ا	کے لئے سخت مضرت کا باعث ہے اور قیمتی حکومت
کلہ ضرر علی اہل الخراج	کی آمدنی کو بھی گھٹاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ
نقص للفئ مع ما فیہ من الاثم الخ ؎	خدا کے یہاں یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

(۳) ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ حکومت، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے

؎ سعدیات ابواب معاملات نصف ثانی ص ۱۵۴ و بحر الرائق ج ۸ ص ۳۲۶ باب الاجارۃ الفاسدۃ مطبوعہ مصر ۔

؎ کتاب الخراج۔

زمینداروں سے بیگار لیتی تھی یعنی جو کام لیتی تھی اس کا معاوضہ نہیں دیتی تھی اور تعلقداروزمیندار اپنی جان بچانے کو کاشتکاروں کو سامنے کر دیتے تھے اور وہی ظلم کا شکار بنتے تھے اور اس پر بس نہیں کرتے بلکہ گھریلو زندگی کی ضروریات میں خود بھی ان سے بیگار لیتے تھے چنانچہ بیگار کا یہ رسم شاہنشاہیت پسند حکومتوں میں اب بھی کسی نہ کسی صورت سے رائج ہے اور نہ صرف کاشتکار بلکہ غریب طبقہ عام طریقہ سے اس کا شکار نظر آتا ہے۔

(۴۲) اسلام نے اس ظالمانہ روش کو بھی مٹا ڈالا اور حکومت اور صاحب زمین کے لئے یہ جرم قرار دیا کہ وہ کسی کاشتکار یا مزدور سے بغیر مقررہ اجرت اور باہمی رضامندی کے مفت جبر کوئی خدمت لے اور ایک مفلس، غریب اور معاشی مضطر کی رضامندی حقیقی معنی میں رضا کب کہلائی جاسکتی ہے؟ اس کے متعلق اسلامی نظریہ شاہ ولی اللہؒ اور دیگر علماء کی نقول سے گزشتہ اوراق میں بیان ہوچکا ہے۔

محلی ابن حزم میں تصریح ہے کہ مزارعہ میں کاشتکار سے زمین معلوم کی کاشت سے متعلق کاموں کے علاوہ اور کوئی خدمت لینا قطعاً ناجائز ہے مثلاً مکان بنوانا یا مکان کی تعمیر کرانا، یا مکان کی صفائی کرانا یا مرمت کرانا یا باغ کی دیوار بنوانا یا اسی قسم کے اور کام لینا وغیرہ اور اس قسم کے امور کو شرائط مزارعۃ میں داخل کرنا معاملۂ مزارعۃ کو فاسد کرنا ہے اس لئے کہ عامل (کاشتکار) کے ذمہ صرف وہی امور ہیں جو اجرت پرلی ہوئی زمین کی کاشت سے متعلق ہیں۔

لان السنۃ انما وردت بان الشرط علیھم ان یعملوھا باموالھم و بانفسھم فقط الخ[۱]	اس لئے کہ سنت نبوی سے صرف یہ ثابت ہوا ہے کہ کاشتکار کے ذمہ ایک ہی شرط ہے کہ وہ اجارہ پرلی ہوئی زمین کو مال اور محنت کے ذریعہ بوئے اور جوتے (تاکہ پیداوار حاصل ہو)

اس خاص قانونی دفعہ کے علاوہ اسلام نے اس سلسلہ میں کہ بیگار بدترین ظلم ہے ایک

---

[۱] ج ۸ ص ۲۲۲ و بحر الرائق ج ۷ ص ۳۳۰، ۳۳۹۔

بنیادی اعلان بھی کیا ہے تاکہ نہ صرف کاشتکاروں سے بلکہ کسی بھی آدمی سے بجبر بلا معاوضہ یا اس کی محنت سے کم دیکر کام لینے کا کلیتہً انسداد ہو جائے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللّٰہ تعالیٰ ثلثۃ انا خصمھم یوم القیٰمۃ رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حرًا فاکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرًا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہٗ۔ لہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تین قسم کے آدمی ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کرونگا، ایک وہ شخص جسنے مجھ کو اپنا عہد دیا اور پھر غداری کی، اور ایک وہ شخص کہ جس نے آزاد کو غلام بنا کر فروخت کیا اور اسکا ثمن کھایا اور ایک وہ انسان جس نے کسی شخص سے اجرت پر کام کیا اور کام پورا کرا لیا مگر اسکی واجبی اجرت نہ دی

حافظ ابن حجر عسقلانی اور شیخ بدرالدین عینی جیسے جلیل القدر محدثین اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے "رجل استاجر الحدیث" کے متعلق فرماتے ہیں کہ کسی شخص سے کام لیکر اسکی اجرت نہ دینا اس قدر شدید گناہ اسلئے ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے گویا یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے گویا ایک آزاد شخص کو غلام بنا لیا اور آزاد کو غلام بنانا جس قدر شدید گناہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

ھو فی معنی من باع حرًا واکل ثمنہ لانہ استوفی منفعتہ بغیر عوض وکانہ اکلھا ولانہ استخدمہ بغیر اجرۃ وکانہ استعبدہٗ

کسی سے خدمت اور کام لے کر اسکی واجبی اجرت نہ دینا اس معنی میں ہے کہ کسی آزاد شخص کو فروخت کرکے اس سے معیشت پیدا کرنا اسلئے کہ جب اسنے بغیر عوض کے اپنی منفعت کو پورا کر لیا تو گویا اس شخص کی ذات کو فروخت کرکے اسکو روزی بنا لیا اور اسلئے کہ بغیر اجرت دیئے خدمت لے لینا گویا اسکو اپنا غلام بنا لینا ہے۔

واما الثالث فهو داخل في بيع حر لانه استخدمه بغير عوض وهذا عين الظلم الخ۔[1]	لیکن حدیث کے تیسرے جملہ کی شرح یہ ہے کہ وہ اسی قسم میں داخل ہے کہ جس میں آزاد شخص کو فروخت کرنے کی حرمت کا ذکر ہے اس لئے بغیر معاوضہ ادا کئے کسی شخص سے خدمت لینا سراسر ظلم ہے۔

اسی طرح یہ فرمان رسالت ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطوا الاجير اجره قبل ان يجف عرقه[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مزدور کی اجرت اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔"

اب ان حوالجات سے آپ یہ بھی اندازہ لگائیے کہ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن قائم رکھنے میں کس درجہ دقتِ نظر سے کام لیتا ہے؟

(۵) ایران اور روم کی حکومتوں میں ایک یہ بھی طریقہ رائج تھا کہ اپنے تہواروں میں شادی اور غمی کی رسوم میں اور مکان کو خام سے پختہ بنانے وغیرہ امور میں کاشتکاروں سے بھینٹ لیتے تھے اور اکثر بھینٹ کا یہ تاوان لگان کے مساوی یا اس سے بھی زیادہ ہوجاتا تھا مگر اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے وہ اس ظلم کو بہرحال برداشت کرتے تھے یا بجبر ان کو برداشت کرایا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی اگر اس کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں میں شادی کے وقت "شادیانہ" ہاتھی اور موٹر کی خریداری کے وقت "ہاتھیانہ" اور "موٹرانہ" اور تہواروں میں تہوار کی بھینٹ کے نام سے اب بھی یہ مظالم کی نقش و نگار نظر آئیں گے۔

(۵) اسلام کے معاشی نظام کی وہ دفعات پڑھ لینے کے بعد جو زمین کی کاشت سے متعلق اجارہ اور مزارعۃ کے احکام نمبر ۳ میں نقل کئے گئے ہیں خود بخود یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسلام اس قسم کے ظالمانہ رسم و رواج کو جائز نہیں سمجھتا اور ظلم تصور کرتا ہے، نیز اس کے ظلم ہونے کی ایک

[1] عمدۃ القاری ج ۵ ص ۵۹۱۔ [2] ابن ماجہ باب الاجارہ۔

بڑی دلیل یہ بھی ہو کہ کاشتکاروں سے اس قسم کی ملی بھینٹ بغیر کسی معاوضہ اور بدل کے لیجاتی ہے یعنی اس کے مقابلہ میں نہ کاشتکار کو لگان میں سے اسی قدر کمی یا معافی نہیں دیجاتی یا اضافہ قیمت کے بغیر زمین میں اضافہ نہیں کیا جاتا اور اسلامی قانون اس قسم کے معاملہ کو "جبر" قرار دیتا اور ظلم بتاتا ہے اور کاشتکار کی مجبورانہ رضامندی کو رضائے حقیقی نہ سمجھتے ہوئے اسکو "ربوٰا" اور "سود" کی طرح کا معاملہ یقین کرتا ہے چنانچہ کتبِ فقہ میں "معاملات" کی بحث میں جانبین سے رضا اور رغبت اور بدل بعوض دونوں کو ضروری اور معاملہ کے جواز کا مدار ٹھیرایا گیا ہے۔

اسی لئے امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کو ذمی کاشتکاروں سے وصولِ خراج لگان کے متعلق احکام بتلاتے ہوئے یہ تصریح فرمائی ہے۔

واعرف ان لا تأخذ في الخراج	ہارون! اچھی طرح یہ سمجھ لو کہ تم خراج میں
الا وزن سبعة ليس فيها تبر	وزن سبعہ (درہم و دینار کی ایک خاص قسم جو عام طور
ولا اجور الضرابين ولا اذابة	پر رائج تھی) کے علاوہ نہ لینا کہ اس وزن میں خالص
الفضة ولا هدية النيروز و	سونے کے پتر داخل نہیں ہیں اور سکہ ڈھالنے والوں
المهرجان ولا ثمن الصحف	کی اجرت بھی نہ لینا اور نہ چاندی پگھلانے کی اجرت
ولا اجور الفتوح ولا اجور	لینا اور نہ نوروز اور مہرجان کے ہدایا (بھینٹ)،
البيوت ولا دراهم	لینا اور نہ رسید کی لکھائی کی اجرت اور نہ فتح کے بدھائی کی
النكاح الخ	اجرت اور نہ مکانوں کی اجرت (ہاؤس ٹیکس) اور نہ
له	نکاح کا ٹیکس لینا" له
ولا يوظف اهل الخراج برزق	اہل خراج سے نہ تحصیلدار کی تنخواہ مجرا کی جائے
عامل ولا اجر مدي ولا اختفان	اور نہ تولنے یا ناپنے کی اجرت لی جائے اور نہ کمائی

له کتاب الاموال ص ۸۸ ابو عبید کہتے ہیں کہ "دراہم نکاح" سے وہ ٹیکس مراد ہے جو بیاہ شادی کے موقع پر غیر اسلامی حکومتوں میں لگایا جاتا تھا۔

ولا نزلة ولا حمولة طعام السلطان ولا يدعى عليهم بنقيصة فتوخذ منهم ولا يوخذ منهم ثمن صحف ولا قراطيس ولا اجور الفتوح ولا اجور الكيالين ولا مؤنة احد عليهم في شيء من ذلك ولا قسمة ولا نائبة سوى الذي وصفنا من المقاسمة الخ[1]

گی اور نہ خلیفہ کے لئے رسد اور جہان نوازی کے سلسلہ میں کوئی بار ڈالا جائے اور نہ ضیاع بتاکر اور الزام لگاکر کہ انھوں نے پیداوار میں سے چرا لیا ہے اُن سے مزید لیا جائے اور نہ رسید اور رجسٹر کی اجرت لی جائے اور نہ نہروں کے پانی کی اور نہ تولنے والوں کی اور نہ اس قسم کا کوئی اور بوجھ ان پر ڈالا جائے اور بٹائی کے اس حصے کے علاوہ جو ہم نے بیان کر دیا ہے نہ کسی اور قسم کا حصہ لیا جائے گا اور نہ علاقہ کا تاوان ان پر ڈالا جائے۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیز اموی نے گورنر کوفہ عبد الحمید کو اس سلسلہ میں جو فرمان بھیجا تھا اس میں یہ احکام درج تھے جو کتاب الخراج سے نقل کئے گئے ہیں[2]۔

اور امام ابو یوسف نے اہل خراج پر عاملوں کی بے عنوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی تنبیہ کی تھی کہ رشوت اور بھینٹ کی ظالمانہ رسوم کا کلیتہً انسداد ہونا چاہیے تحریر فرماتے ہیں۔

انما مذهبهم اخذ شيء من الخراج كان او من اموال الرعية ثم انهم ياخذون ذلك فيما يبلغني بالعسف والظلم والتعدي ثم لا يزال الوالي ومن معه قد نزل بقرية ياخذ اهلها من نزله بما لا يقدرون عليه ولا يجب عليهم حق يكلفوا ذلك۔[3]

ان عاملوں کا تو یہ مذہب ہے کہ بہرحال لینا چاہئے خواہ وہ مقررہ خراج ہو یا رعیت کا ذاتی مال و متاع اور مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ یہ ظلم و جبر اور سختی کرتے ہیں اور لے کر چھوڑتے ہیں، پھر حاکم اور اس کے کارندے اگر کسی گاؤں میں جاتے ہیں تو حق مہمانی کے نام سے وصول کرتے ہیں حتی کہ اُن کی مقدرت سے بھی زیادہ لے لیتے ہیں اور جو حق ان کے ذمہ نہیں ہے اس کو ظلماً حق بنا کر لیتے ہیں۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۹ [2] کتاب الاموال ص ۴۳، ۴۴ [3] کتاب الخراج ص ۱۰۶، ۱۰۷

ایک مغالطہ اس سلسلہ میں عموماً یہ کہا جاتا رہا ہے کہ "بیگار" اور "بھینٹ" کے اس رسم و رواج کا تعلق ایک کاشتکار کی کاشتکاری سے مطلق نہیں ہے بلکہ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ زمیندار یا تعلقدار نے انکے رہنے کے لئے مفت جگہ عطا کی ہے اور وہ رعایا کی طرح اس کے علاقہ میں آباد ہو گئے ہیں اور ان پر اجرتِ مکان کی جگہ اس قسم کے حقوق عائد کر دیئے گئے ہیں اور کاشتکاروں نے رعایا کی حیثیت میں برضا و رغبت ان حقوق کو منظور کر لیا ہے۔

سو یہ محض مغالطہ یا فریب ہے اس لئے کہ "اسلام کے قانونِ معاملات" میں اس قسم کا مجہول معاملہ جائز ہی نہیں رکھا گیا اور ظلم اور مناقشہ کی راہ پیدا ہونے کے امکانات کی وجہ سے اس نے ایسے معاملات کو ناجائز کہا ہے اسلام کا قانون اس بارے میں یہ ہے کہ جس طرح کاشت کے لئے زمین اجرت پر دی جا سکتی ہے اسی طرح رہنے سہنے یا کسی اور ضرورت کے لئے بھی اجرت پر دی جا سکتی ہے اور دیگر معاملات کی طرح اس میں بھی جگہ کا تعین اور اس کی اجرت کا تعین ابتداءِ عقد میں ہی ضروری ہے کیونکہ یہ بھی اجارہ ہی کی ایک قسم ہے اور زمیندار اپنے مفاد کے "یعنی کاشت کی افزونی کے" پیش نظر یا کاشتکار کی آسانی اور راحت کی خاطر بغیر اجرت کے کاشتکار کو بساتا اور رہنے کے لئے زمین دیتا ہے تو یہ اس کا تبرع اور حسنِ سلوک شمار ہوگا اور اس صورت میں کاشتکار کے ذمہ نہ کوئی معاوضہ عائد ہوتا ہے اور نہ مبینہ حقوق ہی اس پر قائم کئے جا سکتے ہیں چہ جائیکہ وہ صاحبِ زمین کی محکوم رعایا یا غلام متصور ہو۔

البتہ زمیندار اور کاشتکار کے درمیان اجارہ اور مزارعت سے پیدا شدہ تعلقات کی بناء پر تہواروں میں ہدایا کا لین دین مسطورہ بالا "بھینٹ" کی مذموم رسم سے الگ باہمی تعلق کے استحکام کے لئے مفید طریقہ ہے بشرطیکہ رسم و رواج کی پابندی سے جدا محض رضا و رغبت کے ساتھ عمل میں آئے اور اس قسم کے ہدایا کے قبول و عدمِ قبول کی تفصیلات کتبِ فقہ میں قابلِ مراجعت ہیں۔

(۵) اسلام سے قبل ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ "کاشتکار" جب اپنی ضرورت کے لئے زمین نقد لگان پر لیتا تھا تو مالک زمین اس سے اس قسم کی شرطیں لگاتے تھے جس سے زمین کی حیثیت مستقل طور پر بڑھ جائے اور جو کام یا ذمہ داری خود اپنے ذمہ عائد ہے وہ اس حیلے سے کاشتکار پر عائد ہو کر مستقل مزید نفع حاصل ہو جائے۔

(۵) اسلام کے معاشی نظام میں اس قسم کے اجارہ کو اجارۂ فاسدہ میں شمار کیا گیا ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے اگرچہ اس قسم کی جزئیات قانون اسلامی (فقہ) میں بہت کافی ملیں گی لیکن نمونہ کے طور پر حسب ذیل جزئی کا ذکر کر دینا کافی ہے بحر الرائق میں ہے۔

فعلم بهذا ان ما يقع في زماننا
اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ جو ہمارے زمانہ میں

من اجارة ارض الوقف
دستور ہو گیا ہے کہ موقوفہ زمین کو ایک معین اجرت (لگان)

باجرة معلومة على ان
پر اس شرط کے ساتھ دیتے ہیں کہ زمین پر جس قدر بھی

المغارم وكلفة
تاوان پڑینگے اور معہودہ کاشت کے مقصد سے

الكاشف على المستاجر
جو زمین کی اصلاح کے لئے جو بھی محنت و مشقت

او على ان الجرف على
پڑیگی اور زمین میں نہر کی کھدائی کی ذمہ داری کاشتکار

المستاجر فاسد الخ له
پر ہو گی یہ دستور ناجائز اور فاسد اجارات میں سے ہے۔

پس اگر وقف کی زمین کا یہ حکم ہے تو زمینداروں کی شخصی زمین کے لئے یہ حکم بدرجۂ اولیٰ نافذ العمل ہو گا۔ اس لئے کہ اس صورت میں متعاقدین (زمیندار و کاشتکار) میں سے مالک زمین کاشتکار پر عقد کے خلاف ذمہ داری ڈالتا ہے جو صراحۃً ظلم ہے۔

(۶) کاشتکار اور اہل خراج پر گذشتہ تمام مظالم سے زیادہ سخت ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر پیداوار کی کمی کی وجہ سے یا قدرتی آفات کے نزول کے سبب سے یا کسی اور معقول عذر کی وجہ سے

له بحرالرائق ج ۸، [illegible]

وہ مقررہ لگان کو ادا نہیں کر سکتے تھے تو حکومت یا زمیندار زراعت کا سامان ہل، بیل، گاڑی اور ضروریاتِ زندگی کو نیلام کراتے اور ان کو فروخت کر کے اپنا لگان وصول کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کاشتکار آئندہ کے لئے بھی اس قابل نہیں رہتا تھا کہ وہ محنت کر کے دوسری فصل میں روزی پیدا کر سکے اور اس کے لئے زندگی ایک مستقل عذاب بن جاتی تھی اور آفات سے پیدا شدہ نقصان کی وجہ سے لگان کی کمی یا معافی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

(ب) اسلام کے معاشی نظام میں اس کو بھی "ظلم" قرار دیا گیا ہے اور مطالبۂ لگان واجب ہونے کے باوجود وصولِ لگان کے سلسلے میں آلاتِ زراعت کے نیلام کی اجازت نہیں دی گئی اس لئے کہ ایسا کرنا اس کو معاشی زندگی کے ذرائع سے محروم کرنے کے مرادف ہے جو کسی طرح جائز نہیں چنانچہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ شام کے ایک مشہور مقام عکبرا کے عامل کو اہلِ خراج کے سامنے نہایت سختی کے ساتھ یہ حکم دیا کہ تم کو ان سے خراج کا ایک ایک حبہ وصول کرنا چاہئے اور پھر فرمایا کہ مجھ سے دوپہر کو ملاقات کر لینا جب عامل حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا۔

انظر اذا قدمت علیھم فلا تبیعن	دیکھو! جب تم ان کے یہاں پہنچو (خراج وصول کرنے)
لھم کسوۃ شتاء ولا صیف ولا رزقاً	ہیں تو ان کے سردی اور گرمی کے لباس کو
یاکلونہ ولا دابۃ یعملون علیھا	فروخت کرنا اور نہ ان کے روزمرہ کھانے کی اشیاء
ولا تضربن احدا منھم سوطاً	کو اور نہ ان جانوروں کو جن سے وہ کاشت کرتے
واحداً فی درھم ولا تقمہ علی رجلہ	ہیں اور نہ ان کو ایک کوڑا تک مارنا اور نہ ایک درہم کی
فی طلب درھم ولا تبع لاحد	خاطر ان کو کھڑا ہونے کی سزا دینا اور نہ خراج داروں کے ضروری
منھم عرضاً فی شیء من الخراج[1]	سامان میں سے کوئی شے خراج میں وصول کرنا۔

یعنی ان کو اس قدر مہلت دو کہ وہ حالات کی درستی کے بعد بآسانی ادا کر سکیں اور اگر ان کے آلاتِ کاشت کو یا بعض دوسری ضروریاتِ زندگی کو "خراج" میں لے لیا گیا تو پھر نہ صرف یہ کہ ان کی

---

[1] کتاب الخراج ۱۶۔

زندگی برباد ہو جائیگی بلکہ ساتھ ہی حکومت کے لگان اور مالگزاری کی آمدنی میں بھی کمی ہوتی چلی جائیگی۔

پس جو معاشی نظام ان ذمی کاشتکاروں کے لئے "جو کہ کاشتکار ہونے کے علاوہ حکومت اسلامی کی رعایا بھی ہیں" مسطورہ بالا مظالم کا سد باب کرتا اور ان کی بجائے بہتر سے بہتر حسن سلوک کا حکم دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نظام ان کاشتکاروں کے حق میں کب ایسے مظالم کو برداشت کر سکتا ہی جو حکومت یا زمیندار کے ساتھ یا تو اجارہ کا معاملہ رکھتے ہیں اور یا مزارعۃ کا یعنی وہ اور زمیندار باہمی تعاون کے محتاج ہو کر معاملہ میں ایک دوسرے کے مساویانہ طور پر شریک ہیں اور اس لئے بلاشبہ وہ مسطورہ بالا حسن سلوک کے زیادہ سے زیادہ مستحق ہیں۔

(۷) دور اسلام سے قبل، اور دور حاضر دونوں تک یہ دستور رہا ہے کہ حکومت، زمینداروں کو اجازت دیدیتی ہے کہ سرکاری افتادہ مگر شاداب و سبزہ زار زمینوں کو معمولی ٹیکس کے ذریعہ یا مفت "حمی" چراگاہیں بنالیں اور ان کی حدود بندی کر کے ان کے درختوں اور گھاس وغیرہ سے عظیم الشان فائدے حاصل کریں اور چوپاؤں کی افزائش نسل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں، اس کو عربی میں حمی اور اردو میں "رکھنا" کہتے ہیں۔

اس سے عموماً عوام اور غریب کاشتکاروں کے لئے ایک مصیبت نازل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مویشیوں کے لئے چارہ سے محروم ہو کر سخت دقتیں برداشت کرتے ہیں۔

(۷) اسلام نے اس ظالمانہ طریقہ کو رد کردیا اور ایسا کرنے کی سخت ممانعت کردی۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم لا حمی الا للہ ورسولہ۔ (بخاری کتاب المزارعۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حمی" یعنی مویشیوں کے لئے چراگاہ کی حد بندی اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی کے لئے روا نہیں ہے۔

یعنی یہ حق صرف خلافت (حکومت) کا ہے کہ جہاد اور صدقات کے مویشیوں کے لئے چراگاہ محدود کر دے، اس کے علاوہ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔

اس کی شرح میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

اقول لما کان الحمیٰ تضییقاً
علی الناس وظلماً علیھم و
اضرارً انھی عنه [1]

میں کہتا ہوں جب کہ حمیٰ کا دستور لوگوں کی ضروریات
میں دشواری کا باعث اور ان کے مفادِ عامہ پر ظلم تھا اور باعث
نقصان تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو باطل فرمادیا۔

اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے تو یہ بھی اعلان کردیا کہ اگر بارش کی کمی یا کسی اور وجہ سے خود رو گھاس کی کمی ہو اور افرادِ ملک کے مویشی چارہ سے محروم ہو جائیں تب سرکاری "حمیٰ" (رکھ) بھی پبلک مفاد کے لئے عام کردیا جائے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

عن اسلم قال رأیت عمر بن
الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ
استعمل مولی له علی الحمیٰ فقال
له "ویحك یا ھنی ضم جناحك
عن الناس واتق دعوۃ المظلوم
فان دعوۃ مجابة ادخل لی رب
الصریمة ورب الغنیمة ودعنی
من نعم عثمان بن عفان
وابن عوف فان ابن عفان
وابن عوف ان ھلکت ما
شیتھما رجعا الی المدینة
الی نخل وزرع وان ھذا
المسکین ان ھلکت ماشیته
جاءنی بصبیه: یا امیر المؤمنین

زید بن اسلم اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے
میں حضرت عمرؓ کے پاس اس وقت موجود تھا جب
انھوں نے اپنے آزاد شدہ غلام "ہنی" کو سرکاری چراگاہ
پر نگراں بنایا تو فرمانے لگے اے ہنی خبردار اپنے بازوؤں
کو لوگوں سے سمیٹے رکھو اور مظلوم کی بددعا سے پرہیز کر
اس لئے کہ وہ خدا کے یہاں مقبول ہے تو میری اس
قائم کردہ چراگاہ میں بکریوں اور دیگر چوپایوں کے
ریوڑ والوں کو اجازت دے کہ وہ چراگاہ میں چرائیں
اور عثمان بن عفان اور ابن عوف کے چوپایوں کی پرواہ
نہ کر اس لئے کہ اگر ان کے چوپائے ہلاک بھی ہو جائیں
تو وہ مدینہ میں اپنے کھجوروں کے باغ اور زمین کی کاشت
سے فائدہ اٹھا سکیں گے اور اگر ان چرواہوں
کے چوپائے مر گئے تو یہ مسکین چھوٹے بچوں کو لے کر آئیں گے
اور امیر المومنین! امیر المومنین کہہ کہہ کر امداد طلب

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۰۴۔

یا امیر المؤمنین والماء	کریں گے اس لئے بیت المال کی رقم پر بوجھ ڈالنے سے
والکلاء اھون علی من	میرے لئے یہ زیادہ آسان ہے کہ ان کو چراگاہ کے
ان اغرم لہ۔ [1]	گھاس پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت رہے۔

(۸) ایک یہ بھی دستور تھا کہ زمیندار، خود رو گھاس، تالاب، اور کھیتوں کا پانی اور خود رو درختوں کی خشک لکڑی پر بھی بلا شرکت غیرے قابض رہتے تھے اور اپنی زمین کی ملکیت کے دعویٰ سے دوسروں کو اس سے نفع نہیں اٹھانے دیتے تھے یہ بھی عوام اور غرباء کے ایسے مفاد میں ظالمانہ دست برد تھی جس کو خدائے تعالیٰ کی سخاء عام نے بغیر محنت ان کو بخشا تھا۔

(۸) اسلام نے اس قبضہ کی بھی مخالفت کی اور ان چارہ ہائے مویشی کے علاوہ جنکو غلہ کی طرح بیج ڈال کر اور محنت کر کے بویا جاتا ہے" اپنے مقام روئیدگی میں ان سب کا مفاد عام کر دیا اور کسی کو ان کی ذاتی ملکیت کا حق نہیں بخشا۔ الا اس قدر کہ محنت سے حاصل کر کے اس کو اپنی ملکیت میں لے آئے جیسا کہ گھسیاروں کا گھاس کاٹ کر اپنی ملکیت میں کر لینا یا سقہ کا اپنی مشک میں پانی بھر کر مالک ہو جانا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلے اللہ
عنہ عن النبی صلی اللہ	علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے
علیہ وسلم قال لا تمنعوا	فرمایا کہ ضرورت سے بچے ہوئے پانی سے لوگوں
فضل الماء لتمنعوا بہ	کو اس لئے روکا کرو کہ اس بہانے سے تم کو
فضل الکلاء مسلم	فاضل گھاس سے روکنے کا موقعہ مل جائے۔
ولابی داؤد المسلمون	اور ابوداود میں ہے کہ تمام مسلمان پانی گھاس
شرکاء فی ثلاث فی	اور سوختہ میں باہم کے شریک ہیں۔
الماء والکلاء والنار	

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۰۵۔

اور صحاح کی بعض روایات میں نمک کا اضافہ ہے اور بعض روایات میں ایسا کرنے والے پر قیامت میں خدا کے غضب نازل ہونے کی وعید آئی ہے۔

قال ابو عبید وھو عندی فی الارض التی لھا ربٌ ومالکٌ ویکون فیھا الماء العِدّ الذی وصفناہ والکلاء الذی تنبتہ الارض من غیر ان یتکلف لھا ربھا لہ ذلک غرسا ولا بذرا[1]

ابو عبید کہتے ہیں یہ حکم میرے نزدیک اس زمین کے بارہ میں ہے جو کسی شخص کی مملوکہ ہو اور اس میں بیان کردہ جاری چشمہ کی طرح کا پانی ہو یا بغیر بیج ڈالے اور کھیتی کئے خود رو گھاس اُگی ہوئی ہو۔

ومن السحت ما یوخذ علی کل صباح ملح وکلاء وماء ومعادن الخ

اور وہ ٹیکس ظلم ہے جو نمک، گھاس، پانی اور ظاہری کانوں پر لیا جائے۔

قال ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ ولو ان اھل قریۃ لھم مروج یرعون فیھا ویحتطبون منھا قد عرف انھا لھم فھی لھم علی حالھا یتبایعونھا و یتوارثونھا ویحدثون فیھا ما یحدث الرجل فی ملکہ ولیس لھم ان یمنعوا الکلاء ولا الماء ولا اصحاب المواشی ان یرعوا فی تلک المروج ویستقوا من

ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں! اور اگر کسی اہل بستی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کی چراگاہیں ہیں جس میں وہ اپنے مویشیوں کو چراتے اور اس سے سوختہ حاصل کرتے ہیں ان کی ذاتی ملک ہے تو وہ ذاتی ملک ہی رہیں گی اور ان کو اس کے فروخت کرنے خریدنے اور ترمیم و تنسیخ کرنیکا حق ہے اور اسمیں ان کی وراثت بھی جاری رہیگی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کو یہ حق ہرگز نہیں ہے کہ وہ چراگاہ کی خود رو گھاس اور اسکے پانی سے دوسروں کو روکیں اور چرواہوں اور مویشیوں والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

[1] الاموال لابی عبید ص ۳۰۰ [2] درمختار علی حاشیہ رد المحتار ج ۲ ص ۲۰۲

تلک المیاہ الجزلہ — بغیر روک ٹوک ان چراگاہوں میں چرائیں اور ان کو پانی نہیں پلائیں"۔

یعنی اگر چراگاہیں حکومت کی ذاتی ملک اور افتادہ زمینوں کی قدرتی چراگاہیں نہ بھی ہوں اور زمینداروں کی ذاتی ملک بھی ہوں تب بھی ان کو خودرو گھاس اور پانی سے دوسروں کو فائدہ اٹھانے سے روکنے کا حق نہیں ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں میں تمام افراد برابر ہیں۔

مسطورہ بالا مظالم کا انسداد اور ان کی جگہ عادلانہ اصلاحات وانقلابات کے علاوہ اس سلسلہ میں چند اور مراعات بھی ہیں جو اس لئے مستاجر اور کاشتکار کے حق میں تسلیم کی گئی ہیں کہ معاملہ زیر بحث میں باہمی تعاون اور شرکت منافع کا جو مقصد ہے وہ فوت نہ ہونے پائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی تعمیل ہو سکے "جو باہمی معاملات کے لئے ایک بیش بہا اصول ہے۔

عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ضرر ولا ضرار (مسند احمد)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام معاملات زندگی میں یہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔

ارشاد مبارک کا مطلب یہ ہے کہ صرف لین دین کے معاملات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر اس شعبہ میں کہ جو باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا محتاج ہے یہ گرانقدر اصول پیش نظر رہنا چاہیئے کہ نہ مجھ کو نقصان اٹھانا چاہیئے اور نہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہیئے اور جو کچھ بھی ہو عدل و مساوات اور اخوۃ ومواساۃ کے نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، لہٰذا اسلام کے معاشی نظام میں بھی اس اصول کو بنیاد کار بناتے ہوئے حسب ذیل دفعات کا اعلان کیا گیا ہے:۔

(۱) اگر کوئی زمین، پانی میں غرق ہو جائے یا خشک سالی پیش آجانے کی وجہ سے قابل زراعت نہ رہے یا کسی آفت سے کھیتی تباہ ہو جائے تو اس سال کا خراج (مالگذاری) معاف

سلہ کتاب الخراج ص ۱۰۲ و شامی ج ۵ کتاب احیاء الموات ص ۳۸۸۔

ہے اور اگر آفت سے نقصان پہنچ گیا ہے تو بقدر نقصان معافی ہوگی اور خراج کی اس معافی میں خراجِ موظف (نقدی لگان) اور خراجِ مقاسمہ (بٹائی) دونوں کا یکساں حکم ہے۔

ولا خراج ان غلب علی ارضہ الماء او انقطع او اصاب الزرع آفۃ الخ[1]

اور اگر کاشتکار کی زمین کو پانی کے سیلاب نے غرق کر دیا یا پانی سے محرومی نے زمین کو ناقابلِ کاشت بنا دیا یا کھیتی کو کسی آفت نے برباد کر دیا تو ان سب صورتوں میں زمین کا خراج (مالگذاری) معاف ہے۔

اور اگر کھیتی کو صرف نقصان پہنچا ہے تو بقدر نقصان معاف ہوگا اور خلیفہ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ ارض حکومت کے مزارعین کو حسب صوابدید کل خراج (مالگذاری) بھی معاف کر سکتا ہے۔[1]

(۲) اگر کاشتکار نے حکومت یا زمیندار سے زمین کو اجارہ "بر بٹائی" (مزارعۃ) سے لیا ہے تو اس صورت میں بھی ان تینوں حالتوں میں مالگذاری اور لگان قطعاً معاف ہیں اور اگر کھیتی کو صرف نقصان پہنچا ہے تو بقدر نقصان معاف ہوگا اور موجودہ پیداوار ہی کی بٹائی کی جا سکے گی۔

(۳) اور اگر زمین کو نقد لگان (کراء الارض) پر لیا ہے تو اکثر فقہاء اسلام کے نزدیک اس صورت میں بھی تینوں حالتوں میں لگان یا مالگذاری معاف ہے اور امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک زمین کے غرق آب ہو جانے اور پانی سے محروم ہو کر ناقابل کاشت ہو جانے پر تو معاف ہے لیکن کھیتی پر آفت آجانے سے امام ابوحنیفہؒ کے فقہ میں حسب ذیل تفصیلات ہیں۔

وحل استاجر ارضا لیزرعہا فزرعہا فاصاب الزرع آفۃ فهلک او غرق ولم ینبت کا[2]

کاشتکار نے اگر زمین کو کاشت کے لئے نقد لگان پر لیا اور اسکو بو لیا جوت لیا کھیتی کر لی پھر کھیتی کو آفت نے اکھیڑا اور برباد ہو گئی یا پانی میں غرق ہو گئی اور پیداوار نہ ہوئی تو لگان کے

---

[1] کنز مع شرح بحر الرائق ج ۵ باب الخراج ص ۱۱۷ [2] کتاب الخراج ص ۸۶ -

عليه الاجر ولو غرقت الارض
قبل ان يزرعها فلا اجر عليها
وكذا لو غصبها رجل فزرعها
وذكر الشيخ الامام المعروف
بخواهر زاده انه اذا استاجر
ارضا للزراعة فزرع فاصطلم الآفته
كان عليه اجر ما بقي وسقط عليه
اجر ما بقي من المدة الا بعد
الاصطلام ۔ [1]

رجل استاجر ارضا فزرعها
فلم يجد ماء يسقيها فيبس
الزرع قالوا ان استاجرها بغير
شرب فلم ينقطع ماء النهر الذي
يرجى منه السقي فعليه الاجر وان
انقطع كان له الخيار وان استاجرها
بشربها فانقطع عنه الشرب فجاء
وقت الذي يفسد فيه الزرع
عند انقطاع الماء ففسد الزرع
سقط عنه الاجر الخ

ولو استاجر ارضا بشربها للزرع

ذمہ واجب رہا اور اگر زمین کھیتی سے پہلے ہی غرق آب
ہو گئی تو لگان معاف ہو جائیگا اور اسی طرح اگر کھیتی
سے قبل کسی غاصب نے زبردستی زمین پر قبضہ کرکے اسکو
کاشت کر لیا تو کاشتکار کے ذمہ لگان واجب نہیں ہوگا
اور شیخ امام مشہور بخواہر زادہ فرماتے ہیں کہ اگر کاشتکار نے
کھیتی کر لی اور بعد میں زراعت کسی آفت سے برباد ہو گئی
تو اس صورت میں بھی پورا لگان واجب نہیں ہوگا بلکہ جس
عرصہ تک کاشت موجود رہی اس مدت کا لگان واجب
ہوگا اور تباہی کے وقت سے آخر سال تک معاف ہو جائیگا

"کاشتکار نے اگر زمین کو لگان پر لیا اور اسمیں کاشت کی
پھر پانی میسر نہ آیا اور کھیتی خشک ہو گئی تو فقہا کہتے ہیں کہ اگر
کاشتکار نے پانی کی شرط کے بغیر لگان پر لیا ہے اور جس نہر سے
پانی مل سکتا تھا اس کا پانی بھی منقطع نہیں ہوا تو اس صورت
میں کاشتکار پر لگان واجب ہے اور اگر پانی کی سبیل منقطع
ہو گئی اور وہ مل نہیں پڑتا تو اس کو اختیار ہے کہ وہ زمین
کو واپس کر دے اور اگر زمین پانی کی شرط کے ساتھ لی ہے
اور پانی کے ذرائع منقطع ہو گئے اور وقت آگیا کہ جب پانی
کی محرومی کی وجہ سے کھیتی ضائع ہو جاتی ہے اور ضائع ہو گئی تو
اس صورت میں کاشتکار سے لگان معاف ہے۔

"اور اگر زمین کو پانی کی شرط کے ساتھ کھیتی کیلئے لیا ہے اور پھر

[1] فتاوی قاضی خان ج ۳ ص ۳۰۴ کتاب الاجارات

فلم يستطع سقيها فهو بالخيار ان شاء ردها وان شاء امسكها فان لم يرد حتى مضت المدة كان عليه الاجر اذا كان بحال يمكنه ان يحتال بحيلة ويزرع فيها شيئاً بغير ما يوجبه من الوجوه ولا حيلة في ذلك فلا اجر عليه الخ

بڑی نہر خراب ہوگئی اور یہ گونوں اور جوہڑوں سے پانی حاصل نہ کر سکا اور سیرابی کی صورت نہ بن پڑی تو اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو زمین کو واپس کر دے اور چاہے تو قبضہ میں رکھے۔ پس اگر واپس نہ کی اور مقررہ مدت ختم ہو گئی تو اگر یہ صورت ہے کہ اس کو ایسے ذرائع ممکن ہیں کہ بغیر پانی کے وہ اس میں زراعت کر سکتا ہے تب تو لگان واجب ہوگا اور اگر زراعت کی کوئی صورت بھی نہیں ہو سکتی تو لگان واجب نہیں ہے۔"

رجل استاجر ارضا فانقطع الماء ان كانت الارض تسقى بماء الارض وماء المطر وانقطع ماء المطر ايضا لا اجر عليه لانه لم يتمكن من الانتفاع بها الخ [1]

اگر کسی کاشتکار نے زمین کو نقد لگان پر لیا پھر پانی میسر نہ آسکا اور زمین کنویں وغیرہ کے پانی اور بارش کے پانی دونوں سے سیراب ہوتی ہے اور بارش کا پانی بھی منقطع ہو گیا تو اس صورت میں لگان ساقط ہے اس لئے کہ اس صورت میں وہ زمین سے فائدہ اٹھانے پر قادر نہیں ہے۔"

اور جن بعض صورتوں میں امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ کے نزدیک لگان واجب رہتا ہے۔ ان کے نزدیک بھی یہ فیصلہ ہے کہ زمیندار کو کاشتکار سے اس وقت تک مطالبہ نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ اس کے حالات درست نہ ہو جائیں اور وہ بآسانی لگان ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائے چنانچہ شیخ منصور علی ناصفؒ "التاج الجامع الاصول" کے باب "وضع الجوائح" سے متعلق احادیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ظاهر ما تقدم ان من استاجر ارضا ودفع اجرها او اشترى زرعا

اس سے قبل جو احادیث مذکور ہوئیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی نے زمین کو نقد لگان پر لیا اور زراعت کی یا زراعت

[1] فتاویٰ قاضی خان ج ۳ ص ۳۰۳

او ثمرا بعد ما بدا صلاحه ثم
اصابته جائحة فالحكم وضعها
اى سقوط اجارة الارض
وثمن الزرع والثمر بسببها
وعليه جماعة ومنهم الشافعى
فى القديم وقال فى الجديد
ابو حنيفة عليه الضمان ولكن
ينبغى للمداين التساهل
معه للحديث الاول الخ
لہ

کو یا درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کو ان کے قابلِ استعمال
ہونیکے بعد خرید گیا پھر اسکو آفت نے آدبایا، اور برباد کر دیا"
تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ لگان اور زمین اور پھلوں کی
قیمت دونوں مستاجر اور خریدار سے ساقط ہو جائیں گی اور
اسی پر فقہا کی ایک جماعت نے فتویٰ دیا ہے اور امام شافعیؒ
کا قول قدیم بھی یہی ہے اور ان کا قول جدید اور امام ابو حنیفہؒ کا
قول یہ ہے کہ ان تفصیلات کے ساتھ جو گذشتہ سطور میں بیان
ہو چکیں، کاشتکار پر لگان اور خریدار پر قیمت واجب ہے۔
لیکن صاحب زمین اور صاحب "ثمر" کو چاہیے کہ حدیث
اول کے مطابق اپنے مطالبہ میں سہولت اور نرمی کا معاملہ کرے۔

لیکن لگان کی کمی اور معافی کا یہ حکم ان ہی صورتوں میں ہے کہ زمین اور کھیتی پر آئی ہوئی تباہی مستاجر کے اختیار سے باہر ہے اور اگر یہ تباہی اور خرابی اپنے ہاتھوں سے لائی گئی ہے یا جان بوجھ کر غفلت برتی گئی ہے تو پھر کمی یا معافی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ صاحب زمین کو نقصان پہنچانا ہے اور "ضرار" میں داخل ہے۔

(۴) اگر کاشتکار زمین کا خود مالک نہیں ہے اور حکومت اور کاشتکار کے درمیان زمیندار کا بھی دخل ہے تو سرکاری مالگذاری (عشر یا خراج) اصولاً زمیندار کے ذمہ ہے نہ کہ کاشتکار کے ذمہ۔ چنانچہ فقہ میں اس کی جو جزئیات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ تصریحات موجود ہیں۔

والحاصل ان العشر عند
الامام على رب الارض
مطلقا وعندهما الذى لك

حاصل کلام یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عشر ہر حالت
میں مالک زمین کے ذمہ واجب ہے اور امام ابو یوسفؒ
اور امام محمدؒ کے نزدیک بھی یہی حکم ہے اگر یہ مالک زمین

لہ ج ۲ ص ۲۶۲

لوالبذر ولو من العامل فعليهما ثم اعلم ان هذا كله فی العشر اما الخراج فعلیٰ رب الارض اجماعاً الخ [۱]	کے ذمہ ہے اور اگر کاشتکار کے ذمے ہے تو دونوں کے ذمہ بقدر حصہ ہوگا۔ اور واضح رہے کہ یہ تفصیل بھی صرف عشر کے متعلق ہے لیکن خراج اور نقد لگان (کراء الارض) میں باتفاق ہر صورت میں مالگذاری زمیندار کے ذمہ ہے۔
وفی المزارعۃ ان کان البذر من رب الارض فعلیہ ولو من العامل فعلیہما بالحصۃ الخ [۲]	اور مزارعۃ (بٹائی) میں اگر بیج مالک زمین کا ہے تو "عشر" اسی پر واجب ہوگا اور اگر کاشتکار کے ذمے بیج ڈالنا ہے تو دونوں پر حصہ رسدی واجب ہوگا"۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں سرمایہ (زمین) اور محنت میں عادلانہ توازن کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے اور خاص مسئلہ میں محنت کو سرمایہ کے مقابلہ میں نفع کا حق زیادہ دیا گیا ہے، نیز ان مسائل میں مالگذاری کے واجب ہونے نہ ہونے میں بیج کو اس لئے اہمیت دی گئی ہے کہ زمین کی کاشت کے مسئلہ میں جس کے ذمہ بیج ہوتا ہے حقِ انتفاع بھی اسی کو زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

(۵) اگر زمین سرکاری ہے اور کاشتکار مقررہ لگان (کراء الارض) ادا کر رہا ہے تو اس کو زمین سے بے دخل نہیں کیا جائیگا اور یہ اس لئے کہ کاشتکار جب کہ زمین نہیں رکھتا اور اسنے اپنی معاشی زندگی کے لئے ایک زمین کو کرایہ پر حاصل کیا ہے تو اس کا یہ حق ہونا چاہئے کہ جب تک وہ زمین کا واجبی لگان ادا کرتا رہے اس سے یہ معاشی ذریعہ چھینا نہ جائے۔ چنانچہ شامی نے ارضِ موقوفہ کی بحث میں یہ تصریح کی ہے۔

ثم اعلم ان اراضی بیت المال المسماۃ باراضی المملکۃ و	یہ واضح رہے کہ بیت المال کی زمین کہ جن کو ارض حوز اور ارض مملکت کہا جاتا ہے ان کو اگر کاشتکار کاشت

---

[۱] بحر الرائق ج ۵ ص ۱۱۷۔ [۲] رد المحتار ج ۲ باب العاشر ص ۷۶

الأراضي الممحورة إذا كانت في أيديهم يزرعونها لا تنزع من أيديهم ما داموا يؤدون ما عليها ولا يورث عنهم إذا ماتوا ولا يصح بيعهم لها ولكن جرى الرسم في الدولة العثمانية ان من مات عن ابن انتقلت لابنه مجاناً والا فلبيت المال الخ [1]

کرتے رہیں اُن زمینوں کو ان کے قبضہ سے نہیں نکالا جائیگا مگر وہ ان میں وراثت نہیں چلا سکتے اور نہ ان زمینوں کو فروخت کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن دولت عثمانیہ میں یہ رسم جاری ہوگئی ہے کہ اگر کسی کاشتکار کے انتقال کے وقت اس کا لڑکا موجود ہے تو وہ سرکاری زمین اس کی جانب مفت منتقل ہوجاتی ہے ورنہ تو پھر بیت المال ہی کی جانب واپس ہوجاتی ہے۔"

یہ حکم اگرچہ زمین وقف اور زمین حکومت سے متعلق ہے لیکن کاشتکار کے قبضہ سے نکالنے کی جو فقہی وجہ بیان کی گئی ہے "کہ وہ مقررہ لگان برابر ادا کر رہا ہے" چونکہ یہ وجہ شخصی زمیندار کی زمین پر بھی صادق آتی ہے اس لئے خلیفہ اور امیر المومنین کے اختیار میں ہے کہ وہ اگر چاہے تو یہی شخصی اراضی پر بھی عائد کر دے۔

نیز اس لئے بھی کہ جب کاشتکار کسی زمین کو محنت کے ذریعہ قابلِ کاشت بناتا ہے تو وہ یہ محنت اس یقین پر کرتا ہے کہ اس محنت کا پھل اسکے حصہ کے مطابق اس کو ضرور ملتا رہیگا پس اگر زمیندار کو یہ حق بغیر کسی قید و شرط کے حاصل ہو کہ وہ جب چاہے کاشتکار کو زمین سے اس لئے بے دخل کر دے کہ وہ مالک زمین ہے تو ایسی حالت میں وہ کاشتکار کے اس نفع کا غاصب ہوتا ہے جس کو کاشتکار کی محنت نے کاشتکار کے لئے وقتی کاشت کے علاوہ بطور ثمرۂ محنت کے بخشا تھا

البتہ اگر "زمین معقد" کے عرصہ بعد حالات و واقعات کی بناء ازدیاد لگان کی مستحق ہے تو بلاشبہ صاحبِ زمین کو ازدیاد کے مطالبہ کا اسی طرح حق ہے جس طرح خصوصی حالات و واقعات

[1] رد المختار ج ۳ باب العشر والخراج والجزیہ ص ۲۵۵۔

کی بناپر استفاص دکھی ہے کہ مطالبہ کا کاشتکار کو حق حاصل ہے۔

(۹) اگر کاشتکار نے رہنے کے مکان میں یا کاشت کی زمین میں کوئی درخت لگالیا ہو اور اس سے زمین کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا تو صاحب زمین اس درخت کو اکھاڑنے پر مجبور نہیں کر سکتا اور اگر لگانا چاہتا ہے تو صاحب زمین کو اجازت دیدینی چاہئے اور یہ درخت کاشتکار ہی کی ملکیت میں رہے گا البتہ جب وہ زمین سے بیدخل ہوجائے یا اجارہ فسخ ہوجائے تو صاحب زمین اگر اپنی زمین کو اس درخت سے خالی کرانا چاہے تو کاشتکار کو اپنا درخت اکھاڑ لینا ہوگا۔

للمستاجر غرس الشجر بلا	ناظر وقف کی اجازت کے بغیر کاشتکار کو درخت لگالینے کا
اذن الناظر اذا لم یضر	حق ہے بشرطیکہ زمین کو اس سے نقصان نہ پہنچتا ہو اور
بالارض ولیس له حفر	اسکو ناظر کی اجازت کے بغیر زمین کی کھدائی کا حق نہیں
الا باذن ویاذن لو خیرا	ہے مگر ناظر کو چاہئے کہ اگر زمین کے لئے یہ امر بہتر ہے
والا لا وما بناه مستاجر	اور مضر نہیں ہو تو اجازت دیدے ورنہ نہیں۔ تاہم کاشتکار
او غرس فلم مالم ینوه	نے جو مکان بنایا ہے یا جو درخت لگایا ہے وہ کاشتکار
للوقف الخ عه	ہی کا ہو جب تک کہ وہ اسکو وقف نہ کردے"

غرض یہ اور اسی قسم کے اور حقوق ہیں جو کاشتکار کی آسانیوں اور سہولتوں کے پیش نظر قائم کئے گئے ہیں کیونکہ مبسوط اور دیگر کتب فقہ سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ مزارعت اور اجارہ زمین کے جواز کا اہم مقصد تعاونِ باہمی کے ساتھ ساتھ مستاجر (کاشتکار) کی معاشی حاجت کا انسداد اور رفع ضرورت ہے۔ لہ

لہ نوٹ :۔ اس بحث میں چند امور قابل لحاظ ہیں۔

(الف) خراج ان زمینوں پر عائد ہوتا ہے جو کاشت کرنیوالوں کی ذاتی ملکیت ہوتی ہیں، اور اگر حکومت (بقیہ ص ۲۱۸)

عہ درمختار بر رد المحتار ج ۳ ص ۵۹۳ بحث ارض موقوفہ و بحر الرائق ج ۸ ص ۱۳

بنجر زمینوں کو مزروعہ بنانا

زراعت کو ترقی دینے اور اس کی افادیت کو وسیع کرنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جانے چاہئیں ان میں سے ایک ذریعہ "احیاء اموات" ہے یعنی بنجر زمینوں کو کاشت کے قابل بنانا، گویا ناقابل کاشت زمین، مردہ زمین ہے۔ اور اس کو قابلِ کاشت بنانا اس کو زندگی بخشنے کے مرادف ہے چنانچہ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے قرآنِ عزیز نے یہی اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے۔

فاحیینا بہ الارض بعد موتھا — پھر زندہ کر دیا ہم نے پانی سے زمین کو اسکے مرجانے کے بعد

خشک چٹیل میدان، ریتلی زمینیں، پتھریلی زمینیں، اور خشک ٹیلے، عام طور پر ناقابلِ زراعت ہوتے ہیں مگر سخت محنت اور بعض زراعتی تدابیر کے ذریعہ ان میں سے اکثر حصہ کو قابلِ کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ بس اسلام کے معاشی نظام کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے کہ ملک کی اس قسم کی تمام زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا جائے اور خام پیداوار سے ملک کو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۷) یا کسی دوسرے فرد کی زمین کو نقد اجرت پر کاشت کے لئے لیا جائے تو وہ اجرتِ ارض کہلاتی ہے کتاب میں دونوں باتوں کی تفصیل کے باوجود ان مسائل میں دونوں کو ایک لفظ "لگان" ہی سے تعبیر کیا ہے اسلئے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے ان مسائل میں دونوں کے احکام یکساں ہیں اور جن احکام میں فرق ہے وہ یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

(ب) عام بول چال میں لگان اور مالگذاری میں فرق ہے اگرچہ حاصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کاشتکار اگر خود مالکِ زمین ہے تو اس سے وصول شدہ ٹیکس "مالگذاری" کہلاتا۔ اگر حکومت اور کاشتکار کے درمیان زمیندار ہے تو حکومت جو ٹیکس زمیندار سے لیتی ہے وہ مالگذاری کہلاتا ہے اور زمیندار کاشتکار سے جو محاصل لیتا ہے وہ لگان ہے۔

(ج) "عشر" کے علاوہ "جو کہ ایک مقررہ زکوٰۃ ہے" تخفیف لگان و مالگذاری کے مسائل "خراج" اور "اجارہ" (کراء الارض) دونوں سے متعلق ہیں۔

مالا مال کیا جائے اور حتی الامکان زمینوں کو بنجر نہ رہنے دیا جائے اسی طرح جو زمینیں قابلِ کاشت ہونے کے باوجود غیر آباد پڑی ہیں یا لاوارث ہیں انکو مزروعہ بنایا جائے اور بیکار و معطل نہ رہنے دیا جائے۔

اسلام کے معاشی نظام میں اس کے لئے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ امیر المومنین افراد ملک کو ترغیب دے اور اعلان کرے کہ جو شخص ان زمینوں کے جس قدر حصہ کو آباد کریگا وہ اسکا مالک قرار دیا جائیگا اس کو عربی میں "اقطاع" اور اردو میں "جاگیر" کہتے ہیں۔

وللامام ان یقطع کل موات و	اور امام کو چاہیئے کہ وہ بنجر زمینوں کو اور غیر مملوکہ
کل ما کان لیس لاحد فیہ	لاوارث زمینوں کو جاگیر کے طور پر دیدے (تاکہ
ملک ولیس فی ید احد ویعمل	وہ مزروعہ بن سکیں) اور ان کے سلسلہ میں ایسا
فی ذلک بالذی یریٰ انہ	عمل اختیار کرے جس میں تمام مسلمانوں کی بھلائی
خیر للمسلمین واعم نفعا لہ	اور نفع عام ہو۔"

اور فقہاء کے نزدیک بنجر زمین سخت زمین، ریتلی یا ریت چڑھی ہوئی زمین، پتھریلی زمین ٹیلے جو جو آبادی سے دور ہوں، اور جن کا کوئی مالک ہے، یا مالک کا پتہ نہیں چلتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جو زمین ناکارہ پڑی ہو اور اس کی بیخرابی قدیم اور عادی ہو تو یہ سب موات ہیں۔ پس اگر کسی مسلمان یا ذمی کافر نے خلیفہ کی اجازت سے اس کو زندہ (قابلِ زراعت) کر لیا تو وہ زمین اسی کی ملکیت ہو جائے گی۔ [۲]

اور اگر امام یہ سمجھ کر کہ زمین بہت زیادہ محنت اور خرچ کے بعد قابل کاشت ہو سکتی ہے ایک دو سال کا لگان بھی معاف کر دے تو اس کو ایسا کرنیکا مجاز ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی زمینوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

من عمر ارضا لیست لاحد ——— جس شخص نے ایسی زمین کو کاشت کے قابل بنالیا جو

[۱] کتاب الخراج ص ۶۶ [۲] سعیدیات فی المعاملات ص ۳۰۰ و ۲۰۱

فهو احق بها ۔۱؎   کسی کی ملک نہیں ہے تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے۔

من احیا ارضا مواتا فهی له ۔۱؎   جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کر لیا وہ اسی کی زمین ہے

لیکن اس کے لئے تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ زمین فناءِ شہر میں شامل ہو یعنی عام شہری ضروریات کے کام میں نہ آتی ہو۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:۔

"اور اے امیر المومنین! آپ نے ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو فوج کشی کے ذریعہ سے یا مصالحت کی راہ سے فتح کی گئی ہیں۔ اور ان زمینوں کے متعلق دریافت کیا ہے جو بعض دیہاتوں میں اس حالت کے اندر موجود ہیں کہ نہ ان میں مکان ہونے کے نشانات پائے جاتے ہیں اور نہ زراعت کے تو ان کے متعلق کیا مشورہ ہے؟ پس اگر ایسی زمینوں میں نہ مکانیت کے اثرات ہوں اور نہ زراعت کے اور نہ وہ اہلِ بستی کے حق میں "فئی" ہو اور نہ قبرستان ہو اور نہ چراگاہ اور نہ وہ کسی کی ملکیت ہو اور نہ کسی کی مقبوضہ تو ایسی زمین "ارض موات" ہے پس جو شخص اس کو یا اس میں سے کچھ بعض حصہ کو زندہ (کاشت) کرے تو وہ اسی کی ملک ہو جائے گی" اور آپ کے لئے ایسی زمینوں کے متعلق جاگیر کے طور پر دینے کا بھی اختیار ہے۔ اگر مناسب سمجھیں اور اجرت پر کاشت کرا لینا یا کوئی دوسرا مناسب طریقہ اختیار کرا لینا بھی جائز ہے۔۲؎

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایسی زمین پر اجازت امام سے قبضہ کر لینے کے بعد تین سال تک اس کو بنجر ہی رہنے دیا اور جاگیر دینے کا جو مقصد تھا وہ پورا نہ کیا تو وہ زمین اس کے قبضے سے نکال لی جائے گی اور کسی دوسرے شخص کو دیدی جائے گی جو اس کو کاشت کرے اس لئے کہ اس نے اس مفاد کو پورا نہ کیا جس کے لئے زمین اس کو بطور جاگیر دی گئی تھی۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

عادی الارض لله وللرسول ۳؎   افتادہ (غیر مملوکہ) زمین اللہ اور اس کے رسول (خلافت) کی ہے

۱؎ مسند احمد و بخاری۔ ۲؎ کتاب الخراج ص ۶۴ ۳؎ ص ۶۳ و ۶۴

ثم لکم من بعد فمن احیاء	کو ہی۔ پھر ان کے بعد تمہارے لئے ہے بس جس شخص
ارضا میتا فھی لہ ولیس	نے اس کو زندہ (کاشت) اگر لیا تو وہ اسی کی ملک
لمحتجر حق بعد ثلاث	ہے اور بے کاشت روک رکھنے والے کا حق تین
(الحدیث) ؎	سال کے بعد ساقط ہو جاتا ہے۔

بلالؓ بن حارث مزنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بہت بڑا مربعہ جاگیر کے طور پر دیدیا تھا، مگر وہ اس تمام کو کاشت میں رکھنے سے معذور تھے اس لئے ایک کافی حصہ اراضی بیکار پڑی رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو بلاکر فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تم کو اس لئے جاگیر دی تھی کہ اس کو کام میں لاؤ اور فائدہ اٹھاؤ مگر تم بڑے حصہ اراضی کو تم کام میں لانے سے معذور ہو، لہٰذا بقدر ضرورت رکھ لو اور باقی واپس کردو تاکہ میں حاجتمند مسلمانوں میں تقسیم کردوں۔

فقال لا افعل واللہ شیئاً	بلال بن حارث نے جواب دیا کہ یہ جاگیر رسول اللہ صلی اللہ
اقطعنیہ رسول اللہ صلی اللہ	علیہ وسلم کی بخشی ہوئی ہے خدا کی قسم میں ہرگز اسمیں سے کچھ نہ
علیہ وسلم فقال عمرؓ واللہ	نہ دونگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا کی قسم تجھکو یہی کرنا ہوگا اور
لتفعلن فاخذ منہ ما عجز عن	جس قدر آراضی کو وہ کام میں لانے سے عاجز تھے اسکو
عمارتہ فقسمہ بین المسلمین ؎	حضرت عمرؓ نے ان سے واپس لیکر مسلمانوں میں تقسیم کردیا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ زمین کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی حریم "نہ ہو"۔

؎ کتاب الخراج ص ۶۵ ؎ کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۹۰ و کتاب الخراج ص ۶۶ ؎ جنگل میں کنوئیں، باؤلی، تالاب اور چشمہ کی ضروریات اور ان کی حفاظت کے لئے چہار جانب جو جگہ چھوڑی جاتی ہے اس کو حریم (بارہ) کہتے ہیں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاد کے مطابق جو کنوئیں چوپاؤں کے پانی پینے کے لئے بنائے گئے ہیں انکے چہار جانب چالیس گز زمین چھوڑی جائے اور جو زراعت کے لئے بنائے گئے ہیں انکے لئے ساٹھ گز مربع زمین اور چشموں کے لئے پانچ سو گز زمین مربع چھوڑنی چاہیے۔ کتاب الخراج ص ۱۰۰ و سعیدیات جزو ۲ ص ۲۱۲۔

بنجر زمینوں کے آباد کرنے اور کاشت کے قابل بنانے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ حکومت (خلافت) خود اپنی نگرانی میں کاشت کرائے اور وہ حکومت ہی کی ملکیت رہیں۔

ایسی زمینوں کے لگان کے متعلق فقہی احکام یہ ہیں کہ اگر یہ زمین "ذمی" کے قبضہ میں دی گئی ہے تو باتفاقِ آرا، اس پر خراج مقرر کیا جائیگا اور اگر "مسلم" کے قبضہ میں دی گئی ہے تو امام ابو یوسف رح اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر وہ زمین عشری زمینوں سے ملحق یا اس کا جز ہے تو اس پر "عشر" واجب ہوگا اور اگر خراجی زمینوں سے ملحق یا اس کا حصہ ہے تو اس پر "خراج" عائد ہوگا۔

اور امام محمد رح فرماتے ہیں کہ اگر عشری زمینوں کے پانی سے اس زمین کو سیراب کیا گیا ہے تو اس پر عشر عاید ہوگا اور اگر خراجی زمینوں کے پانی سے سیراب کی گئی ہے تو خراج واجب ہوگا۔[۱]

چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب رض نے اپنے زمانہ خلافت میں اس جانب پوری توجہ فرمائی اور اذنِ عام دیدیا کہ جو شخص ایسی زمین کو آباد کریگا وہ اسی کی ملک ہو جائیگی اور اگر کسی نے قبضہ سے تین سال تک اس کو مزروعہ نہ بنایا یا آباد نہ کیا تو اس کے قبضہ سے نکال لی جائے گی اس فرمان کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس طرح قلمروِ خلافت کی تمام زمینیں مزروعہ اور آباد ہو گئیں اور حکومت کی ترقی کا باعث بنیں۔[۲]

امام ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ احیاء موات کے لئے اقطاع (جاگیر دینے) کا یہ طریقہ سلف میں مسلسل جاری رہا ہے۔

فرماتے ہیں:۔ اقطاع (جاگیر دینے) کے بارہ میں ان آثار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی مختلف قوموں کو زمینیں دی ہیں اور آپ کے بعد خلفا نے بھی اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اس عمل میں یہ حکمت سمجھی کہ اس ذریعہ سے اسلام کے ساتھ قوموں کی رغبت بھی بڑھتی ہے اور زمین کی آبادی بھی ہوتی ہے اور اسی طرح آپ کے خلفاء اسکو اسلامی بیت المال کی رفاہیت و ترقی اور دشمن کو زک دینے کا سبب سمجھتے تھے یعنی مالی خوشحالی حکومت کے ساتھ رہا

[۱] فتاویٰ عالمگیری و کتاب الخراج ص ۶۵ . [۲] کتاب الخراج ص ۶۵

کی وفاداری کا موجب ہوتی ہے۔ [1]

نہریں زراعت کی ترقی اور وسعت کے سلسلہ میں چوتھا ذریعہ وسائل آبپاشی کو سہل الحصول اور وسیع بنانا ہے۔ اسی وجہ سے زراعتی ترقی میں "نہروں" اور "آبپاشی کے کنووں" کو بہت دخل ہے اور آبپاشی کی وسعت ہی ایک ذریعہ ہے جو زراعت کی بیش از بیش ترقی کا باعث ہوتا ہے اس لئے اسلام نے بھی اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اسکو عملی صورت دینے اور اسکے افادہ کو زیادہ سے زیادہ عام بنانیکے لئے چند اصول مقرر کئے ہیں۔

(۱) تالاب، کھیتیاں، جوہڑ، کنویں اور چشمے اگر شخصی ملکیت نہیں ہیں تو ان میں تمام پبلک کا یکساں حقِ انتفاع ہے اور وہ کسی بھی حال میں شخصی ملکیت نہیں بن سکتے۔

قرآن عزیز میں ناقۂ صالح (علیہ السلام) کے واقعہ میں ہے۔

لھا شرب ولکم شرب	ناقہ کے لئے ایک دن پانی کی باری ہے معین اور تمہارے
یوم معلوم [2]	لئے ایک دن معین۔
ونبئھم ان الماء قسمۃ بینھم	اور ان کو مطلع کر دو کہ پانی ان کے اور ناقہ کے درمیان
کل شرب محتضر [3]	باری سے بٹا ہوا ہے لہذا اپنی باری پر پہنچنا چاہئے۔

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب مبسوط میں ہے۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام مسلمان تین چیزوں میں برابر کے شریک ہیں، پانی گھاس اور آگ" اور دوسری روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا ان تینوں چیزوں میں برابر کے حصہ دار ہیں اور یہ روایت پہلی روایت سے عام ہے کیونکہ اس میں مسلمان اور کافر سب کی شرکت کا اعلان ہے اور واقعہ بھی یونہی ہے کہ تمام انسان ان چیزوں میں برابر کے حقدار ہیں اور پانی کے بارہ میں یہ شرکت وادیوں کے پانی اور دریاؤں (یعنی خودرو پانی) سے متعلق مثلاً سیحون جیحون، فرات، دجلہ، نیل وغیرہ اس لئے کہ ان سے فائدہ اٹھانا ایسا ہے جیسا کہ

[1] کتاب الخراج ص ۶۲ [2] سورۂ شعراء [3] سورۂ قمر

کہ دھوپ اور ہوا سے فائدہ حاصل کرنا کہ اس میں تمام کائنات انسانی مساوی شریک ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس افادہ سے دوسرے کو روک دے یا اس کی مثال راستہ اور شارع عام کی سی ہے جس پر ہر مسلم و کافر سب کو چلنے کا برابر حق ہے اور لفظ شرکت سے اصل اباحۃ اور انتفاع میں تمام انسانوں کا مساوی ہونا مراد ہے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ان کی ملک ہے اس لئے کہ پانی وادیوں اور دریاؤں میں کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوتا۔ [۱]

(۲) اور اگر یہ پانی "شخصی ملکیت" میں بھی ہو تب بھی عام حالات میں پینے اور استعمال کرنے کے لئے دوسروں کو اس سے یکساں فائدہ اٹھانے کا حق ہے کیونکہ "پانی" اپنے مقام میں کسی کی بھی شخصی ملک نہیں ہے اور نہ اس حالت میں اس کی خرید و فروخت جائز ہے البتہ انسانوں اور حیوانوں کے پینے اور نہانے جیسی ضرورتوں کے علاوہ "آبپاشی کے لئے" مالک زمین سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اور بصورت اذن مالک کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اسکی اجازت دے اور اگر ایسا کرنے میں خود اس کی اپنی زراعت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو دوسروں کو آبپاشی کرنے سے روک دینے کا مجاز ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب سعدیات، المبسوط اور کتاب الخراج میں ہے۔

اور بعض "پانی" ذاتی ملک بھی ہوتے ہیں جو شخصی کنوؤں، حوضوں، گولوں اور خاص چشموں کی صورتوں میں نظر آتے ہیں تو ان میں بھی ہر شخص کو پانی پینے اور اپنے چوپایوں کو پانی پلانے کا عام حق ہے جیسا کہ گذشتہ حدیث سے واضح ہے اور اگر چوپایوں کی آمد و رفت سے کنوؤں یا نہر کی فصیلوں کے تباہ ہونے اور خراب ہو جانے کا خطرہ ہو تو مالک زمین اس کی حفاظت کی حد تک۔ روک بھی سکتا ہے البتہ ایسے کنوؤں، حوضوں اور خاص چشموں سے دوسروں کو آبپاشی کرنے کا حق نہیں ہے۔ [۲]

---

[۱] مبسوط ج ۲۳ ص ۱۶۲ [۲] سعدیات جزو ۳ ص ۲۰۳۔

والماء فی الحوض لیس مملوکا لصاحب الحوض فلا یجوز بیعہ الخ [1]

"اور حوض میں جمع شدہ پانی صاحبِ حوض کی ملک نہیں ہے اس لئے اس حالت میں اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے"

ولکن ان یمنع السقی للارض والزرع والنخل والشجر ولیس لاحد ان یسقی شیئا من ذلک الا باذنہ [2]

"اور مالک کا یہ حق ہے کہ وہ زمین، کھیت کھجوروں کے باغ، اور درختوں کی آبپاشی، سے روکے۔ اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر آب پاشی کا اقدام کرے"

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام نے ان کو خط لکھا کہ میں نے آپ کی زمینوں کی آبپاشی اور باغوں کی سیرابی کے بعد باقی پانی کا معاملہ تیس ہزار درہم میں دوسروں سے کر لیا ہے اور آپ کی اجازت کا طالب ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا لیکن میرے پیش نظر وہ حدیث ہے جس میں ضرورت سے فاضل پانی اور گھاس کو روکنے اور دوسروں کو فائدہ نہ پہنچنے دینے والے شخص کے بارہ میں سخت وعید کا تذکرہ اور قیامت میں رسوائی کا ذکر کیا گیا ہے لہٰذا تم زمینوں اور باغوں کی سیرابی و آبپاشی کے بعد ہمسایوں کو موقع دو کہ وہ اس پانی سے مفت اپنے کھیت اور باغ سیراب کریں اور اس میں درجہ بدرجہ نزدیکی کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ والسلام [3]

آبپاشی کے لئے کثرت سے نہریں کھدوائی جائیں اور اس کا تمام خرچ بیت المال (سرکاری خزانہ) پر لازم ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو اہل دول پر جبر کیا جائیگا کہ وہ حکومت کو اس معاملہ میں مدد دیں

"اور اگر نہریں حکومت کی جانب سے کھودی جا رہی ہیں تو ان کا تمام خرچ بیت المال

[1] مبسوط ج ۲۳ ص ۱۹۴ [2] کتاب الخراج ص ۹۵ [3] ایضاً ص ۹۶

کھدوائی اس لئے کہ وہ مصلحتِ عامہ کے لئے ہیں لہٰذا کسی خاص جماعت پر خرچ نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ بیت المال میں اگر مال موجود ہے تو اسی قسم کی مصالح کے لئے ہے اور اگر بیت المال میں گنجائش نہیں ہے تو خلیفہ لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ نہروں کی اس کھدائی میں صرف کے ذمہ دار ہوں اس لئے کہ بیت المال میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اگر نہروں کی کھدائی نہ کی جائیگی تو یہ لوگوں کے لئے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگا اور یہ شاذو نادر بات ہے کہ عام مصالح کی خاطر لوگ برضاء و رغبت خرچ پر تیار ہو جائیں اور چونکہ امام مصالح عامہ کا نگراں ہے اس لئے اس کو اس معاملہ میں جبر کرنیکا حق ہے۔" [1]

"اور امام کے ذمہ واجب ہے کہ بڑی بڑی نہریں کھدوائے اگر عامۃ المسلمین کے مفاد کے پیشِ نظر ایسا کرنا ضروری ہو" [2]

(۴) جو چھوٹی چھوٹی نہریں عام مصالح آبپاشی اور بہم رسانی آب کے لئے نہ بنائی جائیں بلکہ ان کو . . . . اہل محلہ یا اہل قصبہ و شہر اپنی ذاتی ضروریات کے لئے بنانا چاہیں تو اگر اس میں مصالح عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو اور جس دریا یا بڑی نہر سے پانی لیا جائیگا اس کو نقصان پہنچ کر عام ضروریات کے لئے حرج پیدا نہ کرتا ہو تو امام ایسی خصوصی نہروں کی اجازت دے سکتا ہے البتہ ان کے اخراجات کا بار مطالبہ کرنیوالوں پر پڑیگا حکومت کا خزانہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

"اور اگر نہر کسی کی ذاتی ملکیت میں اس کی خاص اپنی ضرورت کے لئے بنائی گئی ہے تو اس کے مصارف کا تمام بار اسی پر ہوگا کیونکہ وہ اسی کا حق ہے اور اس کی منفعت خاص اسی کی جانب راجع ہے۔" [3]

(۵) آبپاشی کی نہریں اور کنوئیں پبلک کی مصالح عامہ اور معاشی وسائل کی ترقی

---

[1] سعدیات جزء ۲ ص ۳۰۳ و کتاب الخراج ص ۹۶-۹۸ و مبسوط ج ۲۳ ص ۱۷۸ [2] کتاب الخراج ص ۹۷

[3] سعدیات جزء ۲ ص ۳۰۴ مبسوط ج ۲۲ کتاب الشرب۔

کے لئے ہیں، حکومت کے محاصل میں اضافہ کرنے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہیں اس لئے حکومت کی نہروں اور کنوؤں سے آب پاشی کرنے والوں سے یا تو قطعاً محصول آبپاشی نہ لیا جائے یا صرف اس قدر لیا جائے جس قدر ان نہروں اور کنوؤں کی بقاء کے لئے ضروری ہو باقی انتظامات کا کل خرچ بیت المال پر ڈالا جائے، مبسوط میں ہے۔

"کیا تم کو یہ معلوم نہیں! کہ امام پر یہ واجب ہے کہ بیت المال کے مال سے چھوٹے بڑے پل اور مہمان سرائے تیار کرائے اسی طرح اس کے ذمہ یہ بھی واجب ہے کہ اس بڑی نہر کا خرچ بھی بیت المال ہی پر ڈالے اور اسی طرح اس کے کناروں کی درستی و اصلاح کا بھی اگر اس کی خرابی کی وجہ سے غرق ہونے کا اندیشہ ہے" [1]

بہر حال اسلامی نظامِ اقتصادی میں ان اصول کے پیش نظر حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانۂ خلافت میں اس محکمہ پر خاص توجہ دی گئی، نہریں جاری کی گئیں، بند باندھے گئے، تالاب بنائے گئے، گولیں اور چھوٹی نہریں نکالی گئیں اور اس طرح زراعت کو بھی ترقی دی گئی اور پانی کی قلت کا حل بھی کیا گیا۔

اسی سلسلہ میں بصرہ کی نہر ابو موسیٰ جو دجلہ سے کاٹ کر بنائی گئی اور کوفہ کے علاقہ انبار کی "نہر سعد" اور مصر کی نہر امیر المومنین" مشہور نہریں ہیں اور فاروق اعظمؓ کے بعد نہر زیاد، نہر وبیس، نہر اساوہ، نہر عمرو، نہر حرب وغیرہ کا ذکر تاریخی کتب میں آج تک موجود ہے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ [4]

زراعت اور ترقی زراعت کی یہ داستان بہت طویل ہے اور اس کے تمام شعبوں اصلاحات کا قانون، اسلامی تاریخ کا اہم جزء شمار ہوتا ہے، یہاں صرف اختصار کے طور پر چند نمونے پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

---

[1] مبسوط ج ۲۳ کتاب الشرب ص ۱۷۵ [2] کتاب الخراج ص ۹۴، ۹۸ [3] فتوح البلدان ص ۳۵۲، ۳۵۳ و مقریزی ص ۱۷، [4] حسن المحاضرہ ص ۹۳ و ۹۴ [5] فتوح البلدان ص ۳۵۳

زمین سے متعلق خصوصی احکام

زمین اور انفرادی ملکیت

زراعت سے متعلق احکام اور گذشتہ صفحات میں بیان شدہ اسلام کے معاشی نظام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام "زمین" اور ذرائع پیداوار" میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے؟ بیشک یہ صحیح ہے، اور اسلئے صحیح ہے کہ اسلام کی نظر میں "زمین" یا "ذرائع پیداوار" کا انفرادی ملکیت ہونا در اصل معاشی نظام کے فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں "اعتدال و توازن کا فقدان" راہِ فساد کھولتا ہے۔

نیز اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کا انسداد انسان کے جائز انفرادی حقوق و فرائض پر ضرب کاری کے مرادف اور قوائے عملی میں جمود و تعطل پیدا کرنے کا موجب ہے اس لئے اس قسم کا اقدام گویا فطرت کے ساتھ بغاوت ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ قوانین فطرت (نوامیس الٰہیہ) کی مطابقت کے ساتھ ساتھ ایک جانب "زمین" اور "وسائل پیداوار" میں انفرادی ملکیت کو ایک حد تک جائز قرار دیا جائے اور دوسری جانب اجتماعی مفادات کے پیش نظر اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کر دیئے جائیں کہ جو انفرادی ملکیت میں اعتدال و توازنِ حقیقی کو برقرار رکھیں کیونکہ علم الاخلاق اور علم الاجتماع دونوں کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ "انفرادی حقوق و فرائض میں اعتدال ہی اجتماعی حقوق و فرائض کے لئے بہترین کفیل ہے"

اسی نظریہ کے ماتحت اسلام نے اپنے معاشی نظام میں "زمین کی انفرادی ملکیت" کو چند شرائط و قیود کے ساتھ "ایک حد تک" تسلیم کیا ہے جن میں سے بعض کا ذکر زراعت کی بحث میں آچکا ہے اور ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کس طرح سرمایہ دارانہ مفاسد کا انسداد اور سدّ باب کر کے عام رفاہیت و خوشحالی کے سامان مہیا کرتا ہے۔

زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات

اس سلسلہ میں پہلی بات جو جاذب توجہ ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے متعلق انفرادی ملکیت کے جواز کو مان لینے کے باوجود اسلام کے معاشی نظام میں کیا زمینداری سسٹم (Landlordism) کی موجودہ ظالمانہ روش کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں۔ اسلام، موجودہ زمینداری سسٹم کے جابرانہ اور غلط طریقہ ہائے کار کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے جبکہ وہ اس مباح زمینداری کو بھی غیر پسندیدہ سمجھتا ہے۔ جو انصار اور مہاجرین کے درمیان "اجارہ" اور "مزارعۃ" کی صورت میں رائج تھی۔

عن رافع بن خدیج قال نہانا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن امر کان لنا نافعا اذا کانت لاحدنا ارض ان یعطیہا ببعض خراجہا او بدراھم و قال اذا کانت لاحدکم ارض فلیمنحہا اخاہ اولیزرعہا (1)

حضرت رافع بن خدیجؓ نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے منع فرمادیا جو بظاہر ہمارے لئے نفع بخش تھا، وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہو تو وہ اس کو نہ بٹائی پر دے اور نہ نقد لگان پر اور فرمایا کہ اگر تم میں سے جس کے پاس زمین ہو تو وہ یا خود کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے لئے احسان کے طور پر مفت دے۔

عن ابی ہریرۃ ...... قال .... رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال من کانت لہ ارض فلیزرعہا اولیمنحہا فان ابی فلیمسک ارضہ (2)

"حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس زمین ہو اس کو چاہیے کہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لئے مفت احسان کے طور پر دیدے اور اگر دونوں میں سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تو اپنی زمین کو یونہی روکے رکھے۔

عن جابر بن عبد اللہ قال نہی

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(1) ترمذی باب الزکوٰۃ و بخاری باب المزارعۃ۔ (2) باب المزارعۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یوخذ للارض اجر او حظ

نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ زمین کے ذریعے عوض کا یا اجارہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔"

وکان ابن عمر رضی اللہ عنہما یکری مزارعہ علی عہد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر و عثمان وصدرا من امارۃ معاویۃ فلما سمع حدیث رافع ترک ذلک خشیۃ ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد احدث فیہ شیئاً

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی زمین کو عہد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر ابتدائی امارت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تک کاشتکاروں کو لگان پر دیتے رہے مگر جب انھوں نے رافع کی حدیث سنی تو اس عمل کو اس خوف سے ترک کر دیا کہ شاید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر مبارک میں یہ فیصلہ دیا ہو۔

یہ روایت الفاظ کے معمولی رد و بدل کے ساتھ جلیل القدر صحابہؓ سے ثابت ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے شہرت کے اونچے درجہ تک پہنچ گئی ہے اس روایت کے الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینے کو جائز قرار نہیں دیتے اور اس طرح زمینداری کے نفس جواز کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ زمین کی انفرادی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے یا خود کاشت کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور یا دوسرے بھائی کے ساتھ حسن سلوک کی۔

چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا مذہب یہی ہے کہ زمین کو نہ نقد لگان پر دینا جائز ہے اور نہ بٹائی پر اور یہ کہ زمینداری کسی طرح بھی جائز نہیں ہے مگر اس روایت کے مقابلہ میں بعض دوسری روایات بھی ہیں جو الفاظ اور معانی کے اعتبار سے پہلی روایت ہی کی برابر شہرت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان روایات میں صاحب زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں پر دینے کی اجازت نکلتی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے خلفاء راشدین اور بعد

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۵۲ [2] بخاری کتاب المزارعۃ۔

کے زمانہ تک صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور امت کے افراد کے عملی تواتر سے بھی یہی ثابت ہے کہ وہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی پر دیتے رہے ہیں۔

عن حنظلة بن قیس رضی اللہ عنہ قال سألت رافع بن خدیج عن کراء الارض فقال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنہ فقلت ابالذھب والورق قال فلا بأس لہٗ[1]	حنظلہ بن قیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیجؓ سے زمین کو اجارہ لینے کی بابت دریافت کیا انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمایسا کرنے سے منع فرمایا ہے تب میں نے کہا کہ چاندی اور سونے کے بدلے یعنی نقد لگان پر بھی منع ہے تو انھوں نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔
عن ابن عمر رضی اللہ عنھما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطی خیبر الیھود علی ان یعملوھا ویزرعوھا ولھم شطر ما خرج منھا[2]	"حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کو خیبر کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور جو پیداوار ہو وہ نصف بٹائی پر ہو۔
عن سعد بن ابی وقاص ان المزارع فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا یکرون مزارعھم[3]	حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ مالکان زمین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اپنی زمینوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

ابوجعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ کی بٹائی پر زمین کی کاشت نہ کرتا ہو اور حضرت علیؓ، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم عروہ، آل عمر، آل علی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم سب اپنی زمینیں اسی طرح کاشت پر دیا کرتے تھے۔[4]

---

[1] بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، کتاب المزارعہ۔ [2] بخاری کتاب المزارعہ [3] ابوداؤد، نسائی
[4] بخاری کتاب المزارعۃ۔

امام ابو یوسف ؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جو بات سب سے بہتر ہم نے سنی ہو وہ یہ ہے کہ زمین کو نصف، تہائی، یا چوتھائی بٹائی کے ہر طریق پر دینا جائز ہے یہی منقح اور صحیح ہے اور میرے نزدیک زمین کا یہ معاملہ "مال مضاربۃ" کی طرح کا معاملہ ہے (یعنی جیسا کہ وہ باتفاق جائز ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے) اور امام ابو حنیفہ بٹائی کی ان تمام صورتوں کو ناجائز فرماتے ہیں (اور صرف نقد لگان پر جائز سمجھتے ہیں) ؎۱

یہ تمام روایات حدیثی و فقہی اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ صاحب زمین اگر خود کاشت نہ کرے تو دوسرے کو نقد لگان یا بٹائی پر دے سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لہٰذا دونوں قسم کی احادیث میں جو تضاد اور تخالف ہے جب تک وہ صاف نہ ہو جواز اور عدم جواز کا فیصلہ ناممکن ہے چنانچہ تین جلیل القدر صحابہؓ نے اس ظاہری تضاد کو دور کرنے کے لئے جو ارشاد فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) حضرت رافعؓ بن خدیج جو عدم جواز کی روایت کے راوی ہیں "فرماتے ہیں" کہ زمین کو اجارہ پر دینے کی یہ ممانعت اس بات سے متعلق ہے کہ مزارعۃ (بٹائی) میں زمیندار اور کاشتکار کے درمیان زمین کے حصص متعین ہوں کہ اس جانب کے حصہ کی پیداوار ہماری ہوگی اور اس دوسرے حصے کی کاشتکار کی کیونکہ یہ معاملہ مناقشہ کا باعث ہے نہیں معلوم کہ زمین کے کس حصہ میں پیداوار ہو جائے اور کس حصہ میں بالکل نہ ہو، اور یہ بات اس سے بھی متعلق ہے کہ صاحب زمین یہ شرط لگائے کہ نہر کے متصل حصۂ زمین کی پیداوار میری ہوگی اسلئے کہ اس میں بھی کاشتکار کے حق میں سخت نقصان کا اندیشہ ہے اور معاملہ مجہول ہو جاتا ہے۔

عن رافع بن خدیج قال حدثنی	رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا ظہیر بن
عمای انھم کانوا یکرون الارض علی عھد	رافع نے فرمایا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
النبی صلے اللہ علیہ وسلم بما ینبت علی	زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اور یہ شرط لگایا کرتے تھے
الاربعاء او شی یستثنیہ صاحب	کہ نہر کے قریب کے حصہ زمین کی پیداوار ہماری ہوگی
الارض فنھی النبی	یا اس معین حصۂ زمین کی پیداوار ہماری رہیگی جب نبی اکرمؐ

صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلک الخ[۱]	(صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ معلوم ہوا تھا ایسا کرنے
ذلک الخ[۱]	سے منع فرمایا۔

حضرت رافع بن خدیج کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زمینداری کی ممانعت سے متعلق جو روایت بیان کی ہے وہ اسی قسم کے مناقشات کے پیش نظر ہے نہ کہ نفس مسئلہ کی ممانعت کی بنا پر۔

(۲) اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ معاملہ حرام یا ناجائز ہے بلکہ از رہ اخوت ومواساۃ باہمی آپ کی رغبت یہ ہے کہ زمین سے متعلق اجارہ یا مزارعۃ کا معاملہ نہ ہو بلکہ مسلمان یا تو خود کاشت کریں اور یا باہمی رفاقت ومروت کے پیش نظر دوسرے ضرورتمند بھائی کو کاشت کے لئے مفت دیدیں اور اس طرح حسن سلوک کریں۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کو "نہی تنزیہ وارشاد" سے تعبیر کیا ہے۔

قال ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم ینہ عنہ ولکن قال ان یمنح احدکم اخاہ خیر لہ من ان یاخذ شیئاً معلوماً۔[۲]	حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو اجارہ پر دینے کو ممنوع نہیں قرار دیا بلکہ یہ پسند فرمایا کہ اپنے بھائی (کاشتکار) سے معاوضہ لینے کی بجائے مفت حسن سلوک کے طور پر دیدے۔
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یحرم المزارعۃ ولکن امر ان یرفق بعضھم ببعض الخ[۳]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزارعۃ کو حرام نہیں کیا مگر یہ ترغیب دی کہ باہم حسن سلوک اور رفق کا معاملہ کریں یعنی لین دین کا معاملہ اس بارہ میں نہ کریں۔

[۱،۲] بخاری کتاب المزارعۃ   [۳] مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی۔

(۳) اور حضرت زید (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں چونکہ آپ کے زمانہ میں زمین سے متعلق بہت سے مناقشے اور قضیے پیش ہوتے اور اس معاملہ میں کثرت سے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے تھے اس لئے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص وقت تک کے لئے مصلحۃً ممانعت فرمادی ورنہ بذاتہ اس کو حرام نہیں کیا۔

او على مصلحة خاصة بذلك الوقت من جهة كثرة مناقشتهم في هذه المعاملة حينئذ وهو قول زيد رضي الله عنه الخ ۱

یا یہ ممانعت خاص مصلحت کی بنا پر وقتی ممانعت تھی اور اس لئے تھی کہ اس معاملہ میں اس زمانہ میں کثرت سے مناقشات پیش آتے رہتے تھے اور یہ حضرت زید کا قول ہے۔

حضرت رافع، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زیدؓ کی یہ توجیہات اگرچہ اس بات میں متفق ہیں کہ زمین کو اجارہ اور مزارعہ پر دینا اصل معاملہ کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے لیکر خیر القرون کے پورے دور کا "متواتر تعامل" بھی اس عدم ممانعت کا مؤید ہے تاہم حدیث ممانعت نے اس سلسلہ میں فقہاء اسلام پر جو اثر ڈالا وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا مذہب یہ ہے کہ افراد امت کے درمیان زمین کا اجارہ اور بٹائی مزارعۃ دونوں ناجائز ہیں اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ نقد لگان (اجارہ) پر دینا درست ہے اور مزارعہ (بٹائی) نادرست اور طاؤس اور ابن حزم فرماتے ہیں کہ بٹائی (مزارعۃ) پر زمین کا دینا جائز ہے اور نقد لگان (اجارہ) پر نادرست اور جمہور علمائے امت فرماتے ہیں کہ زمین کو نقد لگان اور بٹائی دونوں صورتوں میں اجارہ پر دینا جائز ہے اور یہی سلف و خلف کا تعامل رہا ہے گویا اس مسئلہ میں جس قدر بھی عقلی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی کسی نہ کسی فقیہ کا مختار ہیں اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ نقد لگان کے جواز سے متعلق جو روایت کتب احادیث میں مذکور ہے، امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں وہ جملہ کہ جس سے صراحۃً نقد لگان پر زمین کا

۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۱۷ باب التبرع والتعاون۔

دینا ثابت ہوتا ہے "مدرج" ہے یعنی سعید بن مسیبؒ کا مقولہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہے [1]

اسی طرح زمین کو بٹائی پر دینے کے جواز میں جو فقہاء یہود خیبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان "مخابرہ" معاملۂ خیبر کو وجہ استدلال قرار دیتے ہیں، امام ابو حنیفہؒ اس کے متعلق یہ جواب دیتے ہیں - - - - - - - - - - کہ صحیح یہ ہے کہ "یہود" خیبر کی زمینوں کے مالک تسلیم کر لئے گئے تھے اس لئے مخابرہ (مزارعۃ) کا یہ معاملہ در اصل حکومت اور ذمی رعایا کا معاملہ تھا اور یہ خراج مقاسمہ" (بٹائی کے ذریعہ خراج) کہلاتا ہے اور معاملہ زیر بحث افراد امت کے درمیان زمینداری و کاشتکاری سے متعلق ہے اور اس کے لئے حدیث میں صریح ممانعت ہے۔

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانۂ نبوت سے زمانہ خلافت راشدہ تک زمین کو نقد لگان یا بٹائی پر دینا اگرچہ معمول بہ رہا ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوضاحت اس کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ زمینداری کے اس معمولی اور سادہ طریق کو بھی غیر پسندیدہ اور اخلاق و مروت سے نازل سمجھتے ہیں یا ایسے حالات ہیں کہ اس سلسلہ میں باہمی مناقشات کی کثرت افراد امت کے درمیان بغض و عداوت اور جنگ و جدل کی صورت پیدا کر دے" امام کو اس کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں کہ وہ اس سسٹم کو جماعتی مصلحت کے پیش نظر ممنوع قرار دیدے [2]

پس اسلام کے اقتصادی نظام میں زیادہ سے زیادہ ایسی زمینداری کے جواز کی شکل تو پائی جاتی ہے جس میں زمیندار اور کاشتکار معاملۂ زمینداری میں دو شریک کار کی حیثیت سے شمار ہوتے ہوں مگر دنیا کے دور قدیم اور دور جدید کا یہ جاگیردارانہ سسٹم جس میں زمینداری تعلقہ داری، جاگیرداری جابرانہ نظام کی شکل میں نظر آتی اور بڑے بڑے زمیندار، کاشتکاروں

---

[1] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰ [2] اگر خلیفۂ اسلام مصلحت عامہ یا اسلامی مصلحت کے پیش نظر خود کاشت ملوکہ (ص ۳۰)

کی جان و مال تک پر متصرف نظر آتے ہیں" اسلامی معاشی نظام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا اور اسلام کا اقتصادی قانون اس سسٹم کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے نظام حکومت سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی نظام میں اسلام کا نمایاں امتیاز یہ رہا ہے کہ "زمین" کے متعلق اقطاع (جاگیر) اور عطیہ (مربعہ جات) کے ثبوت کے باوجود مملکتِ مفتوحہ کی زمینوں کا بہت بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ میں رہا پبلک کے ہاتھ میں نہیں رکھا گیا چنانچہ اس زمانہ میں انصار اور مہاجرین کے صاحب املاک و جائداد ہونیکے صرف یہ معنی تھے کہ بعض صحابہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے عطیہ" جاگیر" کے طور پر کچھ زمین دیدی تھی جو ان کی سادہ گذر کے لئے کام دے، یا انھوں نے محنت کر کے بنجر زمینوں کو پیداوار کے قابل بنا لیا تھا جو پیمائش کے اعتبار سے آج کی طرح بڑے بڑے گاؤں نہ تھے بلکہ مزروعہ زمینیں تھیں۔ ان ہی کو بعض صحابہؓ دوسروں کو اجارہ پر دیتے تھے اور بعض خود کاشت کیا کرتے تھے اور انہی کے درمیان خرید و فروخت کا سلسلہ جاری تھا باقی ممالکِ مفتوحہ کی تمام تر اراضی حکومت کی جانب سے اصل باشندوں کے قبضہ میں رہیں اور ان کی مالگذاری شخصی ملکیت کی بجائے بیت المال کا مال قرار پایا۔

یہ شکل کہ دیہات کے دیہات اور رقبے کے رقبے اشخاص اور افراد کے قبضے میں اس طرح ہوں کہ ان کے ساتھ کاشتکاروں اور انسانی بستیوں کی بھی ایک طرح کی بیع و شراء ہوتی ہو، اور وہ غلاموں اور محکوموں کی طرح زمینداروں کے اغراض کا آلۂ کار بنتے ہوں تو اس قسم کی جائدادوں اور زمینداریوں کا اسلامی نظام حکومت میں کہیں شائبہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے رومیوں کے اس طرز زمینداری کو ظالمانہ نظام کہکر بالکل ختم کر دیا تھا اور ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دیدیا تھا بلکہ دورِ فاروقی میں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ جو ممالک ایران و ر[illegible]

(بقیہ صفحہ ۲۳۵) ان زمینوں کو مستثنی کر کے زمینداری سسٹم کو ممنوع قرار دینا چاہئے تو خرید کردہ زمینوں کے متعلق از بس ضروری ہے کہ مالک زمین کی واجبی قیمت بیت المال سے ادا کرے۔

مصر، شام، عراق فتح کئے گئے ان میں ایرانی بادشاہ کی مختصر ذاتی املاک کے علاوہ جو مسلمانوں کو جاگیر میں دیدی گئیں عام کاشتکاری ان ہی لوگوں کی رہی جو سابق میں اسکے مالک تھے اور خراج کے نام سے غیر مسلموں کی زمینوں سے اور عشر کے نام سے مسلمانوں کی مملوکہ زمینوں سے حکومت "لگان و مالگذاری" وصول کرتی رہی، ورنہ انکا حق ملکیت حکومت کے علاوہ افراد و اشخاص کو نہیں بخشا گیا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عراق اور شام فتح ہوا تو صحابہ نے مطالبہ کیا کہ ان ملکوں کی زمینوں کو ہم پر تقسیم کر کے ہمیں ان کا مالک بنا دیا جائے حضرت بلال اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو خصوصیت کے ساتھ اس پر اصرار تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار فرمایا اور فرمایا کہ اگر ان زمینوں کا تم مجاہدین کو زمیندار بنا دیا جائے تو سرحدوں کے انتظامات شہروں اور ملکوں کے انتظامات لشکر و فوج کی ضروریات بعد میں آنیوالے مسلمانوں کی حاجات نیز دیگر غربا کی ضروریات کیلئے اسقدر کثیر آمدنی کہاں سے آئیگی لہذا یہ ہرگز نہ ہوگا بلکہ یہ سب حکومت کے ہاتھ میں رہینگی اور انکی آمدنی تمام مسلمانوں کی ضروریات اور مذکورہ بالا حاجات کے لئے وقف ہوگی۔

استصواب رائے عامہ | اراضی کے متعلق یہ ایک خاص قسم کا معاملہ تھا اس لئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ اس بارہ میں اختلاف ہے تو اول جلیل القدر صحابہ کی مجلس مشاورت منعقد کر کے اس مسئلہ کو انکے سامنے پیش کیا اور بعد میں استصواب رائے عامہ کیلئے مجلس عام منعقد کی اور فرمایا۔

فانی واحد کاحدکم وانتم الیوم	میں تمہاری ہی طرح ایک فرد ہوں اور تم کو آج حق کا فیصلہ
تقرون بالحق خالفنی من خالفنی	کرنا ہے بعض میری رائے کے مخالف ہیں اور بعض موافق
ووافقنی من وافقنی ولست ارید	اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کی پیروی کرو،
ان تتبعوا ھذا الذی ھوای معکم	تمہارے پاس خدا کی دی ہوئی کتاب ہے جو حق کو واضح
من اللہ کتاب ینطق بالحق فواللہ	کرتی ہے بخدا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بجز حق کے اور
لئن کنت نطقت بامر ارید بہ	کچھ میرا کوئی دوسرا ارادہ ہرگز نہیں ہے۔
الا الحق [۱]	

[۱] کتاب الخراج ص ۲۵۔

اس کے بعد تقریر فرماتے ہوئے اپنے دعوے کو قرآنی دلائل سے مدلل کیا اور اُن دلائل کو سن کر سب نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا۔

فقالوا جميعا الرأى رأيك — ان سب نے کہا رائے وہی صحیح ہے جو آپ فرماتے ہیں جو آپ نے

فنعم ما قلت وما رأيت — فرمایا اور مناسب سمجھا ہے وہی بہتر اور خوب ہے۔

اور اس طویل واقعہ کو نقل کر کے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ انھوں نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان اراضی کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی رائے کی موافقت میں قرآن عزیز کے دلائل پیش کئے یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور در اصل اس ہی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی، اور خراج کا جمع ہونا اور اس کا مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہونا جامعی مفاد کے اعتبار سے تقسیم اراضی کے مقابلہ میں بدرجہا مفید تھا۔

بہرحال حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جسقدر ممالک بھی فتح کئے گئے، ان کی آراضی کا معاملہ بیشتر حکومت ہی کے ہاتھ میں رہا اور کاشتکاروں سے حاصل شدہ لگان (خراج) حکومت کے ذریعہ بیان کردہ ضروریات پر صرف ہوتا رہا اور باوجود مجاہدین و فاتحین کے اصرار کے انکا کوئی حصہ بطور جائداد کے فاتحین کو نہیں دیا گیا۔

اور ایک زمانہ تو ایسا گذرا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے تمام مسلمانوں کو زمینداری اور کاشتکاری دونوں سے یک قلم روک دیا اور فرمایا کہ جبکہ مسلمانوں، ان کے اہل و عیال، اور انکے غلاموں تک کا وظیفہ بیت المال سے دیا جا رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب حکومت (خلافت) کے کارآمد پرزے نہ بنیں اور جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ کے والنیٹر ہونیکی بجائے بیلوں کی دم سے لگے پھریں چنانچہ نظام العالم والامم میں طنطاوی نے تفصیل کے ساتھ اسکو بیان کیا ہے فرماتے ہیں۔

"جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مال بہت بڑھ گیا اور لوگوں کے روزینے مقرر ہو گئے اور رجسٹر مرتب ہو گئے تو عاملوں اور قاضیوں کے مشاہرے بھی مقرر کر دیئے گئے اور کھیتی جمع کرنیکی ممانعت کر دی

---

۵ کتاب الخراج ص ۲۴ تا ۲۹۔

گئی، زمینداری کو ممنوع کر دیا گیا اور زراعت اور مزارعت دونوں ہی کی ممانعت کر دی گئی اسلئے کہ ان کے، ان کے اہل وعیال اور ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے حضرت عمرؓ کے اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہر وقت ایک لشکری کی حیثیت سے کوچ کے منتظر رہیں اور ان کو نہ کھیتی کا انتظام روک سکے اور نہ خوش باشی اور عیش کوشی اس سے باز رکھ سکے اور یہ حکم یہاں تک آگے بڑھا کہ اگر کوئی ملک کا قدیم ذی باشندہ بھی مسلمان ہو جاتا تو اس کی تمام جائداد و املاک اسکی بستی کے ذمیوں میں تقسیم کر دی جاتی اور وہی ان املاک کا خراج ادا کرتے اور صرف اس کا مال اور حیوان اس کے سپرد کر دیئے جاتے تھے اور خلافت کی جانب سے اسکا وظیفہ (ماہانہ) بیت المال سے مقرر کر دیا جاتا تھا اور اس حکم کو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بھی اپنی خلافت کے دور میں جاری کیا کیونکہ وہ ہر معاملہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ کی پیروی کے عادی تھے۔ [۱]

عن عبد الله بن هبيرة قال ان عمر بن الخطاب رضي الله عنه امر مناديا ان يخرج الى امراء الاجناد يتقدمون الى الرعية ان عطاءهم قائم وان ارزاق عيالهم سائل فلا يزرعوا

عبداللہ بن ہبیرہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مصر میں تمام اسلامی لشکر کے سرداروں میں یہ منادی کرا دی کہ تمام مسلمانوں کے وظائف مقرر ہیں اور ان کی اولاد کے بھی لہذا کوئی مسلمان نہ کاشتکاری کرے اور نہ زمینداری۔ [۲]

شریک بن سمی غطیفیؓ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے یہ عذر کر کے کہ وظیفہ میری معاش کی پوری کفالت نہیں کرتا بغیر اجازت کاشتکاری شروع کر دی عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع کی حضرت عمرؓ نے شریک کو دربار خلافت میں بلا بھیجا اور فرمایا کہ میں تجھ کو ایسی سزا دونگا کہ آئندہ کے لئے یادگار رہے، شریک نے کہا میں تائب ہوتا ہوں آپ معاف فرما دیجئے تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معافی دی۔ [۳]

۱؎ نظام العالم والامم للطنطاوی ج ۲ ص ۱۸۳ و ۱۸۴ ۲؎ حسن المحاضرہ ص، ۳؎ ایضاً۔

الحاصل۔ اسلام میں "زمینداری" کے غیر پسندیدہ ہونے اور بیشتر حصہ زمین کے حکومت (خلافت) کے قبضہ میں رہنے کے باوجود سلف و خلف کے تعامل اور علماء امت کے اجماع کے پیش نظر یہ مسلّم ہے کہ "مالکِ زمین اپنی زمین کو کرایہ پر دے سکتا ہے اور "زمیندار" کی اصطلاح بھی اس پر صادق آسکتی ہے" مگر یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے اس حکمِ جواز میں زمیندار کا وہ تصور جو آج سرمایہ دارانہ نظام میں پایا جاتا ہے مطلق نہیں ہے اور نہ اس میں موجودہ تعلقہ داری اور اسٹیٹ کی کوئی گنجائش ہے جو کہ "اکتناز" کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے اس لئے کہ علاوہ ان تمام مظالم و مفاسد کے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں کی بنیاد تقسیم دولت (وراثت) کی بجائے جمع دولت اور مخالفتِ تقسیم وراثت پر قائم ہے۔

بلکہ وہاں لگان پر زمین دیکر زمیندار کہلانے کے صرف اسی قدر معنی تھے کہ سادہ اور ضروری معاش کو حاصل کرنے کے زیادہ بہتر اور عمدہ طریقہائے کار کے علاوہ ایک یہ طریقہ بھی تھا کہ بعض اصحاب زمین خود کاشت کرنے کی بجائے اپنی زمین کو لگان یا بٹائی پر اسطرح اٹھا دیتے تھے جس طرح تجارت میں "مضاربت" کا معاملہ کیا جاتا ہے اور بس، وہاں آقائی اور غلامی بھی رہا تھی محکومی، اور نہ یہ حالت تھی کہ زمیندار صرف زمین کے لگان سے عیش اور راحت کی اونچی کرسی پر صدر نشین ہو، اور زمین میں محنت کرنیوالا کاشتکار معمولی معاش کے لئے تباہ حال رہے۔

باہمی تعاون و اشتراک کے ساتھ زمینداری اور کاشتکاری کا یہی معاملہ تھا جو اسلام کے دورِ اول میں مہاجرین و انصار کے درمیان بھی رہا ہے جبکہ بیشتر مہاجرین کاشتکار اور انصار صاحبِ زمین و املاک تھے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں (ذمیوں) کے مابین بھی رہا ہے اور کسی ایک معاملہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہاں زمیندار و کاشتکار کے یہ معنی تھے جو آج کے سرمایہ دارانہ اور جابرانہ دور میں پائے جاتے ہیں اور جس طرح اسلام "تعلقہ داری" اور "جاگیرداری" کے موجودہ جابرانہ رسم کو جائز نہیں رکھتا۔ اسی طرح کاشتکار کو بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ صاحبِ زمین کی زمین پر اشتراکِ عمل کے بعد زبردستی قابض ہو جائے اور اس کو اپنی ذاتی ملکیت کی طرح سمجھنے لگے۔ اس لئے کہ اس قسم کی تمام

شرکتوں میں اصل مال صاحب مال ہی کا ہے اور صاحب محنت کی شرکت منافع میں ہے نہ کہ اصل شے میں چنانچہ ایسے شخص کے بارہ میں جو کسی کی مملوکہ شے پر زبردستی قبضہ کرلے اور عدالت میں جاکر حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کرالے "سخت وعید آئی ہے۔

عن ام سلمةؓ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال انما انا بشر وانكم تختصمون الي ولعل بعضكم ان يكون الحن بحجته من بعض فاقضي له على نحو ما اسمع فمن قضيت له بحق اخيه شيئا فلا ياخذه فانما اقطع قطعة من النار[1]

حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس جھگڑے لاتے ہو اور ایسا ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں کوئی اپنے معاملہ کی دلیل زیادہ خوبی اور چرب زبانی سے بیان کرے اور میں اس کی دلیل سن کر اسکے حق میں فیصلہ کردوں پس جس شخص کے لئے میں اس کے فریق بھائی کا حق دلادوں تو ہرگز اس کو نہ لے اسلئے کہ میں اسکو آگ (جہنم) کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔

البتہ حکومت کی ملکیت کے علاوہ خرید کردہ آراضی کے مالکوں کی اکثریت کی وجہ سے اگر پیداوار کی زمینوں پر قبضہ ہوچکا ہو اور بعض غریب کاشتکار زمین کے لئے محتاج ہوں تو اس حالت میں امام اور حکومت دو طریقے اختیار کرنے کے مجاز ہیں (۱) غیر مملوکہ "افتادہ اور غیر مزروعہ" زمینیں کاشتکاروں میں مفت تقسیم کردے (۲) جاگیرداروں کے پاس اگر ایسی زمینیں موجود ہوں جو زراعت کے کام نہ آرہی ہوں وہ انکے قبضہ سے نکال کر کاشتکاروں میں تقسیم کردے، اور ان پر سرکاری (لگان) مقرر کردے۔

تجارت | وسائلِ معیشت میں سے دوسرا اہم وسیلہ "تجارت" ہے اسلئے اسکے ذرائع کی توسیع بھی اقتصادی نظام کا جزو اعظم ہے اور حکومت کے فرائض میں داخل چنانچہ فقہائے امت فرماتے ہیں۔

فالبيع والشراء من اكبر الوسائل الباعثة على العمل في هذه الحيوٰة الدنيا وهي اسباب الحضارة والعمران[2]

"تجارت" اس دنیا میں معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلۂ معاش ہے اور تمدن و حضارت کے اسباب میں سب سے بڑا سبب۔

[1] بخاری، مسلم و مشکوٰۃ باب الاقضیہ۔ [2] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربع ص ۲۰۲۔

لہذا اسلام نے بھی اپنے معاشی نظام میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسکو دو حصوں پر تقسیم کیا ہی (۱) صحیح اصول تجارت (۲) فاسد اصول تجارت، پہلے حصہ کے بارے میں وہ افرادِ ملک و ملت کو ترغیب بھی دیتا ہے اور ان اصول کے ماتحت ذرائع اور وسائل تجارت کی توسیع کے لئے آئین و قوانین بھی ذکر کرتا ہے اور دوسرے حصہ کی مذمت بھی کرتا ہی اور ان کے انسداد کے لئے احکام بھی بیان کرتا ہے۔

تجارت کی ترغیب

اقتصادی نظام کی ترقی و برتری کا راز سب سے زیادہ تجارت میں مضمر ہے جو قوم یا ملت جسقدر اس سے دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر اپنی اقتصادی بہبود کی زیادہ کفیل بنتی ہی۔ اور جس قوم یا جس ملک کے باشندے تجارت سے دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی نظام میں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں اور اسی راہ سے دوسری اقوام انکے تمدن، تہذیب معیشت اور سیاست بلکہ "مذہب" پر قابض ہو جاتی اور انکو غلام بناکر مطلق العنانہ حکومت کرتی ہیں۔

ہندوستان جیسا بڑا ملک اور ایشیا و یورپ کے دوسرے چھوٹے بڑے ملک آج غیروں کے استبداد اور مظالم کے شکار اسی راہ سے ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھ میں ہندوستان تجارت ہی کی راہ سے آیا، مصر پر اسی اجارہ داری کے نام سے قبضہ کیا گیا، ایران کی سابقہ غلامی تیل کی تجارت ہی کی رہین منت تھی اور آج بھی اسی راہ سے اس پر پنجہ استبداد مضبوط کیا جا رہا ہے عراق وشام پر قبضہ کی تہ میں یہی اصول کارفرما ہے موصل میں چشمے اور دمشق میں کانیں ظاہر ہوتے ہی پہلے "ماہرین دریافت" کی سیاحانہ تگ و دو کا نتیجہ آخر وہی ہوا جو معاشی دست برد کی صورت میں ظالم طاقتوں کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔

جرمنی اسی تجارت کے فروغ اور اپنی قوم کی اقتصادی و معاشی ترقی کی خاطر نو آبادیات کا بھوکا ہے اور آہستہ آہستہ ان کو ہضم کرتا جاتا ہے اٹلی نے حبشہ کو اسی کی خاطر تباہ و برباد کیا اور ہسپانیہ کی تباہی و بربادی کا راز اسی میں مضمر ہے مشرق بعید میں جاپان کے چین پر بے پناہ مظالم اسی داستان کا ایک ورق ہیں اور فلسطین میں برطانیہ کے سفاکانہ مظالم کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

غرض شرق و غرب اور ایشیاء و یورپ کی موجودہ جنگ و پیکار اور ہوسِ ملک گیری، غیر مہذب ممالک کو مہذب بنانے کے لئے وجود پذیر نہیں ہوئی بلکہ وجود پذیر منڈیوں کے اضافہ اور اپنے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے مظلوموں پر معاشی دست بُرد کی خاطر عمل میں لائی جارہی ہے۔

جس قوم میں تجارت نہیں ہے وہ آج نہیں تو کل ضرور غلام بن کر رہیگی اور جو ملک تجارت کی برکتوں سے محروم ہے وہ صبح نہیں تو شام تک ضرور قعرِ ہلاکت میں گر کر تباہ ہوجائے گا۔ اسلام نے اسی لئے بار بار تجارت کی ترغیب دی، اس کے فضائل و برکات سُنائے۔ دنیوی فوائد بتائے اور دینی بشارتیں سنائیں۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (جمعہ)	جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال، تجارت و رزق) کو تلاش اور حاصل کرو۔

یہاں "فضل" سے مراد طلبِ رزق و مال ہے اور آیت کا شانِ نزول ترغیبِ تجارت پر مبنی ہے۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نساء)	اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضا کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (بقرہ)	اے ایمان والو تم خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مشہور تابعی مفسر مجاہد آیت کے جملہ "ماکسبتم" کی تفسیر میں کسب سے مراد تجارت لیتے ہیں[1]

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم التاجر الصدوق الامين مع النبيين والصديقين والشهداء[2]	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچے اور امانتدار تاجروں کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

کنز العمال کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو شخص تجارت کرتا ہے اس کے یہاں خیر و برکت اور رفاہیت پیدا ہوتی ہے[3]

عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حیاست

[1] بیہقی کتاب البیوع [2] ترمذی ابواب البیوع [3] الفصل الثانی انواع الکسب دکھایہ۔

التجار یحشرون یوم القیمۃ فجاراً | کے دن تاجر فاسق و فاجر اٹھیں گے مگر یہ کہ انھوں نے
الا من اتقی وبر وصدق۔ ؎ | پرہیز گاری، بھلائی اور سچائی سے کاروبار کیا ہو۔

تجارت کے بنیادی اصول اسلام کے اقتصادی نظام میں تجارت اور باہمی کاروبار کی صحت اور درستی کا مدار حسب ذیل اصول پر مبنی ہے۔

(۱) تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر قائم ہے اس لئے تمام معاملاتِ تجارت میں جانبین سے تعاون کا وجود ضروری ہے یعنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ متعاقدین (دو معاملہ داروں) میں سے ایک کا زیادہ سے زیادہ نفع دوسرے کے زیادہ سے زیادہ نقصان پر موقوف ہو۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا | بھلائی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو
عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (مائدہ) | اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو۔

(۲) معاملہ میں جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے اضطراری رضا معتبر نہیں یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص برضا و رغبت اس معاملہ کے لئے آمادہ نہیں ہے مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضا کی قائم مقام بن گئی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ | اے ایمان والو تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو
بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً | باطل کی راہ سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ الآیۃ۔ (نساء) | باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔

(۳) اہل معاملہ، معاملہ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں یعنی عاقل، بالغ یا ممیز اور آزاد ہوں۔ یعنی ناسمجھ بچہ، مجنون، معتوہ اور مجبور و مکرہ نہ ہوں

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تین شخصوں
رفع القلم عن ثلثۃ عن المجنون المغلوب | پر تکلیف شرعی عائد نہیں ہے مجنون پر، سونے والے پر،
حتی یبرء وعن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم (الحدیث) ؎ | اور نابالغ بچہ پر۔

ؔ ترمذی و بیہقی فی شعب الایمان ؔ یعنی اگرچہ بالغ نہ ہو مگر کاروبار کی سمجھ رکھتا ہو۔ ؔ ابوداؤد

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع المضطر[۱]	رسول اللہ صلعم نے مجبور اور بے بس کی بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

(۴) معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، خیانت، ضرر و نقصان اور معصیت کا دخل نہ ہو یعنی ان اشیاء کا کاروبار نہ ہو جن کا استعمال شریعت اسلامی نے معصیت اور حرام قرار دیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الکسب بیع مبرور و عمل الرجل بیدہ۔ (الحدیث)[۲]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بہترین کسب "بیع مبرور" ہے اور دستکاری سے معاش پیدا کرنا۔
والبیع المبرور ھو البیع الذی یبرّ فیہ صاحبہ فلم یغش ولم یخن ولم یعص اللہ فیہ[۳] الخ	اور بیع مبرور اس بیع و شرا کو کہتے ہیں کہ جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکا ہو نہ خیانت اور نہ خدا کی معصیت لازم آتی ہو
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ضرر ولا ضرار	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ نقصان اٹھانا ہو اور نہ نقصان پہنچانا۔

اور ان اصول کے خلاف حسب ذیل اصول "تجارت کے مقصد کو" فاسد اور باطل کرتے ہیں اور اس لئے اسلام کے معاشی نظام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ان اصول کے ماتحت کاروبار تجارت کو فاسد اور باطل قرار دیتا ہے۔

(۱) افزونی مال اور حصول نفع کا ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو اور ایک جانب کا فائدہ دوسری جانب کے یقینی نقصان پر مبنی ہو۔ مثلاً جوا (میسر) لاٹری اور سٹہ کے تمام انواع و اقسام، اس لئے کہ انکی بنیاد و اساس بے شبہ ایسے معاملہ پر مبنی ہے کہ متعاقدین میں سے ایک جانب کا نفع دوسری جانب کے سرتاسر نقصان کا سبب بنتا ہے

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ۔ (بقرہ)	یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔

---

[۱] ابوداؤد باب البیوع۔ [۲] [۳] کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ الجزء الثانی ص ۲۰۲

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَ	بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے کار شیطان ہیں،
الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ	پس ان سے بچو تاکہ تم کو فلاح نصیب ہو۔
فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (مائدہ)	

(۲) مالی نمو اور حصول نفع کا وہ معاملہ جس میں جانبین سے کسی ایک جانب میں حقیقی رضا، نہ پائی جاتی ہو بلکہ اضطراری اور جبری رضار کو حقیقی رضا، کے قائم مقام رکھا گیا ہو۔ مثلاً سود (بیاج) یا کسی اجیر کی اس کی محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت۔

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ)	اللہ تعالیٰ نے بیع (جائز تجارت) کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام
نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضطرار سے مجبور کی خرید و
عن بيع المضطر الخ ؎۱	فروخت (معاملہ) کو منع فرمایا ہے (یعنی اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے)

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اجبری اور اضطراری رضار کو اسلامی نقطۂ نظر سے غیر معتبر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

فان المفلس يضطر الى التزام مالا	اس لئے کہ "مفلس" مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس چیز
يقدر على ايفائه وليس رضاه رضا في	کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بیچارگی کی وجہ
الحقيقة فليس من العقود للمرضية	سے اپنے ذمہ لازم کرے اور یہ رضا ہرگز حقیقی رضا نہیں ہے۔ پس ربطہ
ولا الاسباب الصالحة وانما هو	جیسا معاملہ "نہ پسندیدہ معاملات میں سے ہے اور نہ کاروبار کے
باطل وسحت الخ ؎۲	صالح اور درست معاملات میں سے اور بے شبہ یہ معاملہ باطل و ظلم ہے

(۳) ایسا کاروبار جو اسلام کی نگاہ میں "معصیت" ہو مثلاً شراب، مردار، اصنام (بت) خنزیر وغیرہ کی بیع و شرار یا ان اشیاء کی خرید و فروخت جو اپنی ذات میں نجس اور ناپاک ہوں۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ	اے مسلمانو! تم پر مردہ خون اور خنزیر کا گوشت حرام
الْخِنْزِيْرِ ۔	کر دیا گیا ہے۔

؎۱ ابو داؤد ؎۲ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۳۔

عن جابرؓ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ان اللہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام الخ۔[1]

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت کو حرام کر دیا ہے۔

(۴) وہ معاملات کہ جن میں جانبین سے عقد ہو جانے کے باوجود بھی نزاع اور مناقشہ کی صورتیں باقی رہیں اور کسی بھی فریق کے لئے ضرور نقصان کا باعث ثابت ہوں، کیونکہ یہ مقصد تجارت کے منافی ہے۔ مثلاً بیع یا ثمن یا دونوں میں ابہام رکھا گیا ہو اور تصریح نہ کی گئی ہو کہ کس قیمت میں خریدا ہے یا کس شے کو خریدا ہے یا ایک معاملہ کو دو معاملے بنا لے، یعنی یہ کہے اگر نقد خریدیگا تو اس شے کی قیمت سو روپے ہے اور اگر ادھار لیجیے گا تو دو صد روپیہ اس کی قیمت ہے یا جن معاملات میں بیع (مال) کو دیکھنا ضروری ہے اس کو دیکھے بغیر کر لیا، یا بیع و شرا میں ایسی شرط لگا دی جو معاملہ کا جزء یا رکن نہیں ہے یا بیع مجہول کر لی۔ یعنی دونوں جانب صرف باتیں ہی رہیں اور بیع و ثمن دونوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا تو یہ اور اسی قسم کے معاملات میں تعاون باہمی کی بجائے نزاع اور مناقشہ کی بنیاد پڑتی ہے۔

نھی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن بیعتین فی بیعۃ[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معاملۂ بیع کو دو معاملاتِ بیع بنانے کی ممانعت فرمائی ہے

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع وشرط۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ (خارج) شرط لگانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان ابیع مالیس عندی[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو منع فرمایا ایسی شے کے فروخت کرنے سے جو بیع کے وقت میری ملکیت میں نہیں ہے۔

(۵) وہ معاملہ جس میں دھوکا اور فریب مضمر ہو مثلاً ایک شے کی خرید یا فروخت منظور

[1] رواہ الجماعۃ نیل الاوطار ج ۵۔ [2] نسائی و ترمذی۔ [3] معجم الاوسط للطبرانی۔ [4] ترمذی۔

ہو مگر خاص غرض کے ماتحت معاملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا اور ایک دوسری شے کے ضمن میں اسکو لے لیا گیا ہے اس طرح کہ اگر ضمنی شے جو بہت ناقص ہو یا سب سے بہتر ہے اس معاملہ کے اندر شامل ہو گئی تو معاملہ کر لیا ورنہ معاملہ کے تمام شرائط مکمل ہو جانیکے بعد معاملہ سے انکار کر دیا

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الحصاۃ و بیع الغرر[۱]	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکے کے معاملہ کو بھی حرام قرار دیا ہے اور کنکری پھینک کر کسی شے کی خریداری کرنیکو بھی"۔
نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن الملامسۃ و المزابنۃ[۲]	بند گانٹھوں کا معاملہ یا کسی شے کو صرف چھو دینے یا کسی شے کو صرف بائع یا مشتری پر ڈال دینے با بیع و شرا کا معاملہ کر لینے کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے"۔
نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن النجش[۳]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملین بیع میں کھوٹ اور (بد معاملگی) کرنیکو ناجائز قرار دیا ہے۔

چونکہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے معاملات میں یا قمار کے جرائم پائے جاتے ہیں اور یا متعاقدین میں سے کسی ایک کے ضرر و نقصان کا باعث بن کر بد معاملگی "نجش" اور "منافشہ کا باعث ہوتے ہیں اس لئے اسلام کے معاشی نظام نے اس قسم کے تمام معاملات اور کاروبار کو فاسد و باطل کہہ کر ممنوع قرار دیا ہے۔

نھی رسول اللہ عن تلقی الرکبان[۴]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے نکل کر باہر تجارت کے قافلہ سے جا ملنے کو منع فرمایا ہے۔

اس ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی شہر میں قحط پڑ رہا ہے اور لوگوں کو مثلاً غلہ کی سخت حاجت ہے یہ دیکھ کر چند ارباب دولت شہر سے باہر نکل کر کسانوں، کاشتکاروں اور سادہ لوح تاجرین غلہ کے پاس پہنچے اور غلہ کو سستی قیمت پر خرید لیا تاکہ شہر میں اس کو من مانی گراں قیمت پر فروخت کریں یا ناواقف کاشتکاروں اور تاجروں کو شہر کے نرخ کا پتہ نہ

[۱] مسلم۔ [۲] بخاری و مسلم۔ [۳] بخاری۔ [۴] بخاری۔

دیتے ہوئے باہر ہی سستے سے سستے داموں غلہ خرید لیا اور جب وہ فروخت کرنیوالے شہر میں داخل ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ فریب کیا گیا، اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں اس کو "تلقی جلب" اور "تلقی رکبان" کہتے ہیں اور اس کے نزدیک یہ طریقۂ خرید و فروخت چونکہ بیجا نفع خوری پر مبنی ہے اس لئے ممنوع ہے۔

حنفی فقہ نے اس ممانعت کی حکمت و علت پر بحث کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ یہ ممانعت جب مؤثر ہوتی ہے کہ ایسے کاروبار سے یا شہر اور کسب کو نقصان پہنچتا اور بازار کے نرخ پر برا اثر پڑتا ہو، یا فروخت کرنیوالوں کو دھوکے میں ڈالا اور بازار کے نرخ کے بارہ میں ان کو مغالطہ دیا گیا ہو، اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر یہ بے جا نفع خوری میں داخل نہیں ہوگا اور اسی قسم کی ایک شکل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان جملوں میں ظاہر فرمایا ہے۔

نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان یبیع حاضر لباد۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ شہری گاؤں والوں کے لئے بیع و شراء کا معاملہ نہ کرے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کی اصطلاح میں "بیع حاضر للبادی" کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا تجارتی مال شہر میں موجود ہے مگر وہ بیجا نفع خوری کے لئے شہر والوں کی حاجت و ضرورت کے باوجود ان کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا بلکہ سادہ لوح دیہاتیوں میں جاکر گراں قیمت پر فروخت کرتا ہے یا شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان خرید و فروخت میں مانع ہو کر دیہاتیوں کی جانب سے خود ذمہ دار بنجاتا اور گراں قیمت پر اشیاء خرید کراتا ہے پس اگر یہ معاملہ جانبین میں سے کسی کے لئے بھی نقصان اور ضرر کا باعث ہے تو اس قسم کا کاروبار ممنوع ہے ورنہ اگر محض سمسار (دلال) کی حیثیت سے حصولِ نفع مقصود ہے اور متعاقدین کے لئے باعث مضرت نہیں ہے تو درست ہے۔

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام میں ایسے تمام تجارتی کاروبار کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جن میں یا قمار کی صورت بنجاتی ہو یا سود کی اور اگر یہ دونوں امور نہ ہوں تو پھر وہ نزاع اور مناقشہ کی شکل پیدا کرنیکا باعث اور سبب بنتے ہوں جن سے تعاونِ باہمی اور ہر دو جانب میں جائز نفع کا

فقدان لازم آتا ہو اور بیجا نفع خوری کے لئے راہیں پیدا ہوتی ہوں۔

صنعت وحرفت وسائل معیشت کے شعبوں میں سے تیسرا اہم شعبہ "صنعت وحرفت" ہے اور بے شبہ تمدن وحضارت کی ترقی میں صنعت وحرفت کو بھی نمایاں دخل ہے اور تجارت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کی برکات بھی بہت زیادہ ہیں بلکہ یہ خود تجارت کا ہی ایک اہم حصہ ہے اور تجارت کا بہت بڑا مدار اسی کی ترقی پر ہے۔

اسلام کا ابتدائی دور "مشینوں" کا دور نہ تھا، اس لئے اس ذریعہ سے صنعت وحرفت کی جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان کا تذکرہ "ملوں اور کارخانوں" کی بحث میں آجائیگا۔ مشینیں جن صنعتی اغراض کے لئے بھی استعمال کی جائیں اور آئندہ ایجادات میں کام میں لائی جائیں اور ان کے استعمال کے جو طریقے بھی بن پڑیں اسلام کے اقتصادی نظام میں ان سے متعلق اساسی وبنیادی احکام بھی آئندہ صفحات میں بیان ہونگے لیکن دستی مصنوعات اور دستی کاروبار کے لئے اسلام نے ترغیبات کا سلسلہ بھی رکھا ہے۔ اور اس کی انواع واقسام اور بعض جزئی تفصیلات تک کا بھی ذکر کیا ہے اور توجہ دلائی ہے کہ معاشی زندگی کی ترقی میں یہ ایک نہایت مرغوب اور پسندیدہ عملی جد وجہد ہے۔

عن المقدام عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما اکل احد طعاما قط خیرا من ان یاکل من عمل یدہ وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدہ [۱]	مقدام کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے اور حضرت داؤد نبی اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے

حضرت داؤد "زرہ" بنانے اور جنگ کے لئے لوہے کی قمیص کی صنعت کا کام کرتے تھے حدیث میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

خالد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انسان کے لئے کسب معاش کا کونسا ذریعہ بہتر ہے؟ فرمایا: دستکاری۔ [۲]

[۱] بخاری ابواب البیوع۔ [۲] ابن ماجہ۔

اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے لبسند منقول ہے۔

کان داؤد سردّادًا وکان آدم	داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے اور آدم علیہ السلام
حراثًا وکان نوح بحاسًا	کاشتکاری کرتے تھے اور نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام
وکان ادریس خیاطًا	کرتے تھے اور حضرت ادریس درزی کا پیشہ کرتے
وکان موسیٰ داعیًا۔	تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے
؎	کا کام کرتے تھے۔

اسلام سے پہلے "قریش" اگرچہ تجارت کے خوگر تھے اور سورہ "ایلاف" میں گرمی و سردی کے کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کا اسی لئے تذکرہ کیا گیا ہے تاہم اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے ذرائعِ آمدنی ان کی معاش کا ذریعہ تھے بلکہ بعض اوقات وہ ان کو تجارت پر بھی ترجیح دیتے تھے یعنی جوا، غارت و لوٹ، اور سودی لین دین۔

اسلام نے ان فاسد اور باطل راہوں کو بند کر کے صرف جائز طریقہ ہائے تجارت کو باقی رکھا، ان کی ترغیب دی، اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بُصریٰ کی منڈی میں حضرت خدیجہؓ کے مال کی خرید و فروخت فرمائی اور اس طرح مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ پیش فرما کر ان کو با اخلاق تاجر بنایا، بُننے، سینے، جوتیاں بنانے، برتن بنانے اور اسی قسم کی گھریلو ضروریات کو خود تیار کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی، عورتوں کو کاتنے کی ترغیب دی تو مردوں کو بُننے کی تلقین کی اور اس طرح دستکاری سے روزی کمانے کو دنیوی فلاح بھی بتایا اور اخروی شادکامی کی بشارتوں سے بھی نوازا۔

اسلام نے اس بارہ میں بھی صرف ترغیبات اور ضروری اصلاحات ہی تک اپنی رفتار کو محدود نہیں رکھا بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ذرائع کو وسیع کیا اور خلافت راشدہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ حکومت میں عرب سے باہر ایران، شام، عراق، مصر، اور روم میں تجارتی منڈیاں قائم اور انکی ترقی کے لئے بہتر سے بہتر سہولتیں مہیا کی گئیں۔

؎ فتح الباری ج ۴ کتاب البیوع۔

تجارت وصنعت کے عملی وسائل

مادی ترقی کے اس دور میں تجارت وصنعت کی ترقی وکامیابی میں دو چیزوں کا بہت دخل ہے (۱) شرح تبادلہ (۲) محصولات در آمد و بر آمد۔ اسلامی اقتصادی نظام کے دور اول میں پہلی چیز کا وجود نہیں تھا اس لئے کہ اس زمانے کی تجارت بیشتر اشیاء کے بدلہ میں اشیاء ہی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی اور کہیں کہیں ٹکسالی سکہ اور چاندی سونے کی غیر مسکوک ڈلیوں کے ذریعہ بھی لین دین ہو جایا کرتا تھا، اس لئے تبادلۂ سکہ جات کے جو اثرات آج کل کی تجارت پر پڑتے ہیں اور اقتصادی فلاح و بہبود یا تباہی و بربادی لاتے ہیں، اس زمانے میں ان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ البتہ دوسری چیز یعنی در آمد بر آمد پر محصول کا سسٹم اس زمانہ میں بھی رائج تھا۔

ایک قومی وملکی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی تجارتی ترقی کے لئے شرح مبادلہ اور محصولات کو اس طرح قائم کرے جس سے نقصان کے بجائے فائدہ اور ناکامی کی جگہ کامیابی کے ساتھ ملک مالا مال ہو، چاہے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام کو اس کی وجہ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن چونکہ اسلام عالمگیر پیغام، اور اخوت عالم کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں وہ ایسے ترجیحی سلوک کا قائل نہیں ہے جس سے ملکوں اور قوموں کے درمیان تجارت کے نام سے معاشی دست برد اور تجارتی حسد و بغض پیدا ہو، اور نتیجہ میں ایک کی غلامی اور دوسرے کی آقائی یا ایک کی خوش حالی اور دوسرے کی تباہی ظاہر ہو۔ اس لئے اس نے تجارت کے محصولات کے بارے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے اور در آمد و بر آمد پر اس قسم کی پابندیاں نہیں عائد کیں جو اس مہذب دور کی حکومتوں نے استحصال بالجبر کیلئے ایجاد کرلی ہیں۔ اس نے تو فطری تقاضہ کے مطابق یہی فیصلہ دیا ہے کہ "تجارت" معاشی ذرائع میں سے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس کو اپنے اور پرائے کا فرق کئے بغیر ٹیکسوں اور محاصل سے معاف رکھا جائے تاکہ خدا کی کائنات کے مختلف حصوں کی مخصوص اشیاء دوسرے حصوں میں

آسانی کے ساتھ لی دی جا سکیں۔ اور خدا کی تمام مخلوق، محبت اور پریم کے ساتھ ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے۔ اور خالق کائنات کی یہ ساری کائنات ایک برادری اور ایک ہی کنبہ بنجائے، لیکن جب تک یہ صورت حال نہ پیدا ہو اس وقت تک اپنی جماعتی زندگی کی فلاح کے لئے مساویانہ سلوک پر عملدرآمد کیا جائے۔ لہٰذا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب عراق اور شام کے گورنروں نے یہ اطلاع دی کہ نصاریٰ و یہود کے ممالک میں جو مسلمان تاجر جاتے ہیں اُن سے مال تجارت پر محصول لیا جاتا ہے تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ حکم دیا کہ اگر وہ ہمارے ملکوں میں مالِ تجارت لے کر آئیں تو جس حساب سے وہ ہمارے تاجروں سے محصول لیتے ہیں اُسی حساب سے ان سے بھی محصول لیا جائے اور اس کا اصطلاحی نام عشور رکھا گیا۔

وکان مذهب عمر فیما وضع من	حضرت عمرؓ کا یہ مذہب ہے کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ
ذلك انه کان یاخذ من المسلمین	لیتے تھے اور اہل حرب سے عشور وصول کرتے تھے
الزکوٰۃ ومن اهل الحرب العشر تاما	اس لئے کہ حربی حکومتوں کا یہ دستور تھا کہ جب
لانهم کانوا یاخذون من تجار	مسلمان تاجر ان کے ملکوں میں جاتے تو اسی طرح
المسلمین مثله اذا قدموا بلادهم۔[1]	کا محصول وہ ان سے وصول کرتی تھیں۔

اور اس کے باوجود حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ تھا کہ ایک تاجر سے سال میں صرف ایک ہی مرتبہ لیا جائے خواہ وہ سال کے اندر متعدد بار مال درآمد برآمد کیوں نہ کرے نیز پھلوں پر محصول معاف تھا۔ مسطورہ بالا امور کے علاوہ خلافتِ اسلامیہ نے اور دوسرے طریقوں سے بھی تجارت و صنعت کو فروغ دیا اور اقتصادی حالت کو ترقی دینے کی راہ اختیار کی۔ مثلاً:

(۱) اسلام سے پہلے عرب کی تجارت کا بہت بڑا تعلق مصر، روم، ایران اور ہندوستان کے ساتھ تھا اور اس کے لئے انھوں نے حسب ذیل مقامات میں منڈیاں قائم کر رکھی تھیں۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۵۳۱۔

دومۃ الجندل، مشقر، ہجر، صحار، ریا، شحر، عدن، صنعاء، رابیہ، حضر موت، عکاظ، ذو المجاز، بصری۔[۱]

اسلامی خلافت نے بھی ان کو باقی رکھا اور جلیل القدر صحابہؓ نے خود بھی کاروبار کیا اور قرآن عزیز نے "وابتغوا من فضل اللہ" کہہ کر اس کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا، مدینہ طیبہ کے مقام سُنح میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کپڑے کا گودام اور کارخانہ تھا[۲]۔ حضرت عمرؓ کی تجارت کا تعلق حجاز سے لیکر ایران تک وسیع تھا[۳]۔ حضرت زبیرؓ کی بھی کپڑے کی تجارت تھی اور شام کے ساتھ بیوپار کرتے تھے خاص حجاز میں "عکاظہ" کی منڈی ۱۲۹ھ تک قائم رہی[۴]۔

حضرت عمرو بن العاص اور عمارہ بن ولید کا تجارتی کاروبار حبشہ میں نجاشی اور اس کے اعیانِ سلطنت کے ساتھ چلتا تھا[۵]، اور اس طرح بیشتر صحابہ تجارتی کاروبار میں مشغول تھے۔

اسی طرح مدینہ طیبہ میں یہود کی تجارتی منڈیاں اور صنعت و حرفت کے کارخانے تھے۔ انصارِ مدینہ نے صنعت و حرفت کا کام ان ہی سے سیکھا اور اسلام قبول کرنیکے بعد پھر انہی کے ہاتھ میں یہ کام آگیا۔ یہود نے ان کو کپڑا بننا، رنگ سازی، تلواریں، زرہ اور دیگر آلاتِ جنگ نیز کاشتکاری کے آلات بنانا سکھایا۔[۶]

بَرّی تجارت کے علاوہ بحری تجارت کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ اسلام سے پہلے اور اسلام کے زمانہ میں اہلِ عرب کی تجارتی برآمد میں سونا، چاندی، تانبا، موتی، لوہا، جواہرات، خوشبوئیں کھانے کا مسالہ، چمڑا، کھال، زین پوش بھیڑ اور بکری تھے۔ اور درآمد میں دوسرے ملکوں سے کپڑا غلہ، ہتھیار، آئینہ اور دوسری آرائش کی چیزیں مشک، سیاہ مرچ، عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی کافور، زنجبیل، صندل، ناریل اور لونگ وغیرہ اشیاء تھیں۔ قرآنِ عزیز نے بحری تجارت کے متعلق ایک جگہ اس طرح ترغیب دی ہے۔

---

[۱] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۱۶ از تاریخ یعقوبی ج ۱ [۲] ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۱ - الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱ ص ۱۰۸ [۳] مسند احمد ج ۱ ص ۶۲ و ج ۳ ص ۴۴۳ (حدیث متعلقہ حبیہ سندی) [۴] فتح الباری ج ۳ ص ۲۶۹

[۵] فتح الباری ج ۳ ص ۲۶۴ [۶] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱ ص ۱۳۰۔

وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (فاطر)

اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سمندر میں پانی پھاڑ کر چلتی ہیں تاکہ تلاش کرو اس کے فضل (تجارت) کو۔

ان تفصیلات کے ذکر سے یہ مقصد ہے کہ تجارت اور صنعت و حرفت جو اقتصادی نظام کی جان ہے، اسلام نے اپنے اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا اور اسکو فروغ دینے اور کامیاب بنانے میں امکانی کوشش کی۔ بلکہ اسلامی حکومت نے کہ جس کا ابتدائی مرکز حکومت سرزمینِ حجاز تھا، تجارت اور صنعت و حرفت ہی کو اقتصادی زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ تسلیم کیا اور اسلامی روایات نے مذہبی بشارات کے ساتھ اس کی پرزور تائید کی۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام کے معاشی نظام نے تجارت اور صنعت و حرفت کے بارے میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ تجارت وصنعت اصولاً محاصل کی پابندی سے آزاد ہوں ورنہ کم از کم سخت پابندیوں، سخت ڈیوٹیوں اور سخت محصولات سے بلاشبہ آزاد ہونی چاہئیں تاکہ دنیا میں عام خوشحالی اور فارغ البالی پیدا ہو اور ہر شخص کو سامان معیشت مہیا کرنے میں آسانی ہو، لیکن اس کے مقابلہ میں تہذیب کے اس دَورِ جدید میں دنیا کی خوش حالی انسانوں کی فارغ البالی کے لئے کیا کیا سامان فراہم کئے گئے ہیں اور اقتصادیات کو مستقل علم و فن بنانے کے مدعیوں نے دنیا کی اقتصادی بدحالی کو کس حد تک دُور کیا ہے؟ اس کا جواب مجھ سے زیادہ آپ دے سکتے ہیں۔

دار الضرب یا ٹکسال تجارتی کاروبار اور تمام قسم کے لین دین میں "سکہ" بہت اہمیت رکھتا ہے، انسان کے ابتدائی دورِ تمدن میں چیزوں کا لین دین عموماً چیزوں ہی کے ذریعہ سے ہوا کرتا تھا اس کے بعد سونا چاندی، تانبا قسم کی دھاتوں کے ٹکڑوں کے ذریعہ ہونے لگا اور تیسرے دَورِ ترقی میں "سکہ" نے ان دونوں کی جگہ لے لی۔ سکہ کے وجود میں آنے کے بعد ترقی کا ایک درجہ یہ آیا کہ دار الضرب کا مطبوعہ کاغذ "نوٹ" کے نام سے دھات کے سکہ کا قائم مقام ہو گیا اور اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کسی ملک کی اقتصادی ساکھ جب قائم رہ سکتی ہے کہ اسکے دار الضرب میں وہ دھات جو سکہ کا معیار قرار دی گئی ہو اتنی مقدار میں موجود ہو جس مقدار میں نوٹ جاری کئے گئے ہیں۔

لیکن اس ترقی کے نتائج جس قدر تباہ کن ثابت ہوئے ہیں وہ آفتاب کی طرح روشن ہیں کیونکہ یہ ایجادِ نو ایک ایسا حربہ ہے کہ محض محکوم اقوام کی اقتصادی حالت ہی کو برباد نہیں کرتا ہے بلکہ رقیب حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے ان دو حربوں ہی سے کام لیتی رہتی ہیں جو بیجا شرحِ مبادلہ اور کاغذی سکہ کے نام سے مشہور ہیں۔

ممکن ہے کہ زمانہ کی بعض ضروریات اس مہلک ایجاد کے جواز کے لئے معقول دلائل و وجوہ بیان کردیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کا نقصان اور ضررِ عظیم اسکے فائدہ سے بہت زیادہ ہے

واثمهما اکبر من نفعهما — اور ان دونوں کا نقصان ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے

اس لئے اسلامی اقتصادی نظام، ایسے "کاغذ" کو سند تو تسلیم کرسکتا ہے لیکن "سکّہ" تسلیم نہیں کرسکتا تاکہ کسی وقت بھی اس کاغذ کا مالک کاغذ کی اصل سے محروم نہ رہ جائے اور کسی قوم یا ملک کو اس راہ سے برباد و تباہ کرنیکا حیلہ ہاتھ نہ آجائے، جیسا کہ آج محکوم قوموں کے ساتھ ہورہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب غلام آباد ہندوستان میں نوٹ رائج ہوا تو علمائے اسلام کے مابین یہ علمی بحث چھڑ گئی کہ یہ سکہ ہے یا اس کی سند ہے اور نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ ادا ہوسکتی ہے یا نہیں اور منی آرڈر کے ذریعہ "زکوٰۃ" یا کسی امانت کی رقم کو نوٹوں کی وساطت سے پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں اس بارے میں ہندوستان کے مشاہیر علماء، عدم جواز کے قائل تھے۔

ہمارے روشن خیال حضرات کو جب اس بحث کا علم ہوا تو انھوں نے حسب عادت اسکا کافی مذاق اڑایا اور اس جانب مطلق توجہ نہ فرمائی کہ آخر اس بحث و مذاکرہ کی بنیاد کیا ہے؟ تاہم اسلامی حکومت نہونیکی وجہ سے جب اس فیصلہ سے بہت بڑا حرج ہونے لگا تو ان علماء نے اگرچہ مجبوراً "عموم بلویٰ" عام ابتلا کی فقہی اصطلاح کے مطابق جواز کا فتویٰ دیا لیکن اصل حکم کے اعتبار سے اس کو سکہ نہیں تسلیم کیا۔

خلافت راشدہ کے دورِ خلافت میں دار الضرب موجود تھا۔ اور اسمیں سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ سونے اور چاندی کے سکّے قسم قسم کے رائج تھے جو درہم و دینار کے نام سے موسوم تھے۔

وضرب الدراهم علی النقش الفارسی	حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکومت فارس کے طرز پر
وزاد فی بعضہا الحمد للہ وفی	سکوں کیلئے دار الضرب قائم کیا اور بعض سکوں پر "الحمد للہ"
بعضہا محمد رسول اللہ ؀	اور بعض پر "محمد رسول اللہ" کے نقش کا اضافہ کیا۔

مقریزی نے کتاب النقود الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ دور اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے چاندی سونے کی سادہ ڈلیوں کو مدور سکوں میں تبدیل کیا جو نوشیروانی سکوں کے مشابہ تھے اور بعض پر "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ" بعض پر "الحمد للہ" اور بعض پر "محمد رسول اللہ" نقش کرایا اور یہ کہ ان کے زمانہ میں دس درہم محمدی وزن چھ مثقال کے برابر ہوا کرتا تھا ؀

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے بصرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ۴۰ھ میں چاندی کا سکہ ڈھالنے کے لئے دار الضرب قائم کیا ؀ اور بستانی کی دائرۃ المعارف میں ہے کہ

درھم اور س ھما سیم المضرب	درہم چاندی کے سکہ کو کہتے ہیں جو دار الضرب میں ڈھالا گیا
مدوّر من الفضۃ والمشھور	ہو اور مدور ہو اور مشہور یہ ہے کہ اس کو گول سکہ کی شکل
ان تدویرہ فی خلافۃ الفاروق	حضرت فاروق رضؓ کے زمانہ میں دی گئی ہے ورنہ اس سے
وکان قبلہ علی شکل النواۃ بلا نقش الخ	قبل وہ غیر منقش کھجور کی گٹھلی کی شکل میں تھا۔

اور عام کتب سیرت میں عبد الملک بن مروان کا نام لیا جاتا ہے اور بعض نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی جانب ابتدار کی نسبت کی ہے۔ چنانچہ ماوردی کی الاحکام السلطانیہ بلاذری کی فتوح البلدان اور ابن جریرؒ و ابن کثیرؒ کی تاریخ میں تفصیلات مذکور ہیں۔

میرے نزدیک یہ اختلاف حقیقت پر نہیں بلکہ شہرت و عدم شہرت پر مبنی ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چاندی سونے کو عام سکوں کی شکل میں ڈھالنے کی ابتدا اگرچہ فاروق اعظم کے زمانہ میں ہو گئی تھی لیکن سادہ ڈلیوں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا بعد میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے عبد الملک کے زمانہ میں صرف دار الضرب (ٹکسال) کا سکہ ہی استعمال ہونے لگا چنانچہ مذہب و اخلاق کی

۱؎ تاریخ الاسلامی السیاسی ج ۱ ص ۴۵۵ ۲؎ اشاعت ۱۲ ج ۱، ص ۲۰۴۔ ۳؎ ج ۷، ص ۶۷۔

دائرۃ المعارف سے بھی پتہ چلتا ہے۔ [۱]

دار الضرب (ٹکسال) کی حیثیت؟	چونکہ "سکہ" عوام کی کاروباری زندگی کی سہولیت کا ایک ذریعہ ہے اسلئے اس کے دار الضرب کا مقصد نفع عوام ہے نہ کہ حکومت کا مخصوص شعبۂ

آمدنی، اس لئے اسلامی نظام اقتصادی میں ٹکسال کو صرف حکومت کے خزانہ ہی کے لئے مخصوص نہ ہونا چاہیے بلکہ عوام کو یہ سہولت ہونی چاہئیے کہ اگر وہ اپنی مملوکہ دھات سے مروجہ سکہ کو مسکوک کرانا چاہیں تو کرا سکیں چنانچہ فتوح البلدان میں مروان بن الحکم کے دار الضرب سے متعلق تصریح ہے کہ وہ حکومت اور عوام دونوں کے لئے عام تھا۔ [۲]

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں۔

(۱) شرح مبادلہ "امام" اور اس کی "مجلس شوریٰ" کی رائے پر اصول بالا کی روشنی میں موقوف ہے اور وہ عام اقتصادی ترقی کے لیے جو صورت بھی مفید سمجھیں اختیار کریں۔

(۲) محصولات یعنی کسٹم "ڈیوٹی" وغیرہ میں اپنی جانب سے سختی کا قائل نہیں ہے اور اپنے نظام میں تجارت کو وسعت دینے کے لئے "بے قید تجارت" کا حامی ہے لیکن اس نظریہ کی ہمہ گیری اسی وقت ممکن ہے کہ اس کی تعلیم حق کی طرح اس کا نظام حکومت بھی عالمگیر ہو اور جب تک یہ صورت حال موجود نہیں ہے اس وقت تک کے لئے وہ دوسرے ممالک اور اپنے ممالک کے درمیان انصاف کے مطابق معاملہ کو اختیار کرنا پسند کرتا ہے وہ نہ دوسروں کو نقصان دینے کا خواہشمند ہے اور نہ خود اپنے لئے مضرت قبول کرنے پر آمادہ ہے

علی پاشا مصری اقتصادی بحث میں لکھتے ہیں:۔

یہ ظاہر ہے کہ ان جیسے اقتصادی مسائل میں مشہور و معروف مذاہب دو ہیں اول مذہب حریت آزاد تجارت، اس مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ جنبی برآمد پر کسی قسم کا ٹیکس نہ لگایا جاوے اور تجارت کو آزاد چھوڑا جائے، جنبی پیداوار اور حاصلات کی چونکہ انگریزوں کو بہت ضرورت ہے اس لئے ان کے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھکس ج ۳ ص ۷۰۹ [۲] ص ۴۵۴

اکثر ممالک کی اقتصادی پالیسی یہی ہے لہ جب اس مذہب کے مدعی غیر ممالک کے مال پر ٹیکس کے قابل نہیں ہیں تو اندرونِ ملک کی مصنوعات پر تو کسی طرح ٹیکس کو جائز نہیں سمجھتے دوسرا مذہب حمایت ترجیحی تجارت، اس مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ جب کسی ملک میں مصنوعات کی کثرت ہو جاتی ہے تو اسکی قوت اور نفوذِ قوت بہت ترقی کر جاتی اور بہت موثر ہو جاتی ہے اس لئے قومی حکومت کا فرض ہے کہ اپنی ملکی مصنوعات کی حفاظت کرے اور ان کو مقدم رکھے اور اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرے یعنی غیر ملکی تجارت پر بھاری ٹیکس لگائے۔

ان میں سے دوسرے نظریہ میں اقتصادی کشمکش اور ملکی و بین الاقوامی عناد و بغض کی بو آتی ہے اور پہلا نظریہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے تسلیم کرنیوالی اقوام کا عمل اس کے خلاف سخت منافقانہ ہے اور وہ دوسرے نظریہ کے قائلین سے زیادہ محکوم اقوام سے اپنے لئے ترجیحی سلوک کرانے اور ان سے فائدہ اٹھانے بلکہ ان کو تباہ کرنے کے لئے آزاد تجارت کی حمایت کرتی ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی تجارتی پالیسی اس کی روشن مثال ہے۔

اس لئے جب تک تمام دنیا کی قومیں اخلاق کی اس مثلِ اعلیٰ تک نہ پہنچ جائیں جو بمصداق فرمانِ مصطفوی (صلے اللہ علیہ وسلم)،

کلکم بنی آدم و آدم خلق من تراب (مسند بزار) — تم سب ایک باپ آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔

الخلق عیال اللہ (الحدیث) — تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔

اخوت اور مساواتِ انسانی کا بلند درجہ ہے، اس وقت تک اقتصادی نظام کے لئے بہتر طریقِ کار یہ ہے کہ ایک طرف اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے یہ سعی رہنی چاہئے کہ تجارت جیسی مفید چیز آزاد ہو اور اس سے سب کو حسبِ ضرورت فائدہ اٹھانے کا موقعہ میسر آئے اور اس مبارک وقت کے آنے تک غیر مسلم اقوام سے عدل و انصاف کے ساتھ مساویانہ تجارتی تعلقات

لہ خاطرات الفقہ والاقتصاد والاجتماع ص ۲۱۱ و ۲۱۲ مختصراً

قائم رہیں چنانچہ فاروقِ اعظمؓ کا فرمانِ ذی شان ہمارے اس دعوے کی روشن مثال ہے۔[۱]

تجارتی بدعنوانیوں کا انسداد

تجارت کو اقتصادی نظام کا اہم جزو قرار دینے اور اپنے نظام میں تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں بہم پہنچانے کے باوجود اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بدعنوانیوں کا سدباب کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے جو درحقیقت "اقتصادی نظام" کے مقصد اور نصب العین کو تباہ و برباد کرنیکا باعث بنتی ہیں اور تجارت کے نام سے عام بدحالی اور قابلِ نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں اقتصادی نظام کو برباد کرنے اور اس کو کھوکھلا بنانے میں بدعنوانیوں کی جس قدر بھی تفصیلات و جزئیات ہو سکتی ہیں وہ صرف دو بنیادوں پر قائم ہیں، اسلام نے اپنی اصلاح میں ان کو دو خصوصی نام سے موسوم کیا ہے۔

(۱) احتکار (۲) اکتناز

احتکار سے مراد یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محصور و محدود ہو جائے اور اکتناز کے معنی یہ ہیں کہ دولت کے عظیم الشان خزانے افراد کے پاس جمع ہو جائیں اور انکے پھیلاؤ اور تقسیم کی کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام نہ اسکو منظور کرتا ہے اور نہ اسکو اس لئے وہ ہر معاشی و اقتصادی شعبہ میں ان دونوں کے خلاف قانون سازی کے ذریعہ جہاد کرتا اور ان دونوں ملعون راہوں کو بند کرتا ہے احتکار کے سلسلہ میں ارشادِ نبوی ملاحظہ ہو۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من احتکر فھو خاطئ وفی روایۃ المحتکر ملعون۔[۲]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احتکار کرنے والا خطاکار ہے، اور ایک جگہ فرمایا کہ اس پر خدا کی پھٹکار ہے۔

"فقہ" میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص "غلہ" وغیرہ کو بہت بڑی مقدار میں اسلئے خرید لے کہ بازار گراں ہو جائے اور پبلک میں اس چیز کی مانگ کا "مرکز" صرف وہی بن جائے اور پبلک اس کے مقررہ نرخ پر مجبور ہو جائے اور وہ من مانی گراں فروشی کر سکے۔[۳]

---

[۱] کتاب الاموال لابی عبید ص ۵۳۱ [۲] مسلم، ابوداؤد، ترمذی، کتاب البیوع [۳] طیبی شرح مشکوۃ کتاب البیوع

اس "احتکار" کی مثال کے لئے اس زمانہ میں زیادہ کنج وکاؤ کی چنداں ضرورت نہیں ہے مہاجنوں کا گروہ جو کاشتکاروں کو قرض کے نام سے سود پر روپیہ دیکر ان کی کمائی کو "غلہ کی شکل میں" دست برد کرتا اور ان سے ارزاں نرخ پر خرید کر کھیتوں (غلہ کے خزانوں) میں بھر رکھتا ہے اور اسطرح ارزانی وگرانی کا کفیل بنجاتا ہے "احتکار" کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اس گروہ کے اس عمل سے کاشتکار اور عوام الناس جسقدر پریشان ہوتے اور بعض موسموں میں اقتصادی بدحالی کے شکار بنتے رہتے ہیں اس کا نتیجہ بد ہندوستان کے باشندوں کے سامنے شاہد عدل ہے۔

سودی لین دین کے بعد اگر کوئی معاملہ عام بدحالی کا باعث ہے تو وہ یہی تجارتی کاروبار ہے جو اجناس واشیاء کے احتکار کی شکل میں سامنے آتا ہے

قمار یا سٹہ | "احتکار" کی دوسری جزئی "قمار" ہے اس سے ہماری مراد صرف "جوئے" کی وہ عام شکل نہیں ہی جو نقد کے ذریعہ کھیلا جاتا ہے بلکہ تمام صورتیں اس میں شامل ہیں جو تجارت کے نام سے کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں قمار ہی کی قسمیں کہلاتی ہیں۔ مثلاً سٹہ آپ اگر کاروبار سے واقف ہیں تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ "تجارتی جوا" ملک کے اقتصادی نظام کو کس طرح تباہ اور پراگندہ کرتا، اور بغیر محنت نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھروں کو خانماں برباد کرکے چھوڑتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کی بہت سی شکلیں رائج تھیں مثلاً ملامسہ، منابذہ، بیع حصاۃ وغیرہ ملامسہ کا طریقہ تھا کہ بائع ومشتری کے درمیان یہ طے ہوجاتا تھا کہ بغیر دیکھے اور حقیقت معلوم کئے ہوئے مشتری جس کپڑے یا شئے کو چھودیگا وہ اس کا مالک ہے اور منابذہ میں یہ طے ہوتا تھا کہ جو کپڑا یا شئے بائع، مشتری کی جانب پھینک دیگا وہ بغیر معاملہ کے مشتری کی چیز سمجھا جائے گا اور بیعِ حصاۃ یہ ہوتی تھی کہ متعدد اشیاء فروخت کے نام سے رکھدی جائیں اور لوگ ٹھکری یا اسی قسم کی کسی شئے کو اس کی جانب پھینکیں جس چیز کو وہ ٹھکری چھوجائے خواہ وہ کسی قیمت کی ہو مشتری کی ملکیت ہوجائیگی موجودہ دورِ ترقی کے مہذب تجارتی جوئے لاٹری اور ریس سب اسی قسم کے معاملات میں داخل ہیں۔

اسلام ان کو "میسر" قمار اور جوا قرار دیتا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو با اصول تجارت کے لئے تباہ کن سمجھتا، اور معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے اور ان باتوں کے علاوہ سوسائٹی کے اخلاق اور کیرکٹر کے لئے باعث ذلت و رسوائی جانتا ہے۔

کیونکہ یہ معاملات اکثر جنگ وجدل کا باعث بنتے ہیں۔ مواساۃ، رواداری، ہمدردی، اور مروت کو تباہ اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دیکر انسانی جوہر کو برباد کرتے ہیں

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ آپ سے شراب اور قمار کی بابت
فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (بقرہ)	پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے
اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَ	بلاشبہ شراب، جوا، بت، پانسے یہ سب سر تا سر نجاست ہیں اور
الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ	کار شیطان ہیں پس تم ان سے بچو۔
فَاجْتَنِبُوْهُ (مائدہ) اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ	بلاشبہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی راہ سے
اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ	تمہارے درمیان بغض وعداوت قائم کردے اور تم کو اللہ
فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ	کی یاد اور نماز سے روک دے۔ بس کیا تم ان برائیوں
اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (مائدہ)	سے باز رہو گے؟

حکیم علامہ شاہ ولی اللہ شاہ اس قسم کے معاملات قمار کی مضرت کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں

"اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور بساط ارض پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا ان کو موقع بہم پہنچایا تو انسانوں کے درمیان جنگ وجدل اور کشمکش برپا ہوگئی تب خدا کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی محنت، وراثت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریق سے کسی چیز کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کشمکش کا حقدار نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعہ خریداری اور معتبر و صحیح رضامندی کے ساتھ معاملت سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید و فروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم و یقین ہو اور فریب، چالبازی اور دخل فصل کا اس میں ہرگز کوئی شائبہ نہ ہو اور جب کہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی

معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہو تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ باہمی تعاون پایا جاتا ہو، بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا مقصود ہو جیسے "قمار" یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں [1]

بہرحال اسلام کے اقتصادی نظام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لئے مطلق کوئی جگہ نہیں ہے جو یا صریح "قمار" ہوں اور یا ان کی تہ میں مالی ترقی کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو "قمار" میں پایا جاتا ہے اور اگر علم الاقتصاد اور علم الاخلاق دونوں کے ماہرین سے اس بارہ میں دریافت کیا جائے تو بغیر کسی اختلاف کے وہ بھی یہی رائے دینگے بلکہ رائے دے چکے ہیں کہ "قمار" کی قسم کے تمام معاملات اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کے لئے تباہ کن ہیں [2]

غرض احتکار کی یہ دوسری قسم ہے جو اس لئے ممنوع ہے کہ یہ بھی دولت اور سرمایہ کو بعض افراد یا گروہ میں مخصوص کر دینے کا باعث بنتی اور ایک کو تباہ و برباد کر کے دوسرے کے فائدے کی صورت نکالتی ہے اور یہ اخلاق اور انسانیت کی نگاہ میں سب سے بڑا جرم اور سوسائٹی کی نظر میں ناقابل معافی ہے

سود احتکار کی سب سے ملعون قسم "سودی لین دین" ہے جس اقتصادی نظام میں اس کا عمل دخل ہے وہ یکسر برباد اور تباہ ہے، یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس و محتاج بنا کر ایک مخصوص طبقہ میں دولت کو سمیٹنا اور ان کو اس کا واحد اجارہ دار بنا دیتا ہے

ابتداء عالم انسانی سے ہمیشہ دو نظریئے کارفرما رہے ہیں، ایک "عادلانہ نظام کا نظریہ" اور دوسرا "سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ"۔

پہلے نظریہ کا مطالبہ یہ ہے کہ انسانوں میں ایک ایسا اجتماعی نظام قائم ہو جس میں نہ بڑے بڑے کروڑپتی ہوں اور نہ مفلس و محتاج طبقے بلکہ ایک طرح کی درمیانی حالت ہو جس

---

[1] خلاصہ باب اقتصار المرزق ج ۲ ص ۱۰۳ مصری [2] دائرۃ المعارف فرید وجدی الضعف دوم ج ۷ ص ۴۴ و ۶۲۳ و ۹

ہیں معیشت کے درجات کا فطری تفاوت اگرچہ موجود ہو لیکن حق معیشت کی مساوات ضرور قائم رہے وہ اس کا طالب نہیں ہے کہ سب کی معیشت کے سامان ایک ہی طرح کے ہوں لیکن اس کا ضرور خواہشمند ہے کہ سب کو حسب ضرورت ملے اور ترقی و سعی کی راہیں سب پر یکساں طور پر کھلی ہوں حق اور خدا کے فرستادہ سچے مذاہب اسی نظریہ کے داعی رہے ہیں اور اسلام نے اسی نظریہ کو کامل اور مکمل نقشہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

دوسرے نظریہ کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے کارخانے میں قدرت کے ہاتھوں نے معاشی نقطۂ نظر سے انسانی مخلوق کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے کچھ حکمرانی اور آقائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ بندگی اور محکومی کیلئے۔ اسی طرح قدرت کا یہ منشاء ہے کہ بعض انسانی گروہ دولت و ثروت کے مستقل اجارہ دار ہوں۔ جائز و ناجائز طریقوں سے دولت کو فراہم کریں اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص کرلیں اور بعض طبقے مفلس، محتاج، دریوزہ گر، اور نانِ جویں سے ہمیشہ مجبور و مقہور رہیں اور تفاوتِ درجات کے اس ہولناک فرق کو اعتدال پر لانے کا کسی کو بھی حق نہ ہو یہ نظریہ طاغوتیوں اور آدم رو شیاطین کا ہے اور ان کے اس نظریہ کی عملی کامیابی کی سب سے بڑی بنیاد یہی "مہاجنی سود" ہے جو مہذب اور غیر مہذب شکلوں میں بڑے بڑے گروہوں اور جماعتوں کا خون چوس کر ایک چھوٹی جماعت کو قارون کا خزانہ بخشتا ہے، اور خدا کی مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کا محکوم بناتا ہے۔ بہرحال "سود" ملعون سرمایہ داری کا ہمیشہ سے بہت بڑا پشت پناہ رہا ہے۔

اسلام کی دعوت کا مرکز اولین "عرب" بھی اس لعنت میں گرفتار تھا اور مشرکین عرب "تجارت" اور "سود" میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے، اور ہندوستان کے مہاجنوں اور مدینہ کے سود خوار یہودی گروہوں کی طرح وہ بھی اس لین دین کو اپنی فرزانگی اور بیدار مغزی کا ہنر جانتے تھے۔

قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بقرۃ) وہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار بھی اسی طرح کی چیز ہے جیسا کہ سود کا لین دین

گویا ان کی نگاہ میں "سود" کا کاروبار ایسا صحیح کاروبار تھا کہ وہ بیع و شراء اور تجارتی لین دین کے جواز کے لئے اس کو دلیل بناتے تھے، چہ جائیکہ اس کو ناجائز اور حرام سمجھتے، یا معذرت کے طور پر

کہتے کہ جس طرح تجارت درست ہے اسی طرح سودی لین دین بھی کیوں درست نہ ہو؟

اگر آج بھی سود خوار جماعتوں سے سود کے جواز میں دلیل طلب کرو گے تو ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد انکا وہی جواب ہوگا جو ان کے پیشرؤں نے دیا تھا

ربوا یا سود کی حقیقت

"ربوا" کے لغوی معنی کسی شے کے بڑھنے یا زیادہ ہونیکے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے مطلق بڑھنے یا زیادہ ہونے کو "اصطلاحی ربوا" نہیں کہہ سکتے اور نہ اس پر حرمت کا اطلاق جائز ہو سکتا ہے بلکہ "ربوا" مال میں ایک خاص قسم کے نفع یا زیادت (اضافہ) کا نام ہے جو کاروباری دنیا کی نگاہ میں بیع وشرا کی طرح ایک جائز معاملہ سمجھا جاتا تھا مگر اسلام نے کائنات انسانی کی فلاح وبہبود اور نظام معیشت میں رفعت اخلاق اور باہمی اخوت ومساوات کی بقا کی خاطر حرام قرار دیا ہے اور نہ صرف ان ہی خاص شکلوں کی ممانعت کی ہے جو دعوت اسلام سے قبل جاری تھیں، بلکہ اپنی جانب سے ایسے اصول بیان کیے جن کے زیر اثر قرض اور بیع وشرا دونوں میں شائبۂ سود و ربوا کا کلیتہً انسداد کر دیا تاکہ اسلام کا معاشی نظام ربوا اور شائبۂ ربوا دونوں سے پاک اور بالاتر ہو جائے کیونکہ اسلام سے قبل دور جاہلیت میں اہل عرب ربوا یا سود کو صرف "قرض" کے اندر ہی محدود سمجھتے تھے اور بیع وشرا یا تجارتی کاروبار کو غیر مشروط طور پر جائز قرار دیتے تھے اس لئے جب ان کے سامنے اسلام کا نظریہ "حرمت سود" آیا تو کفار عرب نے فوراً کہہ دیا کہ بیع (خرید وفروخت) جس سے نفع کی توقع کی جاتی ہے ——— بھی تو سود ہی کی طرح کا ایک معاملہ ہے پس اگر نفع و زیادت سود کو حرام قرار دیتی ہے تو بیع وشرا کو بھی حرام ہونا چاہئے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ قرض کے ماسوا کاروبار تجارت میں بھی ربوا (سود) کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

غرض اسلام کے معاشی نظام میں "اصطلاحی ربوا" کا اطلاق مروجہ مہاجنی سود سے زیادہ وسیع اور معاملۂ قرض اور معاملۂ تجارت دونوں سے وابستہ ہے۔

مہاجنی سود

ابھی ذکر ہو چکا کہ اہل عرب قرض اور دین کے ذریعہ جو نفع کماتے تھے اس کو ربوا یا سود سمجھتے اور اس کے جواز کے قائل تھے اور یہ وہی معاملۂ ربوی تھا جس کو آج "مہاجنی سود" سے تعبیر

کیا جاتا ہے چنانچہ آج کی طرح مشرکین عرب میں بھی اس لین دین کے مختلف طریقے رائج تھے۔

(۱) ایک طریقہ یہ تھا کہ صاحب ضرورت کو نقد روپیہ قرض دیتے اور ایک مدت معین کر کے فی روپیہ کچھ مقدار سود کی لگاتے تھے۔

(۲) دوسری صورت یہ تھی کہ جب معین مدت ختم ہو جاتی تو سود اور اصل قرض کو ملا کر اصل قرار دیتے اور پھر اس مجموعہ پر سود لگانا شروع کر دیتے اسی کا نام "سود در سود ہے"

(۳) زیور، ہتھیار، یا اسی قسم کی اشیاء رہن رکھتے اور ان کے عوض قرض دیتے اور اگر معین مدت میں قرضدار قرض ادا نہ کر سکتا تو روپیہ پر سود لگاتے اور اشیاء کی قیمت کم سے کم قرار دیکر ان کو ہضم کر جاتے۔[1] فقہاء کی اصطلاح میں اس کو "ربا نسیہ" کہا جاتا ہے۔

اسلام نے سودی کاروبار کی ان تمام اقسام کو حرام قرار دیا اور بے محنت کی اس کمائی کو ظلم اور سُحت سے تعبیر کیا ہے

چنانچہ قرآن حکیم نے جس اعجاز بلاغت اور حکیمانہ اسلوبِ خطابت کے ساتھ ربوا کی حرمت اور علت حرمت کو بیان کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اس نے اول ربوا کی اس صنف کے متعلق حرمت کا فیصلہ سنایا جو زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب میں عام طریقہ پر رائج تھی اور جو آج بھی سود خوار طبقہ میں اسی طرح جاری و ساری ہے اس نے واضح الفاظ میں یہ حکم دیا:-

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَأْكُلُوا۟ ٱلرِّبَوٰٓا۟ أَضْعَٰفًا مُّضَٰعَفَةً ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران)	اے ایمان والو! تم سود در سود کو ہرگز ذریعۂ معاش نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔

اور پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مطلق سود کے متعلق صاف صاف یہ اعلان کر دیا۔

أَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلْبَيْعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰا۟ (بقرہ)	اللہ تعالیٰ نے تجارتی خرید و فروخت کو جائز کیا ہے اور سود کو ہر حیثیت سے حرام قرار دیا ہے۔

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۵۵۱۔

اور حرمتِ سود کے اعلان کے ساتھ ساتھ گزشتہ واجب الادا سودی رقوم کے متعلق بھی یہ بتا دیا کہ اب تک جو کچھ کر چکے ہو وہ کر چکے مگر حرمتِ سود کے بعد اب قرضداروں پر جو سود رہ گیا ہے اسکو چھوڑ دو اور ہرگز نہ لو ورنہ تو خدا اور اس کے رسول سے جنگ مول لو۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (بقرہ)	اے ایمان والو اگر واقعی تم مسلمان ہو تو سود کی حرمت کے بعد جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس سے درگذر کرو اور اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اور اگر باز آجاؤ اور اس ابتکہ داری سے توبہ کرلو تو تمہارا اصل سرمایہ بہرحال واجب الادا ہے۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ)	اور اگر تم باز آجاؤ تو تمہارا اصل سرمایہ لایا جائیگا اللہ کی مرضی یہ ہے کہ نہ تم لوگوں پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے

اور یہ سب اس لئے ہے کہ :-

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ (بقرہ)	اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فریبکار کو کسی طرح پسند نہیں کرتا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق یہ آخری حد ہے کہ "سود" کو کفر میں شامل کیا گیا ہے۔

وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۝ (روم)	اور جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں ترقی ہو تو وہ اللہ کے نزدیک ترقی نہیں پاتا (یعنی پاداشِ عمل کے قانون کے مطابق یہ آخری نتیجہ گھاٹا اور نقصان ہے۔

گویا تمہاری نگاہوں میں اگرچہ "سود" سے مال میں ترقی ہو رہی ہے لیکن دنیا میں اس شخص کو عداوتوں کی کثرت اور مال کی بہتات کی وجہ سے دلی بے اطمینانی دبے چینی اور ہل من مزید کی مجنونانہ خواہش کی بدولت "سود" سے فائدہ کے مقابلہ میں نقصان زیادہ ہوتا ہے اور آخرت میں اللہ کے پاس تو اس کے لئے نقصان ہی نقصان ہے اور صدقات میں اس کا برعکس ہے یا یوں کہیے کہ اللہ

تعالیٰ حرمت سود کا حکم دیکر سود کو مٹانا چاہتا ہے اور صدقات کی ترغیب دے کر ان کا نشوونما کرتا اور لوگوں میں ان کو عام کرنا چاہتا ہے۔

لیکن ان تمام ہدایات و احکام کے باوجود جو شخص (اس ملعون عمل) سے باز نہیں رہتا اس کو سمجھنا چاہئے کہ وہ "بداخلاقی" کے اس تاریک غار میں گر گیا ہے، جہاں وہ انسانیت کی شمع فروزاں اور اس کی شعاعوں سے یکسر محروم ہے، اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ سود خوار اپنے اس عمل سے خدا اور خدا کے رسول کو جنگ کے لئے چیلنج کر رہا اور اپنی دائمی بدبختی اور خسران جبین پر مہر لگا رہا ہے "فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ"

تم صفحۂ عالم پر مٹتے ہوئے اس نقش کو ذرا غور سے دیکھو جو سامنے "ایک خس پوش جھونپڑی کی شکل میں" نظر آ رہا ہے یہ ایک غریب و نادار بیوہ کا مسکن ہے جس کے پاس دو یتیم و بیکس معصوم بچے شوہر کی زندہ یادگار ہیں۔ پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے چند برتن اس گھر کی کل کائنات ہیں بچے بلک رہے ہیں، بیوہ آہ و زاری کے ساتھ گڑگڑا رہی ہے مگر کچہری کا سپاہی وارنٹ قرقی ہاتھ میں لئے زبان کی گالیوں اور کبھی کبھی ہاتھ کے دھکوں اور مکوں سے بیوہ کی تواضع کرتے ہوئے اپنی سرکاری ڈیوٹی میں مشغول ہے۔ تھوڑے سے فاصلہ پر زرق برق کار میں ایک سفید پوش مہاجن ہنس ہنس کر یہ منظر دیکھ رہا ہے اور بار بار جوش میں آ کر منیب جی سے کہتا جاتا ہے دیکھو تو کس چالاکی سے دوسرے کا مال مارنے کے لئے سوانگ بنا رہی ہے "کہ میرے بچے بھوکوں مر جائینگے، لِلّٰہ رحم کرو، ان یتیموں پر رحم کرو، ان کا کوئی والی و وارث نہیں جب جھونپڑی اور یہ ٹوٹا پھوٹا سامان بھی نہ رہیگا تو ان بیکسوں کا کیا حال ہوگا، جس روز شوہر کو پچیس روپیہ قرض لینے بھیجا تھا اس دن خیال نہیں آیا تھا کہ کسی کا دینا بھی پڑیگا۔ منیب جی سود اور سود در سود کے حساب سے پورے چار سو روپے بیٹھتے ہیں۔ میں نے اکٹھے سو روپے چھوڑ دیئے مگر یہ بے حیا تو دینا ہی نہیں چاہتی اب اس سے زیادہ اور کیا "دیا" ہو سکتی ہے۔ نا صاحب میں اپنی محنت کی کمائی اگر اس طرح چھوڑ دیا کروں تو ایک دن خاک ہی چاٹنی پڑے آخر جھونپڑی نیلام ہو گئی، برتن کپڑے قرق ہو لئے اور بیوہ اور بیوہ کے بچے

روتے پیٹتے گھر سے بے دخل کر دیئے گئے۔

سود خوار کی زندگی کا یہ وہ معمولی سا تماشہ ہے جو حکایات و قصص کی کتابوں میں نہیں بلکہ دنیا کے اسٹیج پر روزانہ واقعات کی شکل میں کھیلا جاتا ہے۔

دراصل سود خوار انسان روپیہ اور دولت کے خمار میں ایسا بدمست ہوتا ہے کہ وہ انسانی اخلاق، مروت، ہمدردی، بلکہ انسانیت کو بے معنی اور مہمل الفاظ سمجھنے لگتا ہے اور خود غرضی، حرص وطمع اور دوسروں کو برباد کر کے اپنے مفاد کا حصول، اسکی زندگی کا نصب العین بن جاتے ہیں، وہ ہر وقت اسی تگ و دو میں پاگل کتے کی طرح مجنون و مخبوط پھرتا رہتا اور مظلوموں اور بے کسوں کی فریاد و حالتِ زار سے اندھا، بہرا اور گونگا بنجاتا ہے، قرآنِ عزیز نے اسی لئے پاداشِ عمل کے قدرتی نتیجہ سے ڈراتے ہوئے عالمِ آخرت میں اس کی اصل کیفیت و حالت کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (آخرت میں خدا کے حضور)
اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ	ایسی حالت میں کھڑے ہونگے کہ گویا ان کو بھوت
الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	پریت لپٹ گیا ہے اور وہ خبطی ہو گئے ہیں یہ اسلئے کہ وہ
قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (بقرہ)	کہتے ہیں کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود کے معاملہ ہی کی طرح ہے۔

ل مشرکین عرب نے اپنے خیال میں حلتِ ربا کیلئے بہتر سے بہتر دلیل یہ پیش کی کہ "ربوا" اگر "قدر زائد" کی وجہ سے حرام ہے تو پھر بیع کیوں حلال ہے جبکہ کسی نہ کسی شکل میں نفع (قدر زائد) یہاں بھی موجود ہے، قرآنِ عزیز نے اپنے معجزانہ اسلوب کے ساتھ اس کا رد کرتے ہوئے کہا "احل اللہ البیع وحرم الربوا" یعنی تم دیکھتے ہو کہ تمام معاملات میں بیع (خرید و فروخت) میں کہ جنکو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، جانبین (بائع و مشتری) کے مابین اصول کار فرما ہیں۔ (۱) دونوں جانب سے ارادی رضا و رغبت (۲) باہم تعاون و اشتراک (۳) دونوں کے لئے منفعت کا حصول، اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصول قانون۔ اخلاق اور علم المعیشت کی نگاہ میں صحیح اور درست ہیں اس سے بہتر تعاون و اشتراک باہمی مواساۃ اور حسن سلوک جیسے فضائل کے حامل ہیں۔ جو انسان کی انسانیت کا طغرائے امتیاز ہیں۔ اور "ربوا" میں ان کے برعکس تین اصول جاری ہیں (۱) ایک جانب میں رضا و رغبت اور دوسری جانب میں اضطرار و اکراہ (۲) باہمی تعاون و اشتراک کا فقدان بلکہ کاد و بار

(باقی برصفحہ ۲۷۰)

عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاہدیہ وقال ہم سواء (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خوار، سود دینے والے، سود کی دستاویز لکھنے والے اور گواہی کرنیوالوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ خدا کی پھٹکار میں یہ سب برابر ہیں۔

عن فضالۃ بن عبید صاحب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ قال کل

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو قرض بھی نفع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) ترقی کے لئے دوسرے کے افلاس کا انتظار (۳) ایک کے یقینی مزید نقصان پر دوسرے کے نفع کا حصول

پس اللہ تعالیٰ کہ جس کی صفات کمالیہ "رب العالمین"، "الرحمن الرحیم" ہیں اور جس کی رحمت عام اور ربوبیت تام تمام کائنات انسانی پر محیط ہے وہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی باعقل مخلوق "انسان" باہمی محبت و مواسات اور تعاون و اشتراک کی بجائے خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون چوسنے پر آمادہ ہو جائے اس لئے اس نے "بیع" کو تو "حلال" قرار دیا اور "ربوا" کو حرام بنایا۔

غرض انسان کے وضع کردہ قوانین اور خدا کے فرمودہ احکام میں یہ بیّن فرق ہے کہ عام طور پر وضعی قوانین کے رجحانات پبلک کے رجحانات کے تابع ہوتے ہیں کیونکہ وہ پبلک کے نمائندہ کہلاتے ہیں اور چونکہ ان کی عقل بہرحال محدود ہوتی ہے اس لئے وہ ان دور رس نتائج و ثمرات سے اس وقت تک کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے جب تک تجربہ یا پبلک کا احتجاج اس کی موافقت یا مخالفت نہیں کرتے چنانچہ "ربوا" کے جواز کا مسئلہ بھی اس کی ایک کڑی ہے اس لئے کہ انسان کی حیوانی خواہشات میں سے ایک خواہش طلب زر کی بھی ہے جو مگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان کی یہ خواہش کسی نہایت یا قید و بند کو برداشت نہیں کرتی پس تمام دنیوی حکومتیں اور ان کے واضعین قوانین اپنے اپنے ماحول کے رجحانات کے مطابق ربوا کے جواز کے لئے قوانین بناتے رہتے ہیں اور اگرچہ وہ اس سلسلہ میں کچھ تحدید و تقیید بھی کرتے جاتے ہیں مگر عملاً ربوی معاشرتی نظام بے قید ہو کر افلاس عام اور کساد بازاری پر منتج ہوتا اور ایک مخصوص طبقہ میں دولت کی اجارہ داری قائم کر دیتا ہے۔

اس کے برعکس قانون الٰہی چونکہ انسانی دسترس سے بالاتر خالق کائنات کی جانب سے آتا ہے جو مخلوق کے نفع و ضرر کا حقیقی علیم و خبیر ہے اس لئے وہ حیوانی اوصاف سے پاک اور برتر رہ کر اسی حیوانی خواہش کے خلاف فیصلہ صادر کر کے اور ربوی معاشی نظام کو حرام ٹھیراتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی طرح ان کی بے قید خواہشات کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ حقیقی مصالح عامہ اور فلاح عام پر مبنی ہوتا ہے۔

قرض جر منفعۃ فھو وجہ من وجوہ الربا۔ کھینچتا ہے وہ سود ہی کے اقسام میں سے ہے۔

تجارتی سود | تجارتی سود | قرضی سود کے علاوہ اسلام کے اقتصادی نظام میں صاحب شریعت نے یہ اور اضافہ کیا کہ نصرت قرض و دین میں بلکہ تجارتی کاروبار کی بعض اقسام میں بھی سود (ربوا) پایا جاتا ہے مثلاً اگر سکہ کی بجائے جنس کا جنس کے ساتھ تبادلہ مقصود ہے یا چاندی اور سونے کا ہم جنس تبادلہ مطلوب ہے تو ایسی صورت میں مسطورۂ ذیل ہر دو اصول کی پابندی ضروری ہے ورنہ یہ معاملہ (ربوا) اور سود میں شامل ہو کر حلال سے حرام کی جانب منتقل ہو جائیگا۔

(۱) اگر ہر دو جانب خرید و فروخت کی شے ہم جنس ہے یعنی سونے کا سونے سے چاندی کا چاندی سے، گیہوں، جو، نمک، کشمکش، منقی وغیرہ اشیاء کا ہم جنس شے سے بیع و شراء مطلوب ہے تو کھوٹے اور کھرے، منقوش و غیر منقوش، کم قیمت و بیش قیمت، عمدہ اور ردی کا لحاظ کئے بغیر دونوں جانب ناپ، تول میں مساوات بھی واجب ہے اور نقد خریداری بھی واجب و ضروری، نہ کمی بیشی درست ہے اور نہ ادھار جائز ہے۔

(ب) اگر جانبین میں ہم جنس شے نہیں ہے یعنی سونے کا چاندی سے یا چاندی کا سونے سے گیہوں کا جو سے یا جو کا گیہوں سے (وغیرہ وغیرہ) تبادلہ مقصود ہے تو ایسی حالت میں کمی و بیشی تو درست ہے مگر ادھار جائز نہیں ہے بلکہ واجب ہے کہ عقد بیع کے وقت دونوں جانب سے معاملہ بصورت نقد عمل میں آئے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت ارشاد فرمایا ہے

عن عبادۃ بن الصامت قال قال	حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الذهب	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سونے
بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر	کا تبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں
بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر و	کا گیہوں سے اور جو کا جو سے اور خرما کا خرما سے اور نمک
الملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ	کو نمک سے یکساں، برابر اور دست بدست ہونا چاہیے
یداً بید فاذا اختلفت ھذہ الاصناف	(یعنی ناپ تول میں بھی مساوی ہوں اور ادھار بھی نہ ہو)

فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بیدٍ[۱] (مسلم)

اور اگر ان اقسام کا تبادلہ ہم جنس قسم کے ساتھ نہ ہو تو کمی بیشی کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ کرو لیکن معاملہ ادھار کا نہ ہو بلکہ دست بدست ہونا ضروری ہے۔

مجتہدین امت نے اس حدیث صحیح کو تجارتی کاروبار میں ربوا (سود) سے متعلق "اساس" قرار دیا ہے اور اپنے اجتہاد سے ان وجوہ کی تحقیق و تفتیش کی ہے جن کا وجود اس قسم کے معاملات میں حدیث کی بیان کردہ شرائط کی خلاف ورزی سے ربوا (سود) کا باعث بنتا ہے۔ فقہا اسکو ربوا الفضل سے تعبیر کرتے ہیں[۲] حدیث ربوا ایک اور حقیقت کا بھی اعلان کرتی ہے وہ یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے "معاشی نظام" کو وطنی اور ملکی عصبیت سے بالاتر بین الاقوامی اخوت و مواسات پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وحدت اسلامی کا پیغام حق اس راہ سے بھی بروئے کار آسکے کیونکہ عام طریقہ بیع و شراء میں اگرچہ کوئی شخص چاندی کو چاندی سے اور سونے کو سونے کے عوض نہیں خریدتا لیکن علمائے اقتصادیات کی نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ دور حاضر میں تبادلۂ سکہ جات (ایکسچینج) کا جو سسٹم جاری ہے وہ اسی ربوا کی ایک قسم ہے جس میں تبادلہ کے وقت دو ملکوں کے درمیان چاندی کے یا سونے کے ہم جنس سکوں میں بھی "بٹاون" کے نام سے کمی بیشی کا اصول قائم ہے اور ظاہر ہے کہ "ایکسچینج پالیسی" ایک ایسا فاسد طریق کار ہے جس کے ذریعہ دو ملکوں یا دو قوموں کے درمیان "معاشی دستبرد" کی راہ کھلتی ہے پس اگر اسلام کے اقتصادی نظام میں اسکو جائز رکھا جائے تو گویا یہ خیمہ ہو گا معاشی دستبرد کے جواز کا جو بلاشبہ حقیقی تجارت اور صحیح نفع اندوزی کے قطعاً خلاف ہے۔

اسی طرح دور نہ جائیے قریب ہی سے اس دور جدید پر نظر ڈالئے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ تجارت "علمی نظریوں" پر قائم اور کاروبار "سائنٹفک اصولوں" پر چل رہا ہے اس دور میں بنک سسٹم کا سود، تجارتی سود کہلاتا ہے لیکن کیا بین الاقوامی لیگ (League of Nations) [illegible]

۱؎ یہ حدیث جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے اور اصطلاح حدیث میں مشہور بلکہ تواتر کا درجہ رکھتی ہے۔ ۲؎ ملاحظہ ہوں کتب فقہ و اصول فقہ

کی روئداد اور یورپ و ایشیا کے تجارتی ملکوں کے حالات اس امر کے شاہدِ عادل نہیں ہیں کہ بینک سسٹم کا موجودہ کاروبار ہی بڑی حد تک ان ملکوں کی کساد بازاری اور عام افلاس کا باعث ہے[1] اور یہ سسٹم بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بے پناہ زراندوزی اور بے قید نفع خوری کا بہترین ذریعہ ہیں اور ان کی بدولت غیر محسوس طریقہ پر دولت سمٹ کر محدود طبقہ میں اس طرح پہنچ جاتی ہے کہ عوام کے لئے قوتِ لایموت کے لئے بھی کوئی راہ باقی نہیں رہتی

جمیع انواعِ سود کی حرمت اور ان کے دلائل

ممکن ہے کہ ایک فلسفی دماغ، آفرینشِ خیال کرتے ہوئے یہ شبہ پیش کرے کہ سود ربا کی وہ خاص شکل جو قرض سے متعلق ہو اور مہاجنی سود کہلاتی ہو اس کی تمام جزئیات بلاشبہ اپنے اندر مسطورہ بالا قبائح اور مفاسد رکھتی ہے اسلئے اسلام نے اس کو حرام قرار دیکر اخلاقی اور قانونی ذرائع سے جس طرح اس کا سدِ باب کیا ہے معاشی نظام کی صلاح و خیر کے لئے ازبس ضروری اور کائناتِ انسانی کی اخلاقی اور معاشی فلاح و بہبود کے لئے احسانِ عظیم ہے لیکن تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے معاملات میں اس قسم کے حصول نفع کو جس کی جانب مسطورہ بالا احادیث ممانعت کے ضمن میں اشارہ کر رہی ہے حرام قرار دینا اور ربوا (سود) میں شامل کرنا کس مصلحت پر مبنی ہے جبکہ اس میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد کا فقدان ہے؟

اس غلط فہمی کا جواب یہ ہے کہ سطحی نظر میں اگرچہ تجارتی اصنافِ سود میں مہاجنی سود کی طرح کے مفاسد محسوس نہیں ہوتے لیکن غائر نظر کے بعد یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے کہ نتیجہ اور ثمرہ کے لحاظ سے تجارتی سود میں بھی وہی اساس کام کر رہی ہے جو مہاجنی سود میں کارفرما نظر آتی ہے یعنی ایسے معاشرتی نظام کا وجود جو مذموم سرمایہ داری پیدا کر کے دولت اور سرمایہ کو مخصوص افراد میں محصور کرتا اور احتکار و اکتناز کی راہیں کھول کر عام کساد بازاری کا سبب بنتا ہے

آپ ایسے دو سرمایہ داروں کا تصور کیجئے کہ جن میں سے ایک کے پاس مثلاً ایک سیر سونا

[1] اسلام اور سود از ڈاکٹر انور اقبال ص ۱۴۰

ہو اور دوسرے کے پاس پانچ سیر ہیں اگر ہم جنس شئے میں کمی و بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت دیدی جائے تو زیادہ سونا رکھنے والا قلیل مقدار میں رکھنے والے شخص کو مجبور کریگا کہ وہ اس کے ہاتھ اپنے ایک سیر سونے کو کمی کے ساتھ فروخت کر دے تاکہ وہ چھ سیر کا مالک بنجائے اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی بے قید قوتِ خرید سے اس درجہ پہنچ جائے کہ سونے کی قیمت کے گھٹانے یا بڑھانے کا مدار بنجائے اور اس طرح اپنے حرص و لالچ کے پیش نظر عام کساد بازاری پیدا کر دے اور اگر ایک سیر سونے کا مالک اس کے ہاتھ اپنا سونا کمی کے ساتھ فروخت کرنے سے انکار کر دے تو بڑی مقدار رکھنے والا شخص اس کو شکست دینے اور اس کا سرمایہ زبردستی حاصل کرنے کے لئے اس کے سونے کی قیمت بڑھا کر خرید یگا اور اپنے چند تولوں کا نقصان گوارا کریگا اس کو آہستہ آہستہ یہ حیثیت حاصل ہو جائے کہ بازار میں اس کا کوئی حریف باقی نہ رہے اور وہ تنہا یا اسی درجہ کے چند سرمایہ دار بازار کے نرخ پر قابض ہو جائیں اور ملوکہ سونے اور چاندی کو حسب منشا گرانی کے ساتھ فروخت کر کے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور بنا دیں کہ دولت و سرمایہ سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے اندر محدود ہو جائے خواہ اسکا نتیجہ عام بدحالی ہی کیوں نہ ہو۔

غرض سونا چاندی اور اجناس کو ہم جنس کے ساتھ خرید و فروخت میں اگر کمی بیشی کی اجازت دیدی جائے تو کثیر المقدار سرمایہ دار، قلیل المقدار سرمایہ دار کو مختلف طریقوں سے شکست دے کر ہل من مزید کا طالب رہیگا اور خرید و فروخت کا اصل مقصد "باہمی تعاون کے ساتھ رفع حاجات" کی بجائے دوسروں کو نقصان پہنچا کر زیادہ سے زیادہ "نفع اندوزی" ہو جائیگا اور ظاہر ہے کہ "صالح نظام معاشی" میں اس مقصد کی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ اگر جنس مختلف ہو تو چونکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت جدا جدا ہے اس لئے اس میں کمی اور بیشی دونوں کی گنجائش ہے تاہم اس صورت میں بھی غبنِ فاحش کی اجازت نہ دی جائیگی بلکہ دونوں اجناس کی قدر و قیمت کے توازن کا لحاظ رکھا جائیگا اور جب کوئی شخص اس توازن کے خلاف کمی یا بیشی کو نقصان رساں حد تک لیجانے کی کوشش کریگا تو خلیفہ یا نائب خلیفہ

سدباب کردیگا چنانچہ اس قسم کی مداخلت کا ثبوت خلافتِ راشدہ کے دور میں ثابت ہے۔ موطا امام محمدؒ میں ہے۔

ان عمر بن الخطاب مر علی حاطب	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گذر بازار کی جانب
بن ابی بلتعۃ وھو یبیع زبیبا لہ	ہوا تو وہاں حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ منقی فروخت
بالسوق فقال لہ عمر اما ان تزید	کر رہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یا تو نرخ بڑھاؤ
فی السعر واما ان ترفع من سوقنا	(یعنی ارزاں کرو) ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جانا ہوگا

نیز سونے کو سونے یا چاندی کو چاندی کے ساتھ یا اسی نہج کی دوسری اشیاء کو انکی ہم جنس شئے کے ساتھ خرید وفروخت میں کمی اور بیشی ایک ملک کو دوسرے کی اقتصادی برتری کی محکوم بناتی اور اسی طرح ملکوں، قوموں اور حکومتوں کے مابین نفرت کا بیج بوتی ہے۔

مثلاً ہندوستان اپنے بے پناہ سیم وزر اور خام اجناس کی فراوانی کے باوجود ہندوستانیوں کے لئے محض اس بنا پر افلاس اور معاشی تباہ حالی کا باعث بنا ہوا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اپنے حاکمانہ اقتدار کے بل پر انگلستان کے سکہ کے مقابلہ میں "ایکسچینج پالیسی" کے ماتحت ہندوستانی روپیہ کی قیمت کو صرف چھ آنہ کا باقی رہنے دیا ہے کیونکہ مال کے لینے اور دینے دونوں صورتوں میں سکوں کے درمیان کمی بیشی (بٹاون) کے اصول پر تبادلہ کیا جاتا ہے اور خود ہندوستان کے اندر حیدرآباد اور برٹش انڈیا کے روپیہ میں "حالی" اور "کلدار" کے نام سے دو قسم قائم کر کے بٹاون (ایکسچینج) کا دستور قائم ہے اور بلاشبہ یہ معاشی دستبرد کی واضح مثال ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی رومی سکوں کی قیمت ایرانی سکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی تھی کیونکہ اسلام کے قرنِ اول میں روم وایران کی باہمی آویزش نے روم کو فاتح اور ایران کو مفتوح بنا کر ایران کی ساکھ کو گرا دیا تھا حتی کہ بنی امیہ کے دور میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ روم وایران پر اسلامی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی اسلامی سکوں کے ساتھ ساتھ رومی سکے تو جاری رہے لیکن ایرانی سکوں کو لوگوں نے قطع وبرید کر کے دوسری ضربات میں استعمال کرنا شروع کر دیا

پس اس حقیقت کے روشن ہو جانے کے بعد یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشی نظام اپنے دوسرے شعبوں کی طرح سکہ کے معاملہ میں بھی عالمگیر وحدۃ نظام کا خواہشمند ہے اور اس لئے وہ اس اصول کو پسند کرتا ہے کہ سکہ جات بین الاقوامی ہونے چاہئیں تاکہ تبادلۂ سکہ جات کے ذریعہ معاشی دستبرد رونما نہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتی ہے کہ صاحب شریعت کی نگاہ حکمت طراز میں یہ از بس ضروری ہے کہ نقدین (سونا چاندی) جیسی دھاتیں اشیاء کی خرید و فروخت کا ذریعہ بنی رہیں کیونکہ یہی ان کی تخلیق کا حقیقی مقصد ہے اور مقصود بالذات یعنی مبیع (جس کو دیگر خریدا جائے) نہ بننے پائیں تاکہ ایسا سرمایہ دارانہ معاشری نظام پیدا نہ ہو سکے جس میں دھاتیں "مبیع" اور مقصود بالذات قرار دی جا کر دولت و سرمایہ کو محدود طبقہ کی ملکیت بنا دینے کا باعث ثابت ہوں نیز اجناس میں ہم جنس کی خرید و فروخت پر ناپ تول میں مساوات کی پابندی بھی اس حکمت پر مبنی ہے کہ خرید و فروخت کا حقیقی مقصد جبکہ باہمی تعاون و مواسات کے ساتھ انسان کی مختلف ضروریات کی تکمیل ہی ہے تو بلاشبہ یہ مقصد اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ یا سکہ کے ذریعہ چیز کو خریدا جائے اور یا مختلف اشیاء کے درمیان تبادلہ کی صورت اختیار کی جائے مثلاً ایک شخص کے پاس چار سیر چاول ہیں اور اس کو آٹے کی ضرورت ہے اور دوسرے شخص کے پاس آٹھ سیر آٹا ہے اور اس کو چاول مطلوب ہیں تو یہ دونوں تبادلۂ اجناس کے ساتھ اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں لیکن خرید و فروخت میں ہم جنس اشیاء کا تبادلہ ظاہر ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بیشتر اس غرض سے ہوتا ہے کہ اس تبادلہ کی راہ سے دوسروں کی قوتِ خرید کو اس درجہ کمزور کر دیا جائے کہ اس شے پر صرف ایک شخص یا چند اشخاص کا قبضہ ہو جائے اور پھر وہ اس شے کو من مانی قیمت پر فروخت کر سکیں اور اس طرح احتکارِ ممنوع کی حد سے محدود طبقہ میں دولت و سرمایہ کو مخصوص کر کے عام کساد بازاری پیدا کر دیں۔

پس صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے ربا الفضل کو ممنوع قرار دیکر ایسی صورت

حال پیدا کردی کہ کبھی شخص نقدین اور سیم جنس اشیاء کو بیع نہ بنائے گا کیونکہ اس صورت میں مساوات کے ساتھ خرید و فروخت ایک عبث کام رہ جائیگا

اس دورِ جدید میں جوازِ سود کے لئے بعض اور بھی علمی اصول قائم کئے گئے ہیں جن کو سودی کاروبار کے لئے بنیادِ کار قرار دیا جاتا ہے اس علمی تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ جبکہ سونا، چاندی بشکل سکہ بھی معاشی نقطۂ نظر سے "اصل" میں شمار ہے تو کیا وجہ اسکو حصولِ نفع کا ذریعہ تسلیم نہ کیا جائے خصوصاً جبکہ اس سے حصولِ نفع کے وقت وہی علامات و آثار یا نتائج پیدا ہوتے ہیں جو "اصل" کے "منافعات" میں شمار کئے جاتے ہیں یعنی پیدا آوری اور انتظار کشی" نیز "حقیقتاً سود" نقد کے اس نفع کو کہنا چاہیے جو حاجتمندوں اور غریبوں کی اضطراری حالت سے فائدہ اٹھا کر حاصل کیا جائے اور بے شبہ یہ نفع ربا کہلانے کا مستحق اور ظالمانہ طریقِ کار ہے لیکن نقد کا جو نفع اس طرح وصول کیا جائے کہ خود قرض خواہ بھی ادائے سود کے بعد قرض دہندہ کے مساوی یا زیادہ فائدہ اٹھا لیتا ہے جیسا کہ بنک سسٹم یا کوآپریٹو سوسائیٹیوں کے سسٹم میں نظر آتا ہے تو ایسے نفع سود کو ربا میں شمار نہیں ہونا چاہئے۔

جوازِ سود کی یہ سب سے بہتر تعبیر ہے جو آج کے علمی دور میں کی جاتی ہے مگر غائر نظر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جوازِ سود کی یہ تشریح بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ جو معاشی نظام اپنی بنیاد اس اصول پر قائم کرتا ہے کہ "اصل" اور "محنت" کو ایسے اعتدال کے ساتھ متوازن رکھا جائے کہ کسی حال میں بھی "اصل" اس مذموم سرمایہ کی شکل نہ اختیار کرے جو عام رفاہیت اور افرادِ ملت کی عام متوسط یکسانیت کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے وہ جوازِ سود کی ان نکتہ سنجیوں اور علمی کاوشوں کو کبھی وقعت نہیں دے سکتا۔ اور جبکہ موجودہ دور کے بنک سسٹم اور اس جیسے دوسرے سسٹم کے عملی نقشے بھی سرمایہ داری کے مہلک اثرات و نتائج کو نمایاں خد و خال کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تو اسلام کا معاشی نظام کس طرح ان علمی کاوشوں کی خاطر ان کے ذریعہ حاصل شدہ نفع (سود) کو ربوا سے خارج کر سکتا ہے [1]

[1] جو حضرات اس دور میں مادیت اور لادینیت کے فرنگی سے متاثر ہیں وہ عموماً سود (ربا) کے عدم جواز سے متعلق نافی ہیں ۲۱۸ ایم

اور کیا جوازِ سود کے اس تجوز کی طرح ایک شخص یہ کہنے کا حقدار نہیں ہے کہ جبکہ اصل کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر نقود کے نفع (سود) کو جائز کہا جاسکتا ہے تو محنت کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر قمار کی ان تمام صورتوں کو بھی کیوں جائز نہ قرار دیدیا جائے جو موجودہ دور میں مسلمی اصول پر "لاٹری" "سٹہ" اور دوسرے ناموں سے جاری ہیں کیونکہ قمار کے ان جدید طریقوں میں جائز محنت کی طرح مہذب تجارت کی "عقل و محنت" کو بھی دخل ہے اور جاہلی قمار سے جدا یہ جائز نیز کسی تباہی کا باعث بھی نہیں ہیں لیکن اسلام کے معاشی نظام کی جانب سے اس کا بھی وہی جواب ہے کہ وہ اصل اور محنت دونوں کو تجارت میں بنیادِ کار تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے ایسے عملی نقشہ کو تسلیم نہیں کرتا جو آہستہ آہستہ اعتدال سے گذر کر مہلک سرمایہ داری کے لئے راہ کھولتا ہو۔ کیونکہ اس سے پیدا شدہ خوشحالی مخصوص طبقہ کے لئے ہے عوام کے لئے نہیں ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے معاشی نظام میں ان دونوں صورتوں کے عدمِ جواز کی گذشتہ صفحات

(باقی نوٹ صفحہ ۲۷۷) اس لئے سنگ یا منکر نظر آتے ہیں کہ انھوں نے صرف اسی قدر سننے پر اکتفا کر لیا ہے کہ دورِ جدید کے عقلاء اور علماء معاشیین سود تجارتی سود در ہا) کو نہ صرف جائز بلکہ سماج کی ترقی کے لئے مستحسن سمجھتے ہیں لیکن ان کو یہ کون بتلائے کہ جس مسئلہ کو وہ یقینی طے شدہ سمجھتے ہیں وہ مسئلہ خود وقت کے ماہرینِ علم المعیشت کے درمیان سخت اختلافی ہی بلکہ بیشتر اور اکثر کی رائے یہ ہے کہ سماج کی عام خوش حالی اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتی جب تک شرحِ سود کو گھٹا کر "صفر" نہ کر دیا جائے

اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال کی کتاب "اسلام اور سود" لائقِ مطالعہ ہے وہ ایک جگہ لارڈ کینس مشہور ماہرِ معاشیات کا یہ مقولہ نقل کرتے ہیں چنانچہ لارڈ کینس اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ اشیاء کی پیدائش میں آسانی سے اتنا اضافہ ممکن ہے کہ جس سے کہ اصل کی کارکردگی مختتم صفر ہو جائے تو نظامِ اصل داری کے اکثر نقائص کی تلافی کا یہ بہترین اور مؤثر ترین طریقہ ہوگا۔ ذرا سے غور و فکر سے ہر شخص اس شدید سماجی تغیرات کا نقشہ کھینچ سکتا ہے جو کہ سود کے نابود ہونے کے باعث رونما ہوں گے۔ ہر شخص اس کے باوجود بھی آزاد ہوگا کہ اپنی کمائی کو پس انداز کرے اور اسے مستقبل میں صرف کرے

صفحہ ۵۶

میں بیان کردہ یہ دلیل بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ معاملات میں نقود کی حقیقی حیثیت ثمن کی ہے اور اس کو مبیع (مال خرید و فروخت) بنانا حقیقت کو بدلنا اور منقلب کر دینا ہے اور ایسا کرنا باہمی تعاون کے علاوہ طریقوں کا انسداد اور جائز محنت کا استیصال ہے اور اس طرح زراعت صنعت و حرفت اور تجارت پر ضرب کاری لگتی ہے اور تمدن و حضارت کا فساد لازم آتا ہے

سود اور رباہ جدید فن معیشت کی جانب سے جواز سود کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سود اور ربا" کے درمیان فرق ہے جو سود شرح مروجہ یا شرح قانونی سے زیادہ اور بھاری ہو اس کا نام ربا ([illegible]) ہے اور ایسے سود خوار کو ([illegible]) کہتے ہیں اور سود کی وہ شرح جو مروجہ یا قانونی ہے سود بھی ربا نہیں بلکہ سود یعنی "نفع جائز" ہے اور اسکو آج کی اصطلاح معیشت میں [illegible] کہا جاتا ہے۔

چنانچہ موجودہ سماج کے جدید باطل نظام سے مرعوب مسلمانوں نے بھی قرآنی حقائق سے نا آشنا یا بے پرواہ ہو کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن نے بھی سود کو نہیں "ربا" کو حرام قرار دیا ہے۔

جدید فن معیشت کا یہ بھی ایک سخت مغالطہ اور فریب ہے اسلئے کہ جب جدید علماء معاشیین کے یہاں آج تک یہ طے نہ ہو سکا کہ بھاری سود اور مروجہ قانونی سود کی حدود کیا ہیں تاکہ ربوا اور سود اپنے حقائق کے لحاظ سے باہم ممتاز ہو جائیں اور جیسا کہ علم المعیشت کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے اس مسئلہ میں ان کے درمیان سخت اختلاف ہے کہ کونسی ایسی شرح سود ہے جسکو جائز اور کونسی شرح سود نہ کہا جا سکے کیونکہ جب بھی قانونی یا رواجی طور پر کسی شرحِ سود کو نفع یا فائدہ ([illegible]) کے درجہ میں متعین کیا جاتا ہے تو زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ تجربہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہ شرح بھی "انٹرسٹ" نہیں بلکہ یوزری کی حد میں آگئی ہے اور اس طرح شرحِ سود کا مسئلہ ہمیشہ سے غیر مختتم اور غیر حقیقی بنا بنا رہا ہے اور آج بھی ہے اور اسی بناء پر سماجی نظام میں معاشی تشویش اور بےچینی کا باعث ہوتا رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا کہ شرح سود گھٹ کر "صفر" ہو جائے۔

نیز جب کہ گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا کہ نفسِ سود ربا خواہ کسی شکل میں بھی ہو سماجی

زندگی کے لئے تباہ کن اور معاشی وسائل کے لئے حد درجہ ضرر رساں ہے تو اب اس کو انٹرسٹ
یہ بعد ازیں ربا المعتدل و ربا الفاحش میں تقسیم کرنا اس وقت تک بے سود ہے جب تک
یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ انٹرسٹ اور ربا معتدل میں وہ نقصانات موجود نہیں جو ربا فاحش میں
ہیں، حالانکہ جدید علماء معیشت اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ بینک سسٹم ہو یا مہاجنی سسٹم انکی شرح
سود آہستہ آہستہ تمام نظام سماجی کو تباہ کرنے کا باعث بن رہا ہے اور تاوقتیکہ شرح سود صفر کی حد
تک نہ پہنچ جائے عام کساد بازاری اور عوام کی معاشی تباہ کاری کا کوئی حل نکالنا ناممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادیت کے فروغ، آزاد تعیش اور بے قید زندگی کی خواہش نے مادیین
کے دماغوں میں ایک ایسے سماج اور ایسی سوسائٹی کا تصور پیدا کر دیا ہے جس میں سود کے بغیر تجارت
اور صنعت و حرفت میں عظیم الشان تمدنی ترقی کے امکانات مفقود ہیں اور دنیا کے حصول پر جب
ان کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ انھوں نے اس تصور کو عملی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی نتیجہ
یہ نکلا کہ اگر ایک طرف تجارت اور صنعت و حرفت نے بیش از بیش ترقی کی اور بڑی بڑی
مشینوں کی ایجادات اور سائنس کی اختراعات نے ان کو بام عروج پر پہنچایا تو دوسری جانب
اس کا واضح اثر یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ عوام کی قوتِ خرید گھٹنے لگی اور سرمایہ دار طبقہ کی قوت میں
روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دولت و ثروت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری
میں رہ گئی اور کروڑوں عوام معاشی ہلاکت کا شکار ہو کر رہ گئے اور یہ سب سماج کے اس نقش کی بدولت
ہوا جس میں سود اور ربا کا فرق بیان کر کے موجودہ بینک سسٹم، مہاجنی سسٹم، سودی تمسکات اور
تجارتی لونڈ جیسے معاملات کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کے برعکس اسلام ایک ایسے سماج کا داعی ہے
جس کے اندر معیشت کی اساس بے قید تعیش کی بجائے ضروریات کی جائز تکمیل اور ذہنی آسودگی و خوش
حالی پر قائم ہے اس لئے وہ نہ صرف اعتقادی تصور اور نظریہ کی بلکہ عملی نظام کی حد تک ایسے
سماج کا تجربہ کر چکا ہے جس میں سود کے بغیر ہی تمدنی ترقی زیادہ سے زیادہ بام عروج پر پہنچ سکتی ہے اور
خلافت راشدہ کے مقدس دور کے علاوہ اندلس اور بغداد کی ان خلافتوں کے زمانہ میں اس کا مشاہدہ

ہو چکا ہے جو صحیح اسلامی نظریہ حکومت پر گامزن نہ ہونے کے باوجود "سود" کی حرمت پر عملاً متفق
رہتے ہوئے ہر قسم کی تمدنی اور معاشی ترقیوں میں وقت کی تمام حکومتوں سے برتر ہیں۔

رہا قرآن حکیم اور مسئلہ سود میں "اضعافاً مضاعفۃ" کا مغالطہ تو ابھی بصراحت یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی مطلق سود کی اباحت کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے جس قدر شدید وعید سود خوار کے لئے بیان کرتا ہے کسی گناہ پر اس قدر شدید وعید کا اظہار نہیں کرتا۔ فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ۔

قرآن نے اضعافاً مضاعفۃ (سود در سود) کو اول اس لئے منع کیا کہ زمانۂ جاہلیت میں جو رسم قبیح جاری تھی اس کا انسداد کیا جائے اور بعد میں مطلق سود کی حرمت کا اعلان فرما دیا۔ "احل اللہ البیع وحرم الربوا" اس مقام پر ربا کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا اور اس کی حرمت کو مطلق رکھا گیا ہے لہٰذا قرآن کی نگاہ میں "سود" اور "ربا" کے درمیان مطلقاً کوئی فرق نہیں ہے اور اس کی حرمت کے تحت میں انٹرسٹ ([illegible]) اور یوزری ([illegible]) دونوں داخل ہیں۔

مشہور مصری عالم عبدالرحمن الجزیری اپنی تالیف کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں اسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض لوگوں نے یہ گمان باطل کر لیا ہے کہ سود میں سے صرف "اضعافاً مضاعفۃ" ہی باب حرام میں داخل ہے جیسا کہ آل عمران کی آیت میں مذکور ہے "یا ایہا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ واتقوا اللہ لعلکم تفلحون" یہ گمان صریح غلطی پر مبنی ہے اس لئے کہ آیت کریمہ کا مقصد تو درحقیقت سود خواری سے نفرت دلانا اور سود خوار کی نظر کو اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ تیرا یہ سودی معاملہ جو سود در سود کی شکل میں بڑھتا جا رہا ہے ایک دن مقروض کے کل مال کو مستغرق کر لیگا اور ایک مدت گذرنے اور سود در سود کے مسلسل اضافہ ہوتے رہنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مدیون ہمہ مفلس تنگ دست اور مضطرب ہو کر رہ جائیگا اور یہی سودی معاملہ دنیا میں اس کی بدحالی اور تنگ حالی کا سبب بنیگا اور اس قسم کے معاملہ کا نظام عمرانی پر بہت ہی برا اور مضرت رساں اثر پڑیگا

پس اس آیتِ کریمہ سے کوئی عقلمند اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالےٰ نے تین گنا سود کھانے کو تو حرام کر دیا ہے مگر دوگنا یا ایک گنا کھانے کی اجازت باقی رکھی ہے علاوہ ازیں جب قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ صریح ارشاد موجود ہے "فان تبتم فلکم روس اموالکم" پس اگر تم اس سے توبہ کرو تو تمہاری اصل پونجی تمہارے لئے ہے ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ کوئی عاقل آیت کریمہ کا یہ مفہوم سمجھ سکے کہ مطلق سود کی تو اجازت ہے البتہ سود در سود حرام کر دیا گیا ہے۔[1]

ربح اور ربٰو

قرآن کہتا ہے کہ حکیم مطلق نے ربح (نفع جائز) اور ربا (سود) کے درمیان بہت بڑا فرق رکھا ہے اور وہ یہ کہ ربح میں نفع کا مدار "بیع و شرا" سے متعلق ہے اور ربا میں تاخیرِ مال اور مدت میں اضافہ "نفع" کا باعث بنتا ہے اور جبکہ بیع و شرا میں دونوں جانب سے تعاون کے معاوضہ اور حقیقی رضا کے ساتھ نفع کا وجود ثابت ہوتا ہے تو اس لئے اس قسم کے نفع کو جائز قرار دیا جانا چاہیے "واحل اللّٰہ البیع" اور چونکہ قرضدار کی جانب سے ادائے قرض میں تاخیر اور قرض خواہ کی جانب سے تاخیر و اضافۂ مدت پر نفع کا حصول طرفین کی رضا اور باہمی تعاون سے نہیں بلکہ قرضدار کے اضطرار اور قرض خواہ کے بغیر عوض نفع اندوزی پر مبنی ہے اس لئے اسکو بلاشبہ حرام ہونا چاہیے "وحرم الربوا"

غرض ربح اور ربا کو ایک سمجھنا یا "ربا" اور "سود" کے درمیان فرق قائم کرنا قرآن کی نصوص قطعیہ کے خلاف ہے اور اسلام کے صالح معاشی نظام کی نگاہ میں جدید باطل نظام معاشی کی یہ موشگافی کہ انٹرسٹ "ربا" نہیں ہے بلکہ صرف یوزری ہی "ربا" ہے باطل اور فریب ہے اس لئے کہ مذموم سرمایہ داری کے فروغ میں یہ دونوں یکساں ممد و معاون ہیں۔

علماء اسلام اور حرمتِ سود کے دلائل و حِکَم

علماء اسلام نے عام طور سے مسئلہ سود (ربوا) پر قانونی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے جو فقہ اصول فقہ اور کتب تفسیر میں مذکور ہیں لیکن محققین نے اس کے معاشی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کی

حرمت کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ "حرمتِ ربوٰا" کے نظریہ کی قدر و قیمت اس جدید معاشری نظام کی ہمہ گیری کے باوجود صرف دفاعی دلائل [illegible] پر مبنی نہیں رہ جاتی بلکہ معاشی نقطۂ نظر سے "جوازِ سود" کے نظریہ پر مجوزین کو چیلنج کرتی ہیں کہ وہ پہلے یہ ثابت کریں کہ سود حقیقۃً معاشی اور عقلی نقطۂ نظر سے تباہ کن نہیں بلکہ معاشی اور معاشرتی نظام کی ترقی کا باعث ہے۔

دنیائے اسلام کے مشہور فلسفی شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ) حرمتِ قمار و سود کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جوا حرام اور باطل چیز ہے اس لئے کہ درحقیقت وہ لوگوں کے مال کو زبردستی لینا ہے اور اس کی تہ میں جہل، حرص، امید باطل اور فریب اور دھوکا کارفرما ہوتے ہیں اور اس میں امداد باہمی اور تمدن کا ادنیٰ سے ادنیٰ بھی دخل نہیں ہوتا۔

دیکھئے، جوئے میں اگر شکست خوردہ اپنے حریف کے مقابلہ میں خاموش رہتا ہے تو غیظ و غضب اور حسرت و ملامت کے ساتھ خاموش رہتا ہے اور اگر ضبط نہیں کر سکتا تو جنگ و پیکار اور قتل و خونریزی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کامیاب حریف اس کی حرماں نصیبی سے لذت محسوس کرتا اور اس کی تباہی، بربادی اور ہلاکت پر مسرت و خوشی کا اظہار کرتا ہے اس کی حرص و آز بڑھ جاتی ہے اور وہ ہر وقت اس جنون میں سرگرداں رہتا ہے جوئے کی عادت، مال کی تباہی اور فسادات کی ترقی کا باعث ہوتی ہے اور سب سے زیادہ مضرت یہ ہے کہ اس کی بدولت جو صحیح اقتصادی سہارے ہیں وہ بیکار ہو جاتے ہیں اور جس امداد و تعاون پر تمدن کی بنیاد قائم ہے وہ معطل ہو جاتے ہیں، وغیرہ کا مشاہدہ اس کا خود شاہد عدل ہے اسی طرح سود جو لیے قرض پر روپیہ اپنے کا نام ہے جس پر نفع کے نام سے زیادتی وصول کی جاتی ہے باطل اور حرام ہے اور سراسر ظلم ہے اس لئے کہ اس قسم کے قرض لینے والے عام طریقہ سے مفلس اور مضطر ہوتے ہیں وہ بیشتر مدتِ معینہ پر رقم ادا کرنے کو تاہ رہتے ہیں اور یہ سود در سود کے نام سے بڑھتا رہتا ہے اور کسی حال میں اس سے

نجات نہیں ملتی رہتا تا آنکہ سب کچھ دیکر برباد ہو جاتا ہے یہ لین دین سخت جھگڑوں کا باعث اور
عظیم الشان منافستوں کا سبب بنتا ہے اور جس قوم یا ملک میں یہ بے محنت روپیہ حاصل
کرنیکا رسم و رواج جڑ پکڑ جاتا ہے وہاں عوام کے لئے صنعت و حرفت زراعت و تجارت
کی صحیح راہیں بند ہو جاتی ہیں جو ذرائع آمدنی کے لئے فطری اصول ہیں۔

معاملات میں اس سے زیادہ باریک اور پیچیدہ، دوسرا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جسمیں
ظاہری نفع کی صورت میں حقیقی تباہی و بربادی مضمر ہو۔ دراصل یہ دونوں معاملات خاص قسم
کے نشے ہیں جو خدا کے بتلائے ہوئے قانون اور ذرائع آمدنی کے صحیح طریقوں کے استعمال کے
خلاف ہر انسان کو آمادہ کرتے ہیں اور تمام نشوں سے زیادہ فسادات عداوتِ باہمی انسان
کشی کے باعث بنتے ہیں اسلئے اسلام نے ان دونوں کو ظلم اور باطل قرار دیا۔

اور چونکہ سود کی دو قسمیں ہیں ایک بیان کردہ صورت جو حقیقی ربا کہلاتی ہے اسلئے اسکو
بغیر قید و شرط کے حرام کر دیا اور دوسری ربا "فضل" کہلاتی ہے جیسے کہ سونے اور چاندی کا کمی بیشی
سے لین دین کرنا وغیرہ اس لئے ان اشیاء کے خرید و فروخت کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے تمام
صورتوں کو حرام بتایا جن کا نتیجہ سودی لین دین کے موافق نکلتا تھا تاکہ اس غیر فطری کاروبار کا پوری
طرح انسداد ہو جائے۔[1]

بہرحال یہ تمام کاروبار مختلف شکلوں اور صورتوں میں "احتکار" ہی کی متعدد اقسام ہیں
اور یہی احتکار جب قوموں میں ترقی کر جاتا ہے اور عام کاروبار پر مسلط ہو کر اقتصادی نظام پر چھا جاتا ہے
تو کنز کی مذموم شکل اختیار کر لیتا ہے اور دنیا کی فرعون بنکر خدا کی عام مخلوق کو زندہ درگور کر دیتا ہے
اور حجۃ الاسلام امام غزالی نے احیاء العلوم میں جو کچھ اس سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے اسکا
مفہوم اور خلاصہ بحث یہ ہے

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اس نے سونا چاندی جیسی دھاتیں
پیدا کر کے درہم و دینار (سکوں) کو وجود بخشا۔ اگر ان دھاتوں کی حقیقت پر غور کیجئے تو تجربات تاجروں

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۷ (مصر)

ہیں جو کسی وجہ سے انسانی معاشرہ کی ضروریات و حاجات کے لئے بیکار ہیں اور اگر ایک شخص
پر توجہ دیجئے تو ان پر دنیا کے معاشی نظام کے قیام کا مدار ہے کیونکہ ہر شخص اضطراری طور پر ان کا
محتاج نظر آتا ہے اس لئے کہ ہر ایک انسان اپنے طعام، لباس اور دوسری ضروریات کیلئے بہت
سی اشیاء کی حقیقتوں (گیہوں، چاول، گھوڑا، بیل وغیرہ) کا محتاج ہے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ انسانی
معاشرہ میں ہر ایک کے پاس ضرورت کی ہر شے موجود نہیں ہے مثلاً اس کے پاس زعفران کے
گٹھے موجود ہیں مگر اس کی ضروریات اس سے غیر متعلق ہیں اور وہ سواری کے لئے اونٹ کا
محتاج ہے جو اس کے پاس نہیں ہے اسی طرح اس کے برعکس ایک شخص زعفران کا محتاج ہے
جس سے وہ محروم ہے مگر اونٹ کا مالک ہے جس کی اس کو قطعاً حاجت نہیں تو معاشی نظام
کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں آپس میں تبادلہ کر کے اپنی اپنی ضروریات کو پورا کر لیں لیکن تبادلے کے وقت
عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جب کہ یہ دونوں اشیاء غیر متجانس اور مختلف ہیں تو تبادلہ کی باہمی مقدار
کا تعین ازبس ضروری ہے کہ اونٹ کی خریداری کے لئے کس مقدار میں زعفران ادا کرنی چاہئے
یا کس مقدار کے مقابلہ میں اونٹ کو فروخت کیا جائے باہم تناسب نہ رکھنے والی اشیاء کی خرید و
فروخت کا یہ سلسلہ ہر لمحہ اسی کا طالب ہے کہ تعینِ مقدار اور صورتِ ادا کے لئے ایسی چیز کا ہونا
ازبس ضروری ہے جو دو متفاوت اشیاء کے درمیان ترازو اور کانٹے کا کام دیتے ہوئے یہ ثابت
کر سکے کہ فلاں شے اس صورت سے یا اس متعین مقدار سے دوسری شے کے مساوی ہو سکتی ہے
ورنہ تو معاملاتِ خرید و فروخت ناممکن ہو جائیں گے اور بنی نوعِ انسان کا معاشی نظام درہم برہم
ہو کر رہ جائیگا تب قدرتِ حق نے مخلوق کو اپنی اس پروردگاری کی جانب راہنمائی فرمائی کہ
ان حجریات کو جو اپنی حقیقت کے پیشِ نظر بے کار نظر آتی تھی اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ انسان کے
معاشی نظام کی درستکاری کے لئے متفاوت اور مختلف النوع اشیاء کے درمیان تبادلہ کے
وقت باہمی مراتب، تعینِ مقدار اور مساوی و غیر مساوی کا فرق ظاہر کریں اور بیع و شراء میں ترازو کے
عدل کا کام دیں تو اب درہم و دینار (روپیہ، اشرفی) کے ذریعہ ہم بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ

اور مثلاً سو روپیہ کا ہے اور اس کے مقابلہ میں زعفران کی یہ مقدار سو روپیہ کی قیمت کو پہنچیگی اور
اس طرح دونوں کے درمیان بآسانی تبادلہ ممکن ہو سکے گا۔ اب بائع اور مشتری مختار ہیں کہ نقدین
سونے چاندی کے سکوں کے ذریعہ جدا جدا دونوں اشیاء کے درمیان معاملہ کرلیں یا نقدین کی
"ترازوئے عدل" کے مطابق اشیاء کا اشیاء کے ساتھ تبادلہ کریں۔

اور ظاہر ہے کہ اشیاء کے درمیان تبادلہ کا صحیح توازن ایسی شے کے ساتھ ہی ہونا ممکن ہے جو
اپنی حقیقت کے لحاظ سے لائقِ احتیاج نہ ہو اور اس کی ذات ضروریات و حاجاتِ انسانی میں
براہ راست کام نہ دیتی ہو بلکہ وہ ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہو ورنہ تو یہ دشواری
پیش آئیگی کہ جب ایک شخص سونا چاندی (سکوں) کی حقیقت کا محتاج ہے اور مثلاً دوسرا آدمی
اس کا محتاج نہیں بلکہ لباس و طعام میں سے کسی شے کا محتاج ہے تو اس صورت میں یہ پہلا شخص
(نقدین) سونے چاندی کی اہمیت کو بڑھائیگا اور دوسرا اسکی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کریگا
اور اس طرح کوئی شے ایسی باقی نہیں رہیگی جو متفاوت اشیاء کے درمیان صحیح توازن کو قائم رکھ سکے
اور ترازوئے عدل بن سکے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ نظامِ معاشرت غیر منظم ہو کر رہجائیگا پس اس حقیقتِ
حال کے پیش نظر کہ سونا چاندی خود مقصود بالذات نہیں بلکہ معاشی اغراض و مقاصد کے لئے ذریعہ
اور آلہ ہیں عقل و فطرت اور نظامِ معاشی کا تقاضہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی تخلیق اس لئے فرمائی ہے
کہ یہ لوگوں کے ہاتھوں میں (بشکل سکہ) چلتے پھرتے رہیں اور متفاوت اشیاء کے باہمی تبادلہ میں
"ترازوئے عدل" کا کام دیں اور خرید و فروخت میں کسی وقت بھی مقصود بالذات نہ بن سکیں۔

سونے چاندی کی تخلیق کے اس مسئلہ کو دوسری تعبیر کے ساتھ یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان جواہرات
کو دنیا کے معاشی نظام کے استحکام کے لئے مقصود بالذات نہیں بلکہ معاملاتِ خرید و فروخت میں
"ذریعہ" اور "وسیلہ" بنایا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ دھاتیں اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہیں کہ جس شخص کے
پاس درہم و دینار اور روپیہ پائی موجود ہیں اس کے پاس گویا ضرورت کی ہر شے موجود ہے
اور جس نسبت سے ان کا وجود کسی جگہ ہے اسی نسبت سے وہ کائنات کی معاشی ضروریات

کی حامل ہیں لیکن اس کے برعکس دنیا کی بہتر سے بہتر شے بھی اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے پاس بالقوۃ ہر ایک شے موجود ہے وجہ یہ ہے کہ یہ حجریات (دھاتیں) اگر سکہ کی شکل میں ہوں یا اپنی سادہ حقیقت پر رہیں اور کسی خاص شکل و صورت مثلاً زیور، برتن، میں تبدیل نہ ہو گئی ہوں تو ان کی نسبت تمام اشیاء کی جانب مساوی رہیگی مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک روپیہ ہو تو متبادل شکل میں گویا اس کے پاس ہر ایک وہ شے موجود ہے جو اس تعداد کے مساوی ہو لیکن اسکے علاوہ دوسری کسی شے میں یہ قوت موجود نہیں ہے مثلاً ایک گز کپڑا "ایک گز کپڑا" ہی رہیگا۔ ایک سیر شکر یا دس سیر گیہوں یا ایک سیر گھی کی شکل اس وقت تک اختیار نہیں کرسکتا جب تک یہی سونا چاندی اس باہمی تبادلہ کے لئے "میزانِ عدل" بنکر فیصلہ نہ کریں۔

تو اب ظاہر ہے کہ ایسی شے جو منفعتِ عامہ کے لئے اس قدر ضروری اور مختلف و متفاوت اشیاء کی جانب مساوی نسبت رکھتی ہو از بس ضروری ہے کہ وہ نہ خود مقصود بالذات ہو اور نہ دوسری اشیاء کی طرح خاص شکل و صورت (زیور، برتن وغیرہ) میں محدود ہو تاکہ کل اشیاء کے درمیان "وسیلہ اور ذریعہ" بن سکے جیسا کہ آئینہ کہ اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں مگر ہر ایک رنگ کو ظاہر کر دیتا ہے یا جیسا کہ حرف اپنی حقیقت میں کوئی معنی نہیں رکھتا مگر تمام معانی کے اظہار کے لئے واحد ذریعہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دھاتوں کی تخلیق اسی لئے فرمائی ہے کہ بیع و شرا میں مقصود بالذات نہ بنائی جائیں بلکہ ذریعۂ خرید و فروخت (ثمن) قرار دیجائیں اور اسی لئے ان کو "کنز" نہ بنایا جائے بلکہ ہاتھوں میں دائر سائر رکھا جائے تاکہ معاشی نظام میں اختلال واقع نہ ہو۔

دراہم و دنانیر (یعنی سونا چاندی) کی تخلیق اس لئے نہیں ہوئی کہ یہ حجریات انسان کی معاشی ضروریات میں مقصود بالذات ہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور یہ کہ یہ اسی وقت وسیلہ ہو سکتی ہیں جبکہ کنز اور خزانہ نہ بنائی جائیں بلکہ لوگوں کے ہاتھوں میں جاری ساری رہیں تاکہ وہ اشیاء کے مبادلہ میں "میزانِ عدل" بن سکیں یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے جس کو چشم بصیرت ہر ایک لحہ صفحۂ وجود پر خطِ الٰہی کی ان سطور میں پڑھتی رہتی ہے جن میں نہ حرف ہے اور نہ آواز اور جو آنکھیں اس تحریر

کے اور اگر کسے عاجز ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرآن حکیم میں اس کو بخوبی واضح فرمادیا ہے چنانچہ

ارشاد مبارک ہے۔

الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ہ — جو لوگ خزانہ کرتے ہیں سونے اور چاندی کو اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس ان کو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

اور اسی حقیقت کے پیش نظر سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار پایا اس لئے کہ برتن کی جو غرض ہے یعنی اشیاء کو محفوظ رکھنا وہ مٹی، لکڑی، بلور، پیتل، تانبا، لوہا جیسی چیزوں کے ظروف سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن یہ اشیاء، چاندی سونے کی طرح سادہ اشیاء میں براہ راست "میزان عدل" نہیں بن سکیں لہٰذا نقدین (سونا چاندی) کی تخلیق کے مقصد کو باطل کر کے سونے چاندی کے ظروف استعمال کرنے والا بلاشبہ حکمت الٰہیہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے پس جو شخص اس حقیقت پر نظر رکھتا ہے وہ بخوبی اس حدیث کے مضمون کی حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

من شرب فی آنیۃ من ذھب او فضۃ فکانما یجرجر فی بطنہ نار جھنم (متفق علیہ) — جس شخص نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا کھایا تو گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔

پس واضح رہے کہ جو شخص بھی سونے، چاندی (روپیہ اشرفی درہم و دنانیر) میں "ربوا" کا معاملہ کرتا ہے یعنی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کی خلاف ورزی کا مرتکب اور معاشی نظام کے اختلال کا باعث ہی بنتا ہے اور ان حجریات کی تخلیق میں فطرت الٰہی نے جو قانون وضع کر دیا ہے اس کو توڑ کر ظلم اور کفران نعمت کا باعث ہوتا ہے

کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اگر حقیقت حال یہ ہے تو اسلام نے سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے کے ساتھ کمی بیشی سے اور ہر جنس نقد کو مساوی تعداد کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سونا چاندی دو مختلف جنسیں ہیں اور مقدار قیمت کے لحاظ سے بھی دونوں

۱؎ احیاء العلوم میں اس کو حدیث نہیں کہا گیا۔ مگر بخاری اور مسلم کی اس حدیث کو شرح اتحاف میں متفق علیہ کہا ہے۔

میں نمایاں فرق ہے تو ظاہر ہے کہ مطلوبہ اشیاء کی خرید و فروخت میں ان کے ذریعہ اور وسیلہ بننے میں
بھی ضرور تفاوت ہوگا مثلاً سونے کے مقابلہ میں چاندی بکثرت ذریعہ بنتی رہتی ہے کیونکہ اس
سے مطلوبہ شے کم سے کم مقدار میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے پس اگر انکے مابین کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ
کی اجازت نہ ہوتی تو بسا اوقات ان کے وسیلہ اور ذریعہ بننے میں دشواری پیش آجایا کرتی اور لوگوں
کو معاشی زندگی میں یُسر اور آسانی کی جگہ عُسر اور دشواری کا منہ دیکھنا پڑتا مثلاً اگر کسی کے پاس فقط سونا ہے
اور اسکو معمولی اشیاء خرید کرنی ہیں جو سونے کے دینار یا اشرفی کی قیمت سے دور کی بھی نسبت نہیں
رکھتیں تو اس کے لئے خریداری کی صورت کیا ہوتی پس سونے کا چاندی کے ساتھ اور ایک دینار کا
چند درہم اور ایک اشرفی کا چند روپوں کے ساتھ اگر تبادلہ جائز نہ ہوتا تو اس کو مطلوبہ شے کی خریداری
میں سخت دشواری پیش آجاتی

نیز ایک درہم کا ایک درہم کے ساتھ اور ایک دینار یا اشرفی کا ایک دینار یا اشرفی کے ساتھ
تبادلہ اس لئے جائز قرار پایا کہ اس عمل سے معاشی نظام پر مطلق کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ اگر یہ
دونوں یکساں حیثیت میں ہیں اور کچھ کھرے کھوٹے کا فرق نہیں ہے تو تبادلہ ایک عبث حرکت
ہوگی گویا ایسا ہوگا کہ ایک شخص نے ایک درہم یا ایک روپیہ زمین پر رکھ دیا اور پھر ایک منٹ کے
بعد اس کو زمین سے اٹھا لیا اور ظاہر ہے کہ کوئی عاقل ایسا نہیں کریگا اور اگر باہم کھرے اور کھوٹے
کا فرق ہے تو مساوات کی صورت میں تو کھرے درہم کا مالک فروخت کرنے پر راضی نہ ہوگا کیونکہ اس
کا کھلا نقصان ہے اور عدم مساوات کی صورت میں اسلام کا نظام معاشی اجازت نہیں دیگا
کیونکہ ایسی صورت میں ان حجریات کی تخلیق کا جو مقصود ہے وہ فوت ہو جاتا ہے اور جو حقیقتاً اشیاء
مقصودہ مطلوبہ کے حصول میں ذریعہ اور وسیلہ بننے کے لئے مخلوق ہوئی ہے وہ مقصود بالذات بنکر معاشی
نظام کے نظم میں اختلال کا باعث اور حکمتِ الٰہیہ کے خلاف کا سبب بنجاتی ہے جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہو چکا ہے
اور یہی صورتِ حال ہے اجناس میں ہم جنس کے باہم تبادلہ کی اور اس لئے ان میں بھی سطورِ
بالا کا حکم عدم جواز ہی نافذ ہوگا۔

اور اگر سونا چاندی کا ہم جنس تبادلہ ادھار کی شکل میں بشرط مساوات ہو تو (معاشی وجوہ کے علاوہ) اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ممنوع ہے کیونکہ حقیقت میں یہ تبادلہ اور خرید و فروخت کا نہیں بلکہ قرض کا معاملہ ہے اور قرض کی بنیاد بغیر معاوضہ حاجت مند کی حاجت پورا کر دینے پر ہے جو سر تا سر اخلاقی مسئلہ ہے اور موجبِ اجر و ثواب ہے۔ پس جو شخص اس کو اخلاقی وصف سے نکال کر معاوضہ اور مبادلہ کی شکل دیتا ہے در اصل وہ اخلاق کے ایک اہم مسئلہ کی تخریب کا درپے ہے جو ہر مذہب کی نگاہ میں سخت معیوب ہے اسلئے اس اخلاقی مسئلہ کو قانونی مسئلہ بنانا ضروری سمجھا گیا اور عدمِ جواز کا حکم دیا گیا اور اجناس میں اسی طرح کا معاملہ اس لئے بھی ممنوع ہے کہ جو شخص اس قسم کا کاروبار کرتا ہے وہ جب ہی کر سکتا ہے کہ اس کے پاس غلہ یا دوسری کوئی جنس وافر مقدار میں موجود ہو اور وہ اس سے مستغنی ہو تو ایسی صورت میں وہ "احتکار" کا مرتکب ہو یعنی جنسِ مذکور کو جو عام حاجات و ضروریات کے لئے ہے جمع اور خزانہ کر کے یہ چاہتا ہے کہ اس جنس کے نرخ (ارزانی و گرانی) کا معاملہ بازار سے قطع ہو کر اسکے ہاتھ میں آ جائے اور اس طرح گویا ان اشیاء کی مقصدِ تخلیق کی خلاف ورزی کرتا ہے چنانچہ اسی بناء پر شریعتِ اسلامیہ میں محتکر (ذخیرہ اندوز) پر لعنت وارد ہوئی اور اس کے حق میں شدید قسم کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں[1]

اور امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں:-

علمائے اسلام نے ربا کی حرمت پر متعدد دلائل بیان فرمائے ہیں

(۱) جو شخص ایک درہم (یا ایک روپیہ) کو دو درہم (یا دو روپے) کے عوض میں فروخت کرتا ہے نقد کا معاملہ ہو یا ادھار کا تو اس کو ایک درہم (ایک روپیہ) مفت ہاتھ آتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کی جانب سے کوئی عوض موجود نہیں ہے حالانکہ خرید و فروخت میں جانبین سے معاوضہ و مبادلہ ضروری شے ہے لہٰذا پس جو درہم یا روپیہ بغیر عوض اس نے حاصل کیا اس میں اس کی جانب سے نہ مالِ متقوم (اصل) کا کوئی دخل ہے اور نہ محنت کا۔ اور چونکہ انسان کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لئے "مال" ازبس ضروری شے ہے اسلئے اس کی حفاظت و عزت انسان کے خون (جان) کی برابر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے حرمۃ مال الانسان کحرمۃ دمہ "پس جو شخص دوسرے

[1] احیاء العلوم ج ۲ ص ۷۹، ۸۰ و اتحاف السادۃ المتقین بیدی ج ۹ ص ۶۸، ۶۳

کے مال کو بغیر عوض کے لیتا ہے وہ بلاشبہ سُحت اور ظلم ہے اور اس لئے ایسا معاملہ قطعاً حرام ہے اور اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ درہم زائد اس لئے زائد نہیں ہے کہ بائع یا قرض دینے والے نے جو درہم مشتری یا قرضدار کو ایک مدت کے لئے دیا ہے اگر اس مدت میں وہ اسکے اپنے پاس رہتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کر سکتا۔ اب جبکہ اس مدت میں اس کے پاس نہ رہا تو یہ "درہم زائد" اس کا عوض ہو کر راس المال "اصل" قرضدار کے پاس ایک مدت تک مقید رہا اور قرضخواہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ اگر اس کے پاس رہتا تو تجارت کے ذریعہ اس سے فائدہ اٹھاتا اب جبکہ اس نے قرضدار کو دیدیا تو یہ اس درہم سے تجارت کے ذریعہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کو اس قدر نفع ہو کر زائد درہم اس میں سے ادا کر دینے کے قابل ہو جائے لہٰذا اسکو مقدرِ زائد کہنا صحیح نہیں بلکہ یہ بھی درحقیقت عوض اور "اصل" ہی ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو درہم (اصل) بائع نے مشتری کو یا قرضدار نے قرضخواہ کو دیا ہے وہ اگر اس کے اپنے پاس رہتا تو یہ یقینی نہیں تھا کہ اس سے ضرور نفع حاصل ہوتا بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ تجارت میں نقصان ہو کر اس اصل کو بھی کھو بیٹھتا لیکن دو درہم کے مقابلہ قرض دینے یا فروخت کرنے کی شکل میں ایک درہم کا زاید اور مفت ہاتھ آجانا قطعی اور یقینی امر ہے پس امرِ موہوم کے مقابلہ میں یقینی نفع کی اجازت دیدینا معاشی نقطۂ نظر سے ایک جانب کو قصداً نقصان پہنچانا ہے اسلئے حرام ہے۔

(۲) یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ معاشی نظام کی بنیادیں تجارت، صنعت و حرفت، زراعت جیسے ستونوں پر قائم ہیں اور انہی کی بدولت کسی ملک میں رفاہیت کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں پس اگر معاشی نظام میں ایسے معاملہ (ربوی) کی اجازت دیدی جائے جس میں کسب معاش کے ان حقیقی ذرائع کی بجائے بے محنت ایک کے دو اور دو سے بھی زیادہ ہو سکیں تو اس ملک میں ایک مستقل طبقہ ایسا پیدا ہو جائیگا جو ان تمام صحیح اور حقیقی ذرائع کو چھوڑ کر اسی کو ذریعہ معاش بنا لیگا اور اسطرح ہمنوع عوام کو نقصان پہنچا کر معاشی نظام کے اختلال کا باعث بنیگا۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس طرح دولت پر ایک مخصوص طبقہ کا اجارہ بڑھ جاویگا اور انجام کار نظام کساد بازاری پیدا ہو جائیگی۔

(۲) عام طور پر ایک درہم لیکر دو درہم دینے کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اضطراری حالت میں ہو اور معاشی حاجت و ضرورت کے لئے نقدین کا محتاج ہو اور وہی شخص اس کاروبار کو چلا سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بصورت اصل (راس المال) موجود ہو یا یوں کہیے کہ قرض لینے والا اکثر غریب فقیر اور مضطر ہوگا جو بوجہ مجبوری اپنی حاجت و ضرورت میں ایک کے دو دینے پر آمادہ ہو جائیگا اور قرض دینے والا غنی اور سرمایہ دار ہوگا۔ پس اگر اس معاملۂ ربویہ کو جائز رکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صاحبِ ضرورت اور زیادہ فقیر اور محتاج ہوتا چلا جائے اور غنی و صاحبِ دولت آہستہ آہستہ دولت و ثروت پر قابض ہو جائے اور ظاہر ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد رحمت عام پر قائم ہو وہ کس طرح ایسے معاملہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

(۴) ربا (سود) کو اس لئے حرام کیا گیا کہ وہ باہمی ہمدردی اور حسن سلوک کا خاتمہ کر تا ہے اسلئے کہ بسا اوقات انسان اپنی ضرورت و حاجت میں قرض پر مجبور ہوتا ہے اس وقت اخلاق کا تقاضہ ہے کہ صاحبِ دولت صاحبِ حاجت کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور بغیر کسی معاوضہ کے قرض دے پس اگر کسی معاشی نظام میں ربا کی اجازت ہو تو پھر کوئی شخص بھی آسانی کے ساتھ قرض بغیر معاوضہ پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اس طرح مواساۃ و احسان کا دروازہ بند ہو جاتا ہے[1]

اس پر یہ اضافہ کر لیجیے کہ قرض بلا معاوضہ صرف اخلاقی مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ معاشی مسئلہ بھی ہے اس لئے علماء معاشین کے نزدیک انسانی معاشرت میں جائز ضروریات کے لئے خواہ وہ حکومت کے سلسلہ کی ہوں یا انفرادی اور شخصی سلسلہ کی، قرض کا معاملہ ناگزیر ہے پس اگر قابلِ اطمینان ضمانت کے ساتھ قرض کا معاملہ ہو تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں:۔

(۱) قرض اس امید پر دیا جائے کہ یہ قدرِ زائد کے حصول کا ذریعہ ہے (۲) اس لئے دیا جائے کہ قدرت سے فاضل دولت، حاجت مند کی حاجت کو اس طرح پورا کر دے کہ "اصل" (راس المال) کسی حال میں ضائع نہ ہونے پائے۔

تو جس معاشی نظام میں پہلی صورت جائز ہوگی بلاشبہ اس میں قرض کا مقصد فوت ہو کر ایک ایسا بیوپار بن جائے گا جس کے نتیجہ اور ثمرہ میں دولت مند کی دولت کا اضافہ قرض خواہ کے نقصان

[1] تفسیر کبیر ج۲ ص ۳۵۲، ۳۵۳

کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور اس طرح انسانی معاشرت میں فاقہ مست محتاجوں کی کثرت دولت کو سمیٹ کر دولت مندوں کے ایک خاص طبقہ کے اندر محدود کر دیگی اور عام کساد بازاری کا باعث ہوگی لہٰذا "صالح معاشی نظام" میں قرض کا معاملہ دوسرے اصول پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اور حافظ ابن قیمؒ اعلام الموقعین میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ربا" کی دو قسمیں ہیں ایک جلی (ظاہر) اور دوسری خفی (مستور) جلی کو اس لئے حرام کیا گیا کہ اس کی حقیقت میں ضرر عظیم اور مفسدہ شدید موجود ہے اور خفی کو اس لئے حرام کیا گیا کہ وہ ربا جلی کے لئے وسیلہ اور ذریعہ بنتا ہے لہٰذا ربا جلی کی حرمت مقصود بالذات ہے اور ربا خفی کی حرمت ذریعہ اور وسیلہ کے سدِ باب کی بناء پر ہے۔

"ربا جلی" رباء نسیہ (قرض و ادھار پر سود کا معاملہ) کا نام ہے اور یہ وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں بھی رائج تھا مثلاً وہ کسی حاجت مند کو قرض دیتے اور جب وہ مدت موعودہ پر ادا نہ کرتا تو شرط یہ ہوتی کہ مدت کا اضافہ کرتے جاتے کہ اس قدر زائد دینا ہوگا اور اس طرح مدت میں اضافہ کے ساتھ زیادت مال (سود) کا اضافہ کرتے جاتے حتیٰ کہ ایک سو کی رقم ہزار ہا ہزار تک پہنچ جاتی اور اس قسم کا معاملہ وہی لوگ قبول کرتے تھے جو محتاج، مفلس اور نادار ہوتے اور قرضہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر رہتے تھے، وہ جب یہ دیکھتے تھے کہ قرضخواہ قرض کی رقم پر اضافہ (سود) کی وجہ سے ادائے قرض میں مہلت دیدیتا ہے تو تقاضا کی شدت اور عدم ادا کی شکل میں (دیوانی) قید و بند کی مصیبت سے گھبرا کر اور مضطر ہو کر جبراً اس اضافہ کو برداشت کرتے جاتے تھے اور وقت گذرتا چلا جاتا تھا حتیٰ کہ نوبت آجاتی کہ تاخیر کی بدولت اضافہ مال کا نقصان شدید سے شدید تر ہو جاتا۔ اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا اور قرض کی رقم پر سود بڑھتے بڑھتے اسکی تمام موجودات پر حاوی ہو جاتا اور اسکی تمام مملوکہ اشیاء قرض میں مستغرق ہو کر رہ جاتیں پس ربا کے اس معاملہ نے یہ شکل پیدا کر دی کہ مفلس قرضدار پر رقم کا جو اضافہ ہوتا رہا اسکے عوض میں اس کو کوئی مالی نفع حاصل نہیں ہوا اور قرض خواہ کو قدر زائد وہ اضافہ (سود) دوسرے کو بغیر نفع پہنچائے

ادھوعوض دیئے حاصل ہوتا رہا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے بھائی کا مال باطل طریقہ سے کھاتا اور
اس کو انتہائی نقصان اور ضرر میں مبتلا کر دیتا ہے پس ارحم الراحمین کی رحمت و حکمت اور مخلوق
پر احسان کا تقاضا ہوا کہ اس نے ربا کو حرام کر دیا اور ربا کھانے والے، ربا کی دستاویز لکھنے والے
اور اس پر گواہی کے دستخط کرنیوالے کو ملعون ٹھیرایا اور جو شخص اس ملعون معاملہ سے باز نہ رہے
اس کو اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ جنگ کا چیلنج دیا اور بڑے بڑے گناہوں میں سے کسی
گناہ پر اس قدر سخت وعید کا نزول نہیں ہوا اور اسی بناء پر یہ (ربا) اکبر الکبائر (بڑے
گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ) شمار ہوا۔

اور ربا الفضل (ربا خفی) کی حرمت سد وسائل و ذرائع کی بناء پر ہے جیسا کہ حدیث ابوسعید
خدری رضی اللہ عنہ سے بصراحت معلوم ہوتا ہے۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا تبیعوا الدرھم بالدرھمین فانی اخاف علیکم الرما

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک درہم کو دو درہم کے عوض نہ خرید و فروخت کرو کیونکہ ایسی صورت میں مجھے خوف ہے کہ تم ربا میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

پس جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ربا الفضل" (یعنی نقد بیع و شرا میں قدر زائد کے
حصول) کو اس خوف سے منع فرمایا کہ ربا الفضل ربا النسیئۃ (ادھار پر سودی لین دین) تک
پہنچا دیتا ہے اور یہ اس لئے کہ ایک عقلمند ایک درہم کو دو درہم کے ساتھ اسی صورت میں خرید
و فروخت کر سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کھرے اور کھوٹے سکے میں تفاوت یا ہلکے اور بھاری
کا فرق جیسی صفات موجود ہوں پس اگر وہ جنس کی وحدت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صفات کے تفاوت کو معیار
قرار دیتا ہو تو یہ تفاوت اس کو نقد معاملہ سے ہٹا کر ادھار کے لین دین تک بآسانی پہنچا دیگا اور اسی کا
نام ربا النسیئہ ہے (بلکہ اسکا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مثلاً کھرا سکہ (ثمن، نقد) قرار پا جائیگا اور کھوٹا (مبیع)
خرید کا مال، اور یہ کہدینا آسان ہو گا کہ اگر ایک جانب مال ہو اور دوسری جانب "نقد سکہ" تو جس
طرح سکہ کے معاملہ میں ادھار درست رہا اسی طرح یہاں بھی ادھار کیوں جائز نہ ہو اور ربا کا فرمان

الفضل کے کاروباری ربا النسیئہ کے مرتکب ہو جائینگے[1] اس لئے یہ کہنا بیجا نہیں کہ ربا الفضل ربا النسیہ کے لئے قریب سے قریب تر ذریعہ اور وسیلہ ہے پس شارع (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حکمت نے یہ فیصلہ کیا کہ امت پر اس قریب تر ذریعہ اور وسیلہ کا دروازہ بھی بند کر دیا جائے[2] اور بلاشبہ یہ حکمت عقل وفطرت کے عین مطابق اور سودی مفاسد کے سدِ باب کے لئے بہترین ہے[3]

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

اور شارع حکیم و دانا ہے وہ انسان کی مصالح اور ضروریات پر پابندیاں اس وقت تک نہیں لگاتا جب تک کہ کسی معاملہ میں ضمنی یا لزومی طور پر ایسا مفسدہ موجود نہ ہو جو مصلحت و ضرورت کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ لحاظ ہے اور "ربا الفضل" کی حرمت سے متعلق حکمت بہت سے لوگوں پر مستور رہی حتیٰ کہ بعض متاخرین نے اعتراف کیا ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ربا الفضل کی حرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے حالانکہ گذشتہ سطور میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ربا الفضل کی حرمت شریعت کی عظیم الشان حکمت اور مخلوقِ خدا کی مصالح کی بہترین حفاظت پر مبنی ہے اور یہ کہ ربا کی دو قسمیں ہیں (۱) ربا النسیئہ اور اسکی حرمت تحریم المقاصد میں سے ہے (یعنی ان اُمور میں سے ہے جن کو صاحبِ شریعت حرام قرار دینا شریعت کے اہم مقاصد میں سے سمجھتا ہے) اور (۲) ربا الفضل اور اسکی حرمت ذرائع اور وسائل کی حرمت میں سے ہے اس لئے نفوسِ انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ جب ان کو نقد نفع کی راہیں تنگ نظر آتی ہیں تو پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفع مؤخر ہی میسر آجائے اور اس طرح ربا النسیہ تک پہنچ جاتے ہیں پس شارع نے ایسے وسیلہ کو بند کر دینا ہی ضروری سمجھا اور اس لئے ربا الفضل پر بھی ممانعت کی باڑہ لگا دی تاکہ ربا النسیہ تک کوئی نہ پہونچ سکے اب اہل نظر انصاف کریں کہ اس سے بہتر حکمت اور حکم اور کیا ہو سکتا ہے؟[4]

غرض اسلام نے "سود" کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کیا اور اس کے اقتصادی نظام

---

[1] قوسین میں مؤلف کی جانب سے تشریحی اضافہ ہے۔ [2] قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ دعوا الربا والریبۃ ربا اور ربا کی طرح کے مشتبہ معاملات کو ترک کر دو [3] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۹۹ و ۱۰۰ [4] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۰۳

کے بنائے ہوئے نقشہ میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ معاشرتی اور اخلاقی تباہ کاریوں کے اسباب وعلل میں سے بہت بڑا ذریعہ اور اہم سبب یہی "سود" ہے۔

نیز اس نے سود کی صرف ان ہی اقسام کو ممنوع قرار نہیں دیا جو زمانۂ جاہلیت میں "مشرکین عرب" کے یہاں رائج تھیں یا آج بھی عام طور پر رائج اور جو محض سود سے موسوم ہیں بلکہ اس کے متعلق چند اصول" بیان کر کے ان تمام شکلوں کا بھی سدِ باب کر دیا جن کا آخری نتیجہ "سود" کی طرح "بغیر محنت کی کمائی" نکلتا تھا اور ان سب کو سود ہی کے احکام میں شامل کر دیا۔

بینک

اسلام نے حرمتِ سود (ربا) سے متعلق جو اصول قائم کئے ہیں عام سودی لین دین کے دورِ جدید کے بعض وہ ترقی یافتہ ادارے اور کمپنیاں بھی اس حرمت کے تحت آجاتی ہیں جن کا دارو سودی لین دین پر ہے چنانچہ ان میں سے ایک ادارہ "بینکنگ سسٹم" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی بڑی تجارتوں کی آسانی، دولت وثروت کے ذخیروں کی حفاظت اور ان سے مزید زرکشی کیلئے اس ترقی یافتہ زمانہ میں "بینکوں کا وجود" ازبس ضروری اور نہایت کارآمد ومفید ہے۔

لیکن اس خوشنما رنگ وروپ میں جو زہرِ سیاہ پوشیدہ ہے اور اس ظاہر انگبیں میں جو زہرِ قاتل مستور ہے اگر اس کی تحلیل کی جائے اور اس کو بے نقاب کیا جائے تو یہ کہنا پڑیگا۔ کہ بینکوں کا وجود اس لئے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ اور پونجی میں بے پناہ اضافہ ہو اور جس دولت وثروت کے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسط اور غریب طبقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا" اس کا انسداد ہو جائے اور دولت سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع نقصان کی قسمت چند بینکروں کے ہاتھ میں مقید ہو کر رہ جائے اور اس طرح بینکوں کے سودی جال سے نہ کوئی تجارت محفوظ رہے اور نہ زراعت اور نہ روزمرہ کی معاشرت اور نتیجہ یہ نکلے کہ دنیا خود دو حصوں میں تقسیم ہو جائے ایک طرف بڑے بڑے قارون مثال سرمایہ دار ہوں اور دوسری جانب کروڑوں مفلس، نادار ومحتاج جو بدن کے لئے کپڑا اور پیٹ کے لئے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور موسم سرما کی سردی اور گرما کی گرمی سے حیوانوں سے بدتر حال

میں تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں یا زار و نزار حالت میں سسکتے رہنے کے عادی ہوں۔

بے شک بینک بہت مفید اور نہایت ضروری چیز ہے۔ لیکن سرمایہ داروں کے لئے، غریبوں کے لئے نہیں، اس لئے کہ قارونی دولت کی کاشت کے لئے ابر نیساں ہے اور غریبوں کی لاشوں پر سرمایہ کی تعمیر کے لئے بہت عمدہ مسالہ۔

اور بلاشبہ بینک نہایت مضر اور تباہ کن شے ہے مگر عوام اور غربا کے لئے، امیروں اور دولتمندوں کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ وہ خوبصورت طریقوں سے دولت کو دولتمندوں میں محدود کرتا اور عوام کی غربت کو ہولناک درجہ تک پہنچا دیتا ہے اور تہذیب نو کا یہ تجارتی جال در اصل دورِ قدیم کی مہاجنی ہنڈیوں کے بیوپار کی نہایت حسین اور شاندار تصویر ہے۔

پس اگر وہ اقتصادی بہتری کے لئے ضروری تھا تو یہ بھی از بس ضروری ہے اور اگر اس نے عوام کی تباہی پر دولتمندی کی بنیادیں رکھیں تو یہ بھی اسی تباہی کا بہترین نقشِ ثانی ہے۔

اقتصادی نظام کا جو نقشہ اسلام نے بنایا ہے اگر دنیا کو اس کے مطابق چلایا جائے تو پھر بینکوں کے موجودہ سسٹم[1] کی کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی ہے کیونکہ وہ دولت حاصل کرنے کی بے روک ٹوک آزادی میسر ہی نہیں آ سکتی اور نہ وہ ایسے مہلک طریقوں کی اجازت دے سکتا ہے جو اکثریت کو برباد کر کے چند افراد کا فائدہ کرتے ہوں اور نہ وہ ایسے ترقی یافتہ تجارتی ذرائع کو مانتا ہے جو صرف بڑے بڑے سرمایہ داروں کو ہی فروغ دینے کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور غریبوں کے لئے ان میں معمولی سا حصہ بھی نہ ہو۔

پس جبکہ "بینک" کا موجودہ سسٹم بھی "سود" کی طرح کا ایک نظام ہے تو اسلامی نظام اقتصاد میں اس کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔

۱؎ اگر بینک سسٹم کی ضرورت تسلیم بھی کر لی جائے تو پھر ان کے قیام کی ایسی شکلیں ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو جس حد تک پورا کر سکیں جس کے لئے ایسے اجتماعی ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی انفرادی یا اجتماعی ضروریات کے لئے حصولِ زر یا بطور امانت روپیہ کا تحفظ، چنانچہ آئندہ صفحات میں اس ممکن صورت کا نقشہ پیش ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے یہاں یہ سوال پیدا کیا جائے کہ بینک کا قیام خواہ مذموم سرمایہ داری کے ترقی دینے ہی کی غرض سے کیا گیا ہو لیکن موجودہ زمانہ میں اس کے عظیم الشان فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔[1] تو اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کی خوبیاں یہ جو کچھ نظر آتی ہیں "قطع نظر اس بات کے کہ اس سے زیادہ اس کے عیوب ہیں" محض اس لئے نظر آتی ہیں کہ موجودہ تجارتی سسٹم اصل مذموم سرمایہ دارانہ نظام پر چل رہا ہے۔ لیکن جب اس نظام کو تباہ و برباد کر کے صحیح اور مفید عادلانہ نظام قائم کیا جائیگا تو پھر اس نظام میں تجارتی ترقی اور اقتصادی بہبودی کی ضرورت کے لئے قرض وامانت کا انتظام "بینک کے سسٹم" کے بغیر بھی نہایت خوبی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اگر بینک سسٹم ناگزیر ہو تو وہ ایسے اصولوں پر قائم رہ کر چلایا جا سکتا ہے جن کے پیش نظر نہ قرض وامانت پر سود کا لین دین ہو سکے اور نہ تجارتی سود کی گنجائش نکل سکے۔ بلکہ ایک ایسی کمپنی کی شکل میں منتقل ہو جائے جو روپیہ داخل کرنیوالوں اور بینکروں کے درمیان "مضاربۃ" کی طرح کی تجارت کیا کرے جسکا ذکر آئندہ صفحات میں آنے والا ہے۔

دراصل جو کچھ نظر آتا ہے سوسائٹی کے غلط نقشہ کی بدولت نظر آتا ہے اگر یہ بدل جائے تو اسکی ضروریات وواجبات سب ہی بدل جائیں گے۔ اور دنیا امن، ترقی، فلاح، رفاہیت، اخوت اور ہمدردی کے دھارے پر بہنے لگے گی۔

ہنڈیوں سے لین دین

بینک کا یہ سسٹم تو زمانۂ جدید کا ترقی یافتہ سسٹم ہے لیکن قدیم زمانہ میں یہی کام ہنڈیوں سے لیا جاتا تھا، کوئی درشنی ہنڈی کہلاتی تھی، کوئی غیر درشنی ہوتی تھی، یہ سارا کام بھی سود ہی کے

---

[1] عام نگاہوں میں بینک بہت فائدہ کی چیز نظر آتے ہیں لیکن جو لوگ اسکی تاریخ اس کے وجود کی غرض اور اسکی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بھی سودخواروں اور سرمایہ داروں کے افزونی سرمایہ کا ایک ترقی یافتہ آلہ ہے۔ دیکھو رسالہ "جامعہ" ماہ فروری ۱۹۳۹ء

نیز اس سلسلہ میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعہ عثمانیہ کی کتاب "اسلام اور سود" خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے موصوف بینک سسٹم پر بحث کرتے ہوئے ص ۵۰ پر یورپ کے ایک مشہور معاشی عالم کا یہ مقولہ نقل فرماتے ہیں "اس سلسلہ میں مسٹر جاوری بیڈلپ کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ ایسا سماج جو اپنے بینکروں کے حلقہ اثر میں ہو اور انکی اخلاقی تلقین کا روادار باقی رہنے کے قابل نہیں ہے معاشرے کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بینک کار ہیں۔"

طریقوں پر چلتا تھا جس کو مہاجنوں کی اصطلاح میں "سودبٹہ" کہتے تھے۔ اگرچہ ہندوستان میں بینکوں کا رواج کثرت سے ہوگیا ہے تاہم آج بھی ہنڈیوں کا لین دین بند نہیں ہوا ہے اور کل کی طرح آج بھی ہنڈیوں کا لین دین پایا جاتا ہے اور وہ تجارتی کاروبار میں دخیل ہیں۔

کوآپریٹو سوسائٹیاں بینک کے طریقہ کی ایک دوسری چیز ہے جس کو کوآپریٹو سوسائٹی "مجلسِ امدادِ باہمی" کہا جاتا ہے یہ اگرچہ غریب کاشتکاروں، مزدوروں اور متوسط طبقوں کو سستے قرض دینے کے اصول پر چلائی جاتی ہیں لیکن یہاں بھی چونکہ سود کی نجاست موجود رہتی ہے اسلئے سرکاری طور پر جسقدر بھی ایسی سوسائٹیاں قائم ہیں وہ نتیجہ میں ان غریب قرضخواہوں کے لئے باعثِ وبال بن جاتی ہیں اور مہاجنی دستبرد کی طرح ان کو اس سے بھی فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں قدیم و جدید طریقہائے ربوٰا کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور وہ ظاہر و خفی ہر قسم کے معاملۂ سود کو حرام قرار دیتا ہے۔

اسلام کے معاشی نظام میں اجتماعی کمپنیوں کے ذریعہ امداد باہمی کے طریقے البتہ اسلام نے امدادِ باہمی کے اجتماعی اداروں کو کلیتہً ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ اس نے جائز اور صحیح طریقوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جو سُود کی نجاست سے محفوظ رہ کر اداروں کے حقیقی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور خود بھی اپنی جانب سے ان صحیح وسائل کی جانب راہنمائی کی ہے جن کے ذریعہ سے درحقیقت غریب قرضخواہوں کی تباہ زندگی کے سہارے کی شکل پیدا ہو سکتی ہے یعنی وہ "امداد باہمی" کے نام سے ایسی مجالس (سوسائٹیاں) قائم کرنے کا حامی ہے جو مفید ہونے کے اعتبار سے تو وہی کام دیں جو دورِ جدید میں "کوآپریٹو سوسائٹیاں" کام دیتی ہیں لیکن اس کے لین دین میں سود کا (خواہ وہ کتنی ہی کم مقدار میں کیوں نہ ہو) ہرگز ہرگز دخل نہ ہو البتہ سوسائٹی کے اصل سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور عملہ کے اخراجات حاصل کرنے کے لئے ضائع کے ایسے جائز طریقے اختیار کئے جائیں جن کے بعد ایک طرف امداد باہمی کی "مجالس" کا فائدہ حقیقی فائدہ بن جائے اور دوسری جانب اصل سرمایہ کے تحفظ اور مجلس کے انتظامی کاروبار کے مصارف کا سامان مہیا ہو جائے تاکہ یہ مجالس قائم رہ سکیں۔

مثلاً پبلک سوسائٹیوں کا نظام اس طرح قائم کیا جائے کہ تجارتی، زراعتی، صنعتی وغیرہ ناموں سے ہر ایک جماعت کی جدا جدا مجالس قائم ہوں اور امدادِ باہمی کی رقوم کے علاوہ نظم و انتظام اور بقا و ترقی مجالس کے لئے رائے عامہ کے استصواب کے ساتھ اس جماعت کے افراد پر ایک ہلکا ٹیکس لگا دیا جائے جو سود کے قائم مقام رقم کی کفالت کر سکے اور افراد کی مالی حالت کے تناسب سے لیا جائے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ "تجارتی کوآپریٹو سوسائٹی" میں مثلاً جو رقوم دی جائیں وہ سود کے لالچ میں نہ دی جائیں بلکہ حسنِ سلوک اور انفاق فی سبیل اللہ کے اصول پر لگائی جائیں اور اسکے بعد اسکے نظم و نسق چلانے اور مجلس کے افادہ کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لئے تاجروں پر ایک ایسا معمولی ٹیکس مالی تناسب کے اعتبار سے لگا دیا جائے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے اور پبلک ٹیکس کے بوجھ سے پریشان بھی نہ ہو البتہ ایسے قوانین کے لئے استصواب رائے عامہ ضروری ہے[1]۔

امدادِ باہمی کے اس طریقہ کے علاوہ چند اور ایسے طریقے بھی ہیں جو آجکل کی سوسائٹیوں کے طریقوں سے ملتے جلتے ہیں مگر سود کی بجائے اُن میں "نفع" لے کر کام چلانے کا دوسرا ڈھنگ بتایا گیا ہے۔ فقہ اسلامی کے ابوابِ معاملات میں ان کی بعض جزئیات منقول ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے وقت علماء محققین کے ذریعہ تفصیلات و جزئیات سے آگاہی حاصل کی جا سکتی ہے یہاں ہم قصداً ان کے بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لئے کہ تفصیلات و جزئیات میں تو خوفِ طوالت ہے اور صرف اصول نقل کر دینے سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان کو دیکھ کر خود عملی پروگرام بنانے میں ایسی غلطی نہ ہو جائے کہ شریعتِ اسلامی کی نگاہ میں وہ سود کی حرمت میں داخل ہو جائے۔

الحاصل، کوآپریٹو سوسائٹیاں ہوں یا بینکنگ سسٹم، اسلام کے معاشی نظام میں ان ترقی یافتہ جدید اداروں کے لئے مشروط گنجائش ہے یعنی وہ شرحِ سود کو "صفر" دیکھنا چاہتا ہے اور ان کو قابلِ عمل بنانے کے لئے یا حکومت پر بوجھ ڈالتا ہے کہ وہ رفاہِ عامہ کے دوسرے اداروں کی طرح ان کو بھی اپنی ذمہ داری پر چلائے اور یا بعض ایسے جائز اور صحیح طریقے بتلاتا ہے جن کے استعمال

---

[1] اس لئے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ کا اسوۂ حسنہ اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

سے ان اداروں کا مقصد پورا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا کاروبار بھی جاری رہ سکے۔

امداد باہمی کے بعض بہتر طریقے

چونکہ امدادِ باہمی، اجتماعی زندگی کا ایک اہم ترین فریضہ اور مذہب، سیاست معاشرت اور اقتصاد تمام شعبوں پر یکساں حاوی ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی نص قطعی کا اعلان ہے۔

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ)

ہر ایک کی بھلائی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور برائی و سرکشی میں ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی مدد نہ کرو

اس لئے ترغیب کے ساتھ ساتھ اسلام ان شعبوں میں امداد باہمی کے بعض طریقے بھی بیان کرتا ہے مثلاً تجارتی شعبہ میں "مضاربۃ، معاوضۃ، عنان، شرکتِ صنائع، وجوہ وغیرہ اور زراعتی شعبہ میں مضاربۃ، معاملہ، مساقاۃ" وغیرہ۔

مضاربۃ

امداد باہمی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے یہ بہترین طریق تجارت ہے مضاربۃ ایسے تجارتی معاملہ کا نام ہے جس میں ایک جانب سے راس المال (سرمایہ) ہوتا ہے اور دوسری جانب سے فقط "محنت" ہوتی ہے اور منافع مثلاً نصف نصف یا کم و بیش طے پاجاتا ہے۔

بہت سے اربابِ دولت وہ ہیں جن کے پاس سرمایہ کافی ہے لیکن تجارتی کاروبار سے وہ قطعاً نا آشنا ہیں اور بہت سے نادار غریب ایسے پائے جاتے ہیں جن کو تجارتی کاروبار کو دیانت کے ساتھ چلانے کا سلیقہ تو ہوتا ہے مگر وہ سرمایہ سے محروم ہیں لہٰذا دونوں کو جائز دولت کمانے اور خصوصاً سرمایہ سے محروم کو اپنی محنت کا پھل اٹھانے کے لئے حسن سلوک اور امداد باہمی کا بہترین طریقہ ہے کہ صاحب مال اپنے مال کو اس دوسرے شخص کو تحفظِ سرمایہ کے اطمینان کے ساتھ حوالہ کردے اور اس کو موقع دے کہ وہ کاروبار کرکے خود بھی فائدہ اٹھائے اور اس کو بھی فائدہ پہنچائے۔

اسی طرح ایک بڑے تاجر کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ تجارتی کاروبار سے واقف ہونے کے باوجود افرادِ ملت کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی پونجی کے ایک حصہ سے مضاربۃ کا کام لے۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بُصریٰ (شام) کی منڈی میں خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ

عنہا کے مال میں تجارت اصولِ مضاربۃ پر ہی کی تھی جو بیش از بیش نفع کی شکل میں انجام پائی۔
اقتصادی نقطۂ نظر سے دیانت دار و سمجھ دار غریبوں اور کاروباری ضرورتمندوں کی ایسی امداد
جو غیور اور باحوصلہ افراد کے لئے قابلِ عمل اور باعثِ تسکین ہو "مضاربۃ" سے بہتر دوسرے طریقہ سے
ناممکن ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:۔

معاونتِ باہمی کی چند قسمیں ہیں ایک ان میں سے مضاربت ہے وہ یہ کہ مال ایک شخص کا ہو
اور محنت دوسرے شخص کی اور رضامندی طرفین کی تصریح کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو[۱]

اور فقہ کی مشہور کتاب سعدیات میں ہے۔

مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لئے جائز رکھی گئی ہے اس لئے کہ بعض مالدار کاروبار سے
ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر اور مصالحِ تجارت سے خوب واقف ہوتے
ہیں نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی یہ طریق تجارت جاری تھا اور آپ نے اسکو بہتر سمجھ کر
جاری رکھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل کیا اور حضرت عباس رض کی شرائطِ مضاربت کو آپ نے پسند
فرمایا۔ قرآنِ عزیز میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے "وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن
فَضْلِ اللَّهِ" اور ایک جماعت ہے جو زمین میں چل پھر کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے یعنی صاحبِ مال
تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اسکے ذریعہ سے ملکوں اور شہروں میں جاکر تجارت کرتے ہیں[۲]

گویا اس شکل میں سرمایہ دار کا سرمایہ "لعنت" نہیں بلکہ "رحمت" سمجھا جائیگا اور نادار کی محنت اور
کاروباری ہوشمندی اور استعداد ضائع اور رائگاں ہونیکی بجائے کار آمد اور نفع بخش ثابت ہوگی
نتیجہ یہ نکلے گا کہ نہ سرمایہ "کنز" بن کر احتکار و اکتناز کا باعث ہوگا اور نہ اصحابِ ضرورت کی انسدادِ
ضروریات پر قفل پڑ سکے گا اور اجتماعی زندگی میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابلِ نفرت سرمایہ دار۔

معاوضہ | "معاوضہ" ایسے تجارتی کاروبار کا نام ہے جس میں کمپنی کے طور پر چند افراد اپنا اپنا راس المال
دے کر شریک بنجاتے ہیں اور نفع و نقصان میں بھی شریک ہوتے اور ایک دوسرے کے لئے وکیل و

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۱۶ [۲] سعدیات حصہ ۲ ص ۱۱۲

کفیل اور اس معاملہ کے تمام حالات میں ذمہ دار رہتے ہیں۔ عنان بھی اسی قسم کی ایک خاص شرکت کا نام ہے

شرکتِ صنائع | اور "شرکت صنائع" کمپنی کے طرز پر اس قسم کے کاروبار کو کہتے ہیں جس میں چند ہم پیشہ صاحب صنعت وحرفت اپنے حرفہ کو شرکت کے ساتھ چلاتے اور نفع ونقصان کے شریک ہو جاتے ہیں۔

شرکتِ وجوہ | اور "شرکتِ وجوہ" اس تجارت کا نام ہے کہ بغیر "مال" کے چند افراد کے درمیان مساوی عمل ومحنت اور کسب واکتساب پر شرکت ہو جاتی ہے اور خرید وفروخت اور نفع ونقصان میں بھی برابر کی شرکت رہتی ہے۔

اگر آج یہ تمام صورتیں اپنی پوری آزادی کے ساتھ کسی نظامِ اقتصادی میں رائج ہو جائیں تو بیکاری اور اس کی وجہ سے پیدا شدہ عام افلاس وبدحالی بڑی حد تک رفع ہو جائے اور خوشحالی کا دور واپس آجائے مگر افسوس کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی نے ان جائز طریقوں کو تباہ وبرباد کر دیا اور باہمی تعاون وامداد کے ان سادہ اور آسان طریقوں میں بے اعتمادی کا جال بچھا دیا اور اس کی بجائے "سودی کاروبار تجارت" کو فروغ دے کر موجودہ بدحالی پیدا کر دی۔

سودی کاروبار کی یہ عمومیت جس کا نظارہ صبح سے شام تک ہماری نگاہیں تجارت، صنعت و حرفت اور لین دین کے مختلف طرق میں کرتی رہتی ہیں اور جس سے مرعوب ہو کر خود "مسلمان" علمائے اسلام سے اباحتِ سود کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ صورتِ حال ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ نبوت ورسالت نے مستقبل کے مستور پردہ پر جس کو ملاحظہ فرما کر اس حقیقتِ ثابتہ کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل ان مقدس جملوں کے ساتھ فرما دیا تھا۔

یاتی علی الناس زمان	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مستقبل میں ایسا زمانہ
یاکلون الربوا فمن لم یاکلہ	آئیگا کہ عام طور پر لوگ سود خواری کرینگے اور اگر کوئی شخص باز
اصابہ من غبارہ۔ [1]	رہیگا تو سود کے غبار سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔

تنبیہات | تجارتی کاروبار میں "سود" اور دیگر بیان کردہ امور کے علاوہ جس تجارت کو اسلام نے مذموم

---

[1] نسائی عن ابی ہریرۃ مرفوعاً۔

اور ناجائز قرار دیا ہے وہ "مسکرات کی تجارت" ہے۔ شراب اور اسی قسم کی دوسری منشیات کے استعمال سے جس قدر بد اخلاقیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ایک بدیہی مسئلہ ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ "دنیا کی ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور رکھتی ہے اس لئے شراب اور منشیات کے بھی کچھ نہ کچھ فوائد ضرور ہیں" یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کی مضرتیں اور ان کی تباہ کاریاں ان کے منافع سے چند در چند زیادہ ہیں۔

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	یہ لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارہ میں سوال کرتے ہیں
قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ	آپ کہدیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے
لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ	بھی ہیں اور ان کے فائدوں کے مقابلہ میں ان کا نقصان اور
نَّفْعِهِمَا (بقرہ)	ان کی مضرت بہت ہی زیادہ ہے۔

اس لئے اسلام نے ان کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ	بلاشبہ شراب، جوا، بت اور پانسے سب کار شیطان میں سے
وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ	ہیں سر تا سر نجاست ہیں تم کو ان سے بچنا چاہئے۔
الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ (مائدہ)	

اور اس نے صرف یہیں تک معاملہ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان چیزوں کی تجارت کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

عن عائشة رضی اللہ عنہا لما	صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات
نزلت آیات سورة البقرة من	نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
اٰخرها خرج النبی صلے اللہ	کہ اب شراب کی تجارت حرام کردی گئی۔
علیہ وسلم فقال حرمت التجارة	
فی الخمر [1]	

[1] بخاری باب تحریم التجارۃ فی الخمر۔

اگرچہ ان غیر مسلموں کے لئے جن کے یہاں مذہبی یا غیر مذہبی رسوم میں شراب یا منشیات کا استعمال ہوتا ہے اور معالجات کے بعض خصوصی حالات میں اسلام نے اپنے قانون اقتصاد میں کچھ مستثنیات بیان کردی ہیں تاہم اصل قانون میں اُن کی خرید و فروخت اور تجارتی کاروبار کو قطعاً ناجائز قرار دیا ہے کُتب فقہ میں ہے۔

> اور اگر کسی شخص نے مردار، خون، مدبر، مکاتب، ام ولد، شراب اور سور کی تجارت کی تو اس کی یہ بیع حرام اور باطل ہے اس لئے کہ تجارت کا ایک رکن "یعنی مال کا مال کے ساتھ مبادلہ" یہاں معدوم ہے کیونکہ یہ تمام اشیاء اسلامی نقطہ نظر سے مال میں شامل نہیں ہیں۔[۱]

اس پوری تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تجارت و صنعت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی بے عنوانیوں، مذموم سرمایہ دارانہ ترقی کی بندشوں اور غیر اخلاقی اشیاء کے انسداد کے لئے کیسی اعتدال کی راہ اختیار کی ہے اور اس کو مختلف خلشوں سے پاک رکھنے کے لئے کیسے بہترین طریقے استعمال کئے ہیں۔

---

[۱] سعیدیات حصہ اول ص ۳۱۴

انفرادی ملکیت کی تحدید

"اسلام" لوگوں کو ذاتی ملکیت سے نہیں روکتا اور وہ ایسے اقتصادی نظام کو تسلیم نہیں کرتا جس میں اشخاص و افراد کو اشیاء منقولہ کے علاوہ زمین اور ذرائع پیداوار پر کسی حیثیت اور کسی حالت میں بھی حق ملکیت حاصل نہ ہو اور وہ اس طریق کار کو غیر فطری اور ایسے نظام کو ناقص اور غیر مطمئن نظام سمجھتا ہے۔

یقین اور تجربہ کی روشنی میں یہ نظریہ صحیح اور درست ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل تو دوسرے نظامہائے اقتصادی کے مقابلہ کے وقت بیان ہوگی مگر یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن عزیز نے جن جن مقامات پر انفاق اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے ان میں افراد و اشخاص کی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے ترغیب دی ہے۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	اور اس نے مال کو باوجود اس کی محبت کے رشتہ داروں،
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	یتیموں، محتاجوں، مسافروں، مانگنے والوں کو اور گردنوں کو
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔	آزاد کرانے (یعنی غلام کو آزاد کرانے یا قیدی کو رہا کرانے یا
(البقرہ)	مقروض کو قرض سے نجات دلانے) کے لئے دیا۔
وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات)	اور ان کے مالوں میں سائلوں اور تنگدستوں کا حق ہے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (بقرہ)	اے ایمان والو! جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس کو خرچ کرو

اس نوع کی آیات قرآن مجید میں بکثرت ہیں جن میں انفرادی ملکیت تسلیم کرنے میں اشیاء منقولہ و غیر منقولہ یا ذرائع پیداوار میں سے کسی کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور ان میں سے کسی کے درمیان بحیثیت "نفس ملکیت" کوئی فرق نہیں بیان کیا گیا۔

تاہم وہ ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کی تحدید ضروری کرنا چاہتا ہے

اور اس ملکیت میں اس قسم کی وسعت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا جس کی بدولت اس کے اقتصادی نظام کی بیان کردہ اساس و بنیاد پر زد پڑے اور اس کا مقصد اصلی فوت ہو جائے۔ اسی لئے اوّل وہ تمام اشیاء کے بارہ میں بنیادی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ وہ "مباح الاصل" ہیں یعنی وہ کسی کی ذاتی اور شخصی مِلک نہیں ہیں۔ بلکہ خالقِ کائنات نے ان کو تمام افرادِ انسانی کے لئے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے مخلوق کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرہ)	خدائے تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہارے واسطے سب کچھ پیدا کیا ہے جو زمین میں موجود ہے۔

اس کے بعد پھر تخصیص کا سوال پیدا ہوتا ہے اور بمصداق "القرآن یفسر بعضہ بعضا" قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے، دوسری آیات قرآنی، احادیث نبوی اور روایات فقہی اس اذنِ عام کی تشریح یا تخصیص کرتی ہیں۔ یعنی یہ بتلاتی ہیں کہ کون سی چیزیں انفرادی ملک نہیں بن سکتیں اور کون سی بنتی اور بن سکتی ہیں۔

ان ہی تشریحات و تخصیصات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے اپنے نظام میں بعض اشیاء کو عام فائدہ کی خاطر سب کے لئے یکساں طور پر مباح قرار دیا ہے اور اس لئے ان اشیاء کے متعلق کسی فرد واحد یا چند افراد جماعت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ "مفادِ عامہ کے خلاف" ان کو ان کے تخلیقی مقام پر اس طرح اپنے قبضہ و تصرف میں کر لیں کہ وہ حکومت کو مقررہ منافع یا ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان اشیاء کے مالک کل اور اجارہ دار بن بیٹھیں البتہ ہر ایک فرد یہ حق ضرور رکھتا ہے کہ ان اشیاء کے مقام وقوع سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق جس قدر اپنے قبضہ و تصرف میں لے آئے وہ بلاشبہ اس کی ملکیت سمجھی جائے

اس کے برعکس خلافت (حکومت) کو یہ حق ہے کہ وہ ان اشیاء کی افادیت کو عام کرنے کے لئے ان کا نظم و ضبط اپنے ہاتھ میں لے، ان کی درآمد کا انتظام و انصرام کرے اور جمہور کی ملکیت کے نام پر ان میں معاشی نظام کی بہتری کے لئے جس قسم کا تصرف مناسب سمجھے کرے۔

مفادِ عامہ کے اس سلسلہ کی پہلی چیز "معدنیات" ہیں۔

کانیں

(۱) عن ابیض بن حمال المآربی انه وفد الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فاستقطعه الملح الذی بمآرب فاقطعه ایاه فلما ولّی قال رجل یا رسول الله انما اقطعت له الماء العد قال فرجعه منه ۔[۱]

ابیض مآربی کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مارب میں جو نمک کی جھیل تھی اس کو عطیہ کے طور پر مانگا آپ نے اجازت دیدی ایک شخص نے یہ دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ نمک کا ہمیشہ جاری رہنے والا خزانہ ان کے حوالہ کئے دیتے ہیں آپ نے اس کی اصلی حقیقت سے آگاہی کے بعد واپس لے لیا اور دینے سے انکار فرمایا

(۲) عن عمرو بن عوف المزنی ان النبی صلی الله علیه وسلم اقطع بلال بن الحارث معادن القبلیة جلسیها وغوریها وحیث یصلح الزرع من قدس و لم یعطه حق مسلم وکتب له النبی صلی الله علیه وسلم کتابا ۔[۲]

عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث کو مقام قبلیہ[۳] کے بلند و پست حصوں کی کانیں عطیہ کے طور پر دیدیں اور مقام قدس کے ان حصوں کو بھی جو کھیتی کے قابل تھے آپ نے اس عطیہ میں کسی مسلمان کا حق ہی کو نہیں دیا اور اس کے لئے ان کو فرمان لکھ دیا

یہ بالترتیب وہ صحیح احادیثِ رسول ہیں جن کو اساس و بنیاد قرار دیکر مجتہدین امت نے اسلام کے معاشی نظام میں معادن سے متعلق احکام بیان فرماتے ہیں شارحینِ حدیث اور فقہاء نے اس سلسلہ میں جن تفصیلات کو نقل کیا ہے ان کا حاصل یہ ہے

"معدنیات" کی دو قسمیں ہیں ایک "معدن ظاہر" اور دوسری "معدن باطن" معدن ظاہر ان معدنیات کو کہتے ہیں جن کا خزانہ یا تو سطح زمین پر ظاہر اور موجود ہو اور یا زمین میں اس طرح پائی جاتی ہوں کہ اگر تھوڑی سی محنت یا خرچ کرکے ان کو برآمد کر لیا جائے تو وہ مٹی یا پتھر کے ساتھ ان

---

۱ ترمذی کتاب البیوع ۲ ابو داؤد کتاب الامارة والفئی والخراج۔

۳ قبلیہ مدینہ طیبہ اور ینبوع کے درمیان وادی کا نام ہے معجم البلدان ج ۷۔

کے اجزا کی حیثیت میں مخلوط و مربوط نہ ہوں بلکہ زمین میں خزانہ کی حیثیت میں موجود ہوں مثلاً
نمک، مٹی کا تیل، پٹرول، تارکول وغیرہ اور "معدن باطن" ان معدنیات کو کہتے ہیں جو نہ زمین اور پہاڑ
کی سطح ظاہر پر موجود ہوں اور نہ اجزاء وافر و دائم کی طرح زمین اور پہاڑ کے اندر جدا موجود ہوں بلکہ
زمین اور پہاڑ کے اندر ذرات زمین یا پتھر کے اجزاء کی حیثیت میں مستور ہوں اور جن کو حاصل کرنے اور
پتھر یا زمین کے اجزاء سے جدا کر کے صاف کرنے میں کافی محنت اور سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہو۔

پس اگر پہلی قسم کی معدنیات ہیں تو وہ کسی حال میں بھی نہ شخص واحد یا مخصوص جماعت کی
ملک بنائی جا سکتی ہے اور نہ ان کو بطور اجارہ کسی کو دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ عوام کی ضروریات اور
افادہ کے لئے مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے ہر شخص کو بلا معاوضہ استفادہ کا حق ہے گویا اصطلاحی
بول چال میں وہ پبلک کی نمائندہ حکومت (خلافت) کی ملکیت اور مفاد عامہ کے لیے وقف ہے

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ حدیث اول کی شرح میں فرماتے ہیں۔

لاشک ان المعدن الظاہر	یہ ایک صاف بات ہے کہ جو کانیں "معدن ظاہر" ہیں ان کی وہ اشیاء
الذی لا یحتاج الی کثیر عمل	میں زیادہ محنت کی ضرورت پیش نہیں آتی ان کا کسی ایک
اقطاعہ لواحد من المسلمین	مسلمان کو بخشدینا عامۂ مسلمین اور ان کی ضروریات کے
اضرار بہم و تضییق علیہم[1]	لئے تنگی اور مضرت کا باعث ہے اس لئے ان کا عطیہ جائز نہیں۔

اور خطابی شرح ابوداؤد میں تحریر ہے۔

وھذا یبین ما قلنا من ان	اور یہ حدیث ہمارے اس بیان کی حقیقت پر
المعدن الظاہر الموجود خیرہ	دلالت کرتی ہے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا کہ معدن ظاہر موجود
ونفعہ لا یقطعہ احد والملح	کا نفع اور فائدہ کسی ایک شخص کو عطیہ میں نہ دیا جائے
العد ہو الماء الذی	عد اس پانی کو کہتے ہیں جو ہمیشہ بہتا رہے اور نہ ختم ہونے والا
لا ینقطع	کو کہتے ہیں[2]

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص [illegible] معالم السنن ج ۳ ص [illegible] یہ نمک کی جھیل تھی جیسا کہ ہندوستان میں سانبھر جھیل ہے۔

اور کتب فقہ میں بھی یہ تصریح موجود ہے۔

(و) اعلم انه ليس للامام ان يقطع ما لا غنى للمسلمين عنه من المعادن الظاهرة وهي ما كان جوهرها الذي اودعه الله في جواهر الارض بارزاً كمعادن الملح والكحل والقار والنفط۔ ¹

اور جاننا چاہیے کہ امام کے لئے جائز نہیں ہے کہ ایسی چیز کسی کو عطیہ کر دے کہ جس کے فائدے سے عامۃ المسلمین مستغنی نہ ہوں یعنی معادن ظاہرہ کو کہ جن کا جوہر ذخیرہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے جوہروں میں سے ظاہر صورت میں ودیعت کیا ہے مثلاً نمک، سرمہ، تارکول اور مٹی کے تیل کی کانیں۔

غرض مآربی سے متعلق حدیث کے پیش نظر جمہور علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ معدنیاتِ ظاہرہ مفادِ عامہ کے لئے ہیں اس لئے وہ کسی کو بطور اجارہ کے دی جا سکتی ہیں اور نہ بطور عطیہ کے بلکہ حکومت کے ہاتھوں میں رہیں گی اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کا حق ہوگا۔

اور اگر دوسری قسم کی معدنیات (معدنیاتِ باطنہ) ہیں تو چونکہ ان کی دریافت بہت زیادہ محنت اور کافی سرمایہ کی محتاج ہے پس ان کے متعلق حکومت (خلافت) مجاز ہے کہ ان کانوں کو مفادِ عامہ کے قابل بنانے کے لئے خواہ اپنے قبضہ و اختیار میں رکھے اور خواہ مناسب سمجھے تو اجارہ دیدے مگر ان کے فائدہ کو عام بنائے یا شخص واحد اور مخصوص جماعت کی ضروریات کی کفالت کے لئے بطور عطیہ کے دیدے جیسا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلال بن حارث (رضی اللہ عنہ) کو قبلیہ کی معادن عطیہ کر دیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس عطیہ کو اپنی ضرورت کے لئے کام میں لائے۔ اور بیکار و معطل نہ چھوڑ دے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کل یا جز جس حصہ کو بھی معطل اور بیکار چھوڑتا ہے امام کو اختیار ہے کہ اس کے قبضہ سے وہ حصہ نکال کر دوسرے کو عطیہ کر دے یا عامۂ خلق کے لئے حکومت کے ہاتھ میں لے لے۔

¹ چنانچہ قاضی ابو یوسف (رحمہ اللہ) کتاب الخراج میں حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کے ان عطایا سے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

حدثنی بعض اشیاخنا من اهل ... میرے اہل مدینہ کے شیوخ میں سے ایک بزرگ نے ...

¹ دیکھو کتاب الیا

للمدینة قال اقطع رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم بلال بن الحارث المزنی ما بین البحر والصخر فلما کان زمن عمر بن الخطاب قال لہ انک لا تستطیع ان تعمل ھذا فطیب لہ ان یقطعھا ماخلا المعادن فانہ استثناھا ۔

کی ہے کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو سمندر اور خشکی کے درمیان وادی کو بطور عطیہ کے دیدیا تھا مگر جب عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے بلال سے فرمایا تم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اتنے بڑے علاقہ کو کام میں لا سکو پس حضرت عمرؓ نے یہ پسند فرمایا کہ معادن (قیلیہ) کو اُن کے ہاتھ سے نکال کر باقی حصہ زمین کو ان کے پاس بطور عطیہ باقی رہنے دیں ۔

اس جگہ "ماخلا المعادن فانہ استثناھا" خصوصیت سے قابل غور ہے کہ حضرت عمرؓ نے تمام جاگیر میں سے واپس لینے کے لئے "معادن" ہی کو کیوں ترجیح دی اور مستثنیٰ فرمایا؟

اور یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج میں اس واقعہ کی تفصیلات اس طرح منقول ہیں وہ فرماتے ہیں

"جب حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا تو انھوں نے بلال بن حارث سے فرمایا بلال! تم نے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے طویل و عریض علاقہ کو بطور عطیہ حاصل کر لیا تھا اور نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ وہ کسی سائل کے سوال کو رد نہیں فرماتے اور کیفیت یہ ہے کہ تم اس علاقہ کو نہیں سنبھال سکے (یعنی اس کا کافی حصہ افتادہ پڑا ہوا ہے) لہذا اس قدر حصہ کو تم کام میں لا سکتے ہو اس کو اپنے پاس رکھ کر باقی حصہ کو میرے حوالہ کر دو کہ میں مسلمانوں میں اس کو حسب ضرورت تقسیم کر دوں۔ حضرت بلال رضی اللّٰہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا ایسا نہ ہوگا جو کو نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے بطور عطیہ کے مرحمت فرمائی ہے میں اس کا حصہ بھی واپس نہیں دوں گا حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا قسم بخدا! تم کو واپس دینا ہوگا چنانچہ جس قدر حصہ ان کی طاقت عمل سے باہر تھا اس کو حضرت عمرؓ نے واپس لیکر مسلمانوں میں تقسیم کر دیا"۔ [2]

اور خطابی رحمہ اللّٰہ امام شافعیؒ کے مسلک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"جس علاقہ کو خلیفۂ اسلام نے اسلحہ کی طاقت سے حاصل کیا ہے اگر وہاں کوئی زمین افتادہ

[1] ص ۹۲ [2] حدیث (۲۹۲)

بیکار پڑی ہے اور کسی مسلمان (یا معاہد) کی ملکیت نہیں ہے تو امام اس کو بطور "عطیہ" کے دے سکتا ہے۔ پس اگر امام نے کسی کو بطور "عطیہ" کے زمین کا کوئی حصہ دیدیا اور اس نے اس کو آباد کر لیا یا اس میں کھیتی کر لی تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ملک ہو گیا۔ اور اگر امام نے کسی کو "معدن" کا کوئی حصہ عطیہ کر دیا تو اس کو دیکھا جائے گا اگر وہ "معدن" ظاہر ہے جیسے مٹی کا تیل یا تارکول وغیرہ تب امام کا یہ "عطیہ" ناجائز اور واجب الرد ہو گا اس لئے کہ ان اشیاء کے منافع خود بخود حاصل ہیں وہ بغیر زیادہ محنت کے محتاج نہیں اور لوگوں کا ان اشیاء کے ساتھ ہر وقت کا واسطہ ہے لہٰذا جو بھی اس میں سے جس قدر اپنی ضرورت کے لئے حاصل کر لے وہ اسی کا ہے اور کسی کو اس پر تنہا ملکیت کا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس طرح دوسروں پر ترجیح حاصل کر لے۔

اور اگر سونا، چاندی، تانبا اور اس قسم کے دوسرے جواہرات کی کانیں ہیں جو زمین میں اس طرح پوشیدہ ہیں کہ مٹی یا پتھر کے اجزا کی طرح ان میں مخلوط اور پیوستہ ہیں اور بغیر کافی محنت و مشقت کے ان کا مٹی اور پتھر سے جدا کر لینا ممکن نہیں ہے تو ان معادن کا "عطیہ" درست ہے البتہ اگر جاگیر حاصل کرنے والا اس کو معطل چھوڑ دے یا اس کو برآمد نہ کرے تو وہ اس کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے روک سکتا ہے جب تک وہ اس پر کام کر سکتا ہے کرے ورنہ عامہ مسلمین کے حق میں یہ دست بردار ہو جائے"۔[له]

"معادن باطنہ" یا "زمین کے کسی حصہ" کو بطور جاگیر دینے کے جواز میں شرائط بالا کے علاوہ مجتہدین اسلام نے اس مسئلہ کی روح کو جس انداز میں بیان فرمایا ہے وہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے۔ امام ابو یوسف کتاب الخراج میں "اقطاع" (جاگیر دینے) پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قال ابو یوسف: اما انا فاری ان الامام ... لا یکون فیہ ضرر علی احد ولا لاحد فیہ خصومۃ ان اذنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"اقطاع" (جاگیر دینے) کے مسئلہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ اگر ایسا کرنے سے کسی فرد (یا جماعت) کو نقصان نہیں پہنچتا اور نہ اس زمین کے متعلق کسی کا کوئی مناقشہ ہے تو بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے "اجازت" قیامت تک

له معالم السنن ج۔ ص ۲۲۔

حائز الی یوم القیمۃ فاذا جاء الضرر فھو علی الحدیث "ولیس لعرق ظالم حق" [۱]

کے لئے صحیح اور حق ہے اور اگر ایسا کرنا ضرر اور نقصان کا باعث ہو جائے تو اس وقت یہ معاملہ اس حدیث کا مصداق ہوگا "ظالم کو رگ کے لئے کوئی حق نہیں ہے یعنی جو اقطاع عامۃ الناس کے حق میں مضر ہو امام کو اس سے بچنا چاہئے ورنہ یہ ظلم ہوگا"۔

وللامام ان یقطع کل موات وکل ماکان لیس لاحد فیہ ملک ولیس فی ید احد وله فی ذلک بالذی یری انہ خیر المسلمین واعم نفعا [۲]

"اور امام کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ افتادہ (مردہ) زمین کو کسی کو جاگیر کے طور پر دیدے بشرطیکہ وہ کسی کی ملک نہ ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو اور امام کو اختیار ہے کہ وہ اس زمین کے بارے میں عامہ مسلمین کے لئے نفع اور خیر کے اصول کو پیش نظر رکھ کر جو چاہے کرے۔

اور ابو عبید کتاب الاموال میں نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زمین کا ایک ٹکڑا بطور جاگیر طلب کیا اور ان کو یہ یقین دلایا کہ ایسا کرنے سے عامۃ الناس اور عامہ مسلمین کو کسی قسم کا کوئی ضرر لازم نہیں آتا تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصرہ کے والی حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یہ تحریر فرمایا۔

ان کانت کما تقول فاقطعھا ایاہ [۳]

اگر بات اس طرح ہے جیسا کہ یہ کہتا ہے تو اس کو زمین کا وہ ٹکڑا جاگیر دیدو۔

اور بلاذری نے اس واقعہ میں حضرت عمرؓ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے:۔

ان کانت لیست تضر باحد من المسلمین ولیست من ارض الخراج فاقطعھ

اگر اس حصہ زمین کو بطور جاگیر دیدینا نہ تو کسی مسلمان کے لئے باعث مضرت ہو اور نہ یہ زمین "خراجی" ہے (یعنی مفتوحہ علاقہ کی ایسی زمین جس سے سرکاری مالگذاری آتی ہے)

ایاہ۔[1]	تو اس کو جاگیر کے طور پر اس شخص کو دیدو۔

ان تمام حوالجات کا حاصل یہ ہے کہ معادن تو الگ رہے اگر معمولی زمین بھی بطور جاگیر کسی کو دی جائے تو حسبِ ذیل شرائط کا پیشِ نظر رہنا ازبس ضروری ہے ورنہ تو یہ عمل اسلامی احکام میں ظلم اور ناجائز ہوگا۔

(۱) وہ زمین نہ کسی مسلمان کی اور نہ کسی معاہد کی ملک ہو اور نہ انہیں سے کسی کے قبضہ میں ہو۔

(۲) نہ اس میں زراعت کے اور نہ تعمیر کے آثار پائے جاتے ہوں اور نہ کسی اہل بستی کے مفادِ عام کے لئے "فی" ہو، نہ چراگاہ ہو اور نہ قبرستان کی زمین ہو نہ سوختہ حاصل کرنے کی جگہ ہو اور نہ ان کے بیٹھنے یا چرنے کے کام آتی ہو۔[2]

(۳) اس سے مفادِ عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔

اور امام کو اس عمل "اقطاع" کی اجازت صرف اس لئے دی گئی کہ کوئی زمین بنجر (مردہ) باقی نہ رہے اور "معطّل" رہنے کی وجہ سے محصولاتِ زمین کم نہ ہوں کہ بیت المال گھاٹے میں رہے

فان ذلك اعمر للبلاد	یہ اقطاع اس لئے جائز ہے کہ اس سے بستیوں کی آبادی ہوتی
واکثر للخراج۔[3]	ہے اور خراج (محصولِ زمین) میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور ان شرائط کے ساتھ امام کے لئے "اقطاع" (جاگیر دینا) صرف جائز ہے اور مفادِ عام کی خاطر ہے نہ کہ اس کو مفروضہ بہلانے کے لئے اس لئے وہ دینے نہ دینے میں مختار ہے۔

اور "جواز مع شرائط" کا یہ معاملہ بھی عام مردہ "افتادہ" زمینوں کے متعلق ہے لیکن یہ زمین اگر "معادن باطنہ" کی حامل ہیں تو ان میں مفادِ عامہ کے پیشِ نظر "امام کے رجحانات" کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ کافی ہے۔

ان یقطعها ما خلا المعادن	حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دی کہ معادن کے
فانه استثناها۔	علاوہ حصص زمین کو بطور جاگیر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

---

[1] ص ۳۴۵ [2] کتاب الخراج لابی یوسف ص ۶۳ [3] کتاب الخراج ص ۶۱

ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ وسلم کے زمانہ مبارک میں زمینوں کا کافی حصہ یونہی معطل پڑا ہوا تھا اور اگر کسی جگہ "کان" بھی موجود ہوتی تو اس کو نکالنا آسان نہیں تھا ایک شخص بمشکل شدید محنت سے معمولی ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا لیتا تھا لہٰذا ضروری ٹھیرا کہ ایسی بنجر اور افتادہ زمینوں کو کارآمد بنانے کے لئے "اقطاع" کی صورت اختیار کی جائے پس جب تک یہ صورت حال رہے کہ عامۃ الناس اور حکومت (خلافت) کا مفاد "اقطاع" میں ہو تو یہ عمل نہ صرف درست بلکہ مستحسن وضروری رہے گا اور جب کبھی صورت حال بدل جائے اور مفادِ عامہ اور مفاد مسلمین کے پیش نظر ان کا حکومت کے ہاتھ میں رہنا مفید ہو اور کسی ایک شخص یا جماعت کے قبضہ میں دے دینا مضرت عام کا باعث بن جائے جیسا کہ موجودہ مشینوں کے دور میں "معاون" کے مفاد کا معاملہ ہے تو اس صورت میں "معاون باطنہ" کا جاگیر کے طور پر دینا خود حدیث رسول "لیس لعرق ظالم حق" اور "انما اقطعتہ الماء العد قال فرجعہ" کے اور حضرت عمرؓ کے مسطورہ بالا فیصلوں کے مطابق نادرست ہوگا "معاون" (کانوں) کے معاملہ میں ان احکامات حدیثی وفقہی کے بعد صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات حقہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں "معاون" کو بیجا استعمال کرنے پر اظہار نفرت اور وعید کا اظہار پایا جاتا ہے تاکہ بآسانی یہ معلوم ہو سکے کہ اس خاص مسئلہ میں صاحب شریعت کی "بالغ نظری" کن رجحانات کا پتہ دیتی ہے۔

چنانچہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نور نبوت کی روشنی میں مستقبل کا مطالعہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب "معدنیات" پر شریروں کا قبضہ ہوجائے گا۔

عن رجل من بني سليم عن جده انه	نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کچھ چاندی
اتى النبي صلى الله عليه وسلم بفضة	لایا اور کہنے لگا یہ ہماری معدن (کان) سے نکلی ہے نبی
فقال هذه من معدن لنا فقال	اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا، وہ زمانہ قریب
النبي صلى الله عليه وسلم: سيكون	ہے کہ معادن (کانوں) پر شریر لوگ قابض ہوجائیں گے
معادن يحضرها شرار الناس۔ [1]	

[1] مجمع الزوائد ج ۴ ص ۶۵

ان شریر انسانوں سے وہ انسان مراد نہیں ہیں جن کی شرارت انفرادیت لئے ہوئے ہے بلکہ وہ ظالم قومیں اور جابر حکمراں مراد ہیں جو معادن پر قابض ہوکر عام انسانوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ان کو انسانی دنیا کی تباہی اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کا آلہ کار بنا کر دنیا کو اپنی شرارت اور شیطنت سے بھر دیں گے۔ چنانچہ اس کی تائید ابوداؤد کی مشہور حدیث بھی کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرے ذمہ ایک شخص کے دس دینار واجب تھے ایک روز وہ گرو جھپٹ گیا کہ اپنی رقم لئے بغیر نہ ٹلوں گا، یا کوئی ضامن دو۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر ضمانت کرلی، کچھ دن گزرے بعد ایک شخص آپ کی خدمت میں میرے قرض کی مقدار سونا لے کر آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے دریافت فرمایا۔

من این اصبت هذا الذهب؟ قال: من المعدن: قال لا حاجة لنا فيها ليس فيه خير فقضاها عنه رسول الله صلے الله عليه وسلم[1]

یہ سونا تم نے کہاں سے حاصل کیا؟ اس نے عرض کیا کان سے آپ نے فرمایا، ہم کو یہ نہیں چاہئے اس میں خیر و بھلائی نہیں ہے اور پھر قرض خواہ کو اپنے پاس سے رقم ادا فرمادی۔

مشہور محدث خطابیؒ اس جملہ کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپؐ نے لیس فیہ خیر اس لئے فرمایا کہ اس قسم کے سرمایہ میں اکثر سرمایہ دار حریص اور طامع ہو جاتے ہیں اور ایسے مال پر علاوہ جو زکوٰۃ (خُمس) واجب ہے وہ قطعاً نہیں نکالتے یا حیلہ بہانہ کرکے اس کو کم ظاہر کرتے اور عامل زکوٰۃ کو پوری زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اس لئے ایسا مال اکثر مشتبہ رہتا ہے دوسرے یہ کہ چونکہ کان کنی سخت محنت اور مصیبت کا کام ہے۔ مزدور اس محنت شاقہ کے لئے بمجبوری آمادہ ہوتے ہیں اس لئے کان کا مالک یا اجارہ دار سخت گیری برتتا اور مزدوروں کو محنت شاقہ برداشت کرنے پر مجبور کرتا ہے لہٰذا ایسے مال سے کہ جس میں غریبوں پر تشدد کیا گیا ہو برکت اور رحمت مفقود ہوتی ہے[2]

یہ ہیں وہ کلماتِ طیبات جو نورِ نبوت کے آئینہ میں حال اور مستقبل کا نقشہ دیکھ کر زبان نبوت ترجمان

---

[1] ابوداؤد کتاب الامارۃ والفئی والخراج [2] معالم السنن ج ۲ ۔

سے نکلے اور جن کا ایک ایک حرف زمانہ ماضی سے بھی زیادہ آج صادق آرہا ہے۔

غرض چاندی، سونا، لوہا، کوئلہ، پیٹرول وغیرہ قسم کی کانیں اقتصادی نظام پر بہت زیادہ اثر انداز ہیں اور وجوہ معیشت کی جان ہیں اس لئے موجودہ دور میں اسلام کے معاشی نظام سے متعلق احکام کی روشنی میں یہ دعویٰ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ ان سب کو شخصی ملکیت نہیں بلکہ جماعتی یعنی حکومت (خلافت) کی ملکیت ہونا چاہئے تاکہ مفادِ عامہ باطل ہوکر مفادِ خاصہ میں تبدیل نہ ہوجائے۔

کون نہیں جانتا کہ اسٹیمر، ریلوے، دخانی جہاز، ہوائی جہاز، موٹر، الیکٹرک وغیرہ جیسے اہم کاروبار بغیر کوئلہ، پٹرول، لوہا، پیتل کے نہیں چل سکتے اور چاندی سونا تانبا پیتل زیورات ظروف کے علاوہ سرکاری سکوں اور تجارتی کاروبار کی ترقی کے لئے کس قدر اہم ہیں سب کو معلوم ہے۔

پس اگر کسی اقتصادی نظام میں قدرت کی بخشی ہوئی یہ "دولت" ایک یا چند اشخاص کے ہاتھ میں دیدی جائے اور حکومت اور ان کے درمیان اس سرمایہ داری کی تقسیم اجارہ داری کے نام سے کردی جائے تو ظاہر ہے کہ ملک کی باقی آبادی اس کے انتفاع سے بڑی حد تک محروم رہ جائے گی اور یقیناً اس راہ سے ایک خاص جماعت میں "دولۃً بین الاغنیاء" اور "یکنزون الذھب والفضۃ" کا منظر نظر آنے لگے گا۔

چنانچہ جس دور میں بھی اس اصول کے خلاف ان کانوں کو کسی ملّی یا وطنی حکومت نے اجارہ داری کے سسٹم پر چلانے کی کوشش کی اس کو نہ صرف اپنے اقتصادی نظام میں شدید نقصان بلکہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجنبی اجارہ داروں نے اس قوم کو تباہ کرنے اور غلامی کی لعنت میں گرفتار رکھنے کا بہترین ذریعہ اکثر اسی کو بنایا اور صدیوں تک اس کو ان سے نجات نہ مل سکی ہندوستان، مصر، عراق، ایران عہد جدید میں اور امریکہ و وسطی یورپ عہد قدیم میں اسی غلط روی کا شکار ہوئے ہیں اور اس زمانہ میں بھی یورپ و ایشیا کی حکومتوں کے بیشتر کاروبار ایسے ہی مٹھی بھر سرمایہ داروں اور دولت کے اجارہ داروں کے رحم وکرم پر چل رہے ہیں اور اقتصادی خوشحالی و بدحالی حتیٰ کہ

ملکوں کے عروج و زوال ان ہی خود غرض اور حریص سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔

منڈیوں میں ارزانی، گرانی، سکّوں کے طلائی و نقرئی معیار اور درآمد و برآمد کے معاہدات پر ان ہی کا قبضہ و تسلط ہے اور حکومت نے جابرانہ و قاہرانہ استعماریت کی طمع میں مفادِ عامہ کو ان کے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے اور اگر تاریخ کی شہادت غلط نہیں ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مہاجنوں اور بینکروں کی اس دست بُرد کی ابتداء اسی قسم کی اجارہ داری اور ملکیّت کی رہینِ منت ہے۔ پس اسلام اس قسم کی عام بدحالی کو اپنے نظام میں کس طرح برداشت کرنے کو آمادہ ہو سکتا ہے؟

البتہ اس سلسلہ میں اسلام کا معاشی نظام اس قدر انفرادیت کو ضرور تسلیم کرتا ہے کہ اگر کسی شخص کے ذاتی مکان یا صحرائی زمین میں کوئی دفینہ نکل آیا یا کان کا کوئی حصہ برآمد ہو گیا اور اس نے محنت کر کے اس سے کچھ حاصل کر لیا تو یہ اس کی ملکیت شمار ہو گی اور اس کو دولت (سرمایہ) قرار دے کر اس پر زکوٰۃ یا خمس (پانچواں حصہ) عائد کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ فقہاء اسلام نے اس کی تفصیلات اس طرح بیان فرمائی ہیں۔

دفینہ اگر اسلامی دور سے تعلق رکھتا ہے یعنی سکّہ پر اسلامی سکّہ کی علامات پائی جاتی ہیں تو اسکا حکم "لقطہ" (گری پڑی یا گم شدہ چیز جو کسی کے ہاتھ آ گئی) کا ہے جس کے تفصیلی احکام کتب فقہ میں درج ہیں اور اگر غیر اسلامی دور کی علامات موجود ہیں یا کسی قسم کی علامت نہیں ہے تو وہ ذاتی مکان یا زمین میں برآمد ہوا ہو یا عشری، خراجی یا افتادہ صحرائی زمین و پہاڑ میں نکلا ہو اس پر "خمس" پانچواں حصہ واجب ہو گا کیونکہ حدیث میں ہے۔

وفی الرکاز الخمس۔ — مالِ مدفون پر خمس واجب ہے

اور معدنیات میں تین قسم کی حاصلات ہوتی ہیں (۱) سیّال نہ ہوں لیکن آگ پر رکھنے سے پگھل جائیں مثلاً سونا، چاندی، پیتل، تانبا وغیرہ (۲) سیال ہوں مثلاً پٹرول، مٹی کا تیل، تارکول وغیرہ

(۳) نہ سیال ہوں اور نہ آگ پر رکھنے سے پگھل سکتی ہوں مثلاً زمرد، ہیرا، یاقوت سرمہ وغیرہ۔

پس اگر یہ ذاتی زمین یا ذاتی مکان میں برآمد ہوئیں تو ان پر حکومت (خلافت) کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ اور اگر عشری، خراجی زمین یا صحرا وجبال میں برآمد ہوئی ہیں تو پہلی قسم پر خمس (پانچواں حصہ) واجب ہے اور باقی دونوں قسموں پر کوئی مطالبہ نہیں ہے۔[۲]

فقہائے اسلام "دفینہ" اور "معدن" کے مسائل زکوٰۃ میں فرق کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں کہ "دفینہ" زمین کے اجزاء میں سے نہیں ہے بلکہ زائد از زمین ایک شے ہے۔ بخلاف "معدن" کے کہ وہ اجزاء زمین میں سے ہے مثلاً سونا یا چاندی، مٹی ہی کے وہ اجزاء ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض کے وقت سے اس میں ودیعت کر دیئے ہیں اس لئے "دفینہ" اور "معدنیات" میں ذاتی زمین ومکان اور صحرائی یا عشری وخراجی زمین کے سلسلہ میں جو فرق نظر آتا ہے وہ فطری اور معقول ہے۔

اور امام مالکؒ نے تو "معادن" کے بارہ میں یہاں تک فرما دیا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت نے قاہرانہ حیثیت سے کسی ملک پر قبضہ کیا ہے اور مفتوح پبلک سے مصالحت اور معاہدات خصوصی کے ذریعہ قبضہ نہیں کیا تو اس ملک میں اگر کانیں برآمد ہوں تو اس زمین کی شخصی ملکیت ساقط ہو کر سلطان (خلیفہ) کی جانب لوٹ جائے گی اور حکومت کو اس پر قطعی اختیار حاصل ہوگا کہ وہ مفاد عامہ کے پیش نظر جس قسم کا تصرف کرنا چاہے کرے خواہ اس کی برآمد کو اپنے انتظام سے کرائے اور خواہ اس کو عطیہ کے طور پر یا اجارہ پر دیدے۔

قال وما افتتحت عنوۃ فظھر	امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا جس زمین کو خلیفہ نے قاہرانہ فتح
فیھا معادن فذلک الی	کیا ہے اگر اس میں کانیں نکل آئیں تو وہ زمین سلطان
السلطان یصنع فیھا ماشاء	(خلیفہ) یعنی حکومت کی جانب لوٹ جائے گی وہ جس طرح
ویقطع بھا لمن یعمل فیھا	چاہے اس میں تصرف کرے اور دفرد واحد یا جماعات کو جنہیں

---

[۱] البتہ اگر وہ اشیاء میں جن پر زکوٰۃ واجب ہے تو حولان حول یعنی سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

[۲] اور اگر ان کی تجارت کریگا تو مال تجارت کی طرح زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لان الارض لیست للذین اخذوا عنوۃ [1] — کان جس کا کام کرنا چاہے اس کو دیدے یہ اس لئے کہ جن مجاہدین نے اس کو جہاد کر کے فتح کیا ہے زمین ان کی ملکیت نہیں بنتی

مگر عطیہ اور اجارہ میں یہ شرط ملحوظ رہیگی کہ عامۃ الخلق کے حق پر زد نہ پڑتی ہو چنانچہ اندلس کے مشہور فلسفی وفقیہ ابن رشد رحمہ اللہ امام کے اس ارشاد پر اصولی بحث کرتے اور دو قول میں سے ایک قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" معادن پر خلیفہ ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے اور عطیہ کے طور پر بھی دے سکتا ہے اس کی مثال عہد نبوت میں موجود ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بلال بن حارث مزنی (رضی اللہ عنہ) کو قبلیہ کی کان کا ایک حصہ بطور عطیہ کے دیدیا تھا۔ اور دو قول میں سے پہلے قول کی کہ معادن زمین کے تابع نہیں ہیں، دلیل یہ ہے کہ سونا چاندی جو کانوں کے اندر ہیں زمین پر کسی کے بھی مالکانہ تصرف سے قبل جوف زمین میں موجود ہیں اس لئے زمین کی ملکیت سے معدن کی ملکیت ہرگز لازم نہیں آتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد " اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ " اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ وہ جس کو چاہے زمین کا اور زمین کے اندر جو کچھ موجود ہے اس سب کا مالک بنائے۔ بلکہ صرف زمین کے مالک بنا دینے کا ذکر فرمایا ہے۔ لہٰذا آیت کے اس ظاہر مفہوم کے پیش نظر یہ بس ضروری ہے کہ جوف زمین میں از قسم معادن سونا چاندی جو کچھ بھی ہے اس پر تمام مسلمانوں کا یکساں حق ہے۔ فوجب بحو ھذا الظاھر ان یکون ما فی جوف الارض من ذھب او ورق فی المعادن فئاً لجمیع المسلمین [2]

اجارہ داری کی کمپنیاں

معدنیات سے متعلق اجارہ داری کا معاملہ عموماً کمپنی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور ملک کا وہ بہترین سرمایہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں بلکہ حکومت کی تمام آبادی کے لئے مفید اور نفع بخش ثابت ہو سکتا تھا، اس طرح افراد کے اندر محدود ہو جاتا اور آخر کار بدحالی کا نتیجہ بنتا ہے۔ عہد جدید و قدیم میں جس ملک میں بھی اس قسم کی اجارہ داری پائی جاتی ہے اس سے انکار

[1] مدونۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۹۶ [2] کتاب المقدمات الممہدات لابن رشد علی المدونۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۲۲، ۲۲۳

نہیں ہوسکتا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی بدولت کارخانہ دار اور مزدور یا سرمایہ اور محنت کے درمیان میدان کارزار گرم ہوگیا ہے اور بعض اوقات حکومتوں کی تباہی و بربادی پر ختم ہوا ہے۔ کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت اسی کا رہین منت ہے اور روس کا دور اشتراکیت اسی کی جد پیداوار ہیں اگر معدنیات کے لئے کمپنی اور شیرز (حصوں) کا یہ حرص انگیز سسٹم بطور "اصول" اور تجارتی بنیاد کے تسلیم نہ کر لیا جاتا۔ اور ان امور کو "مفاد عامہ" کے اصول کے پیش نظر حکومت کے اختیارات مجازی کے سپرد کر دیا جاتا تو افراط و تفریط کی راہ سے الگ اسی اعتدال کی راہ پیدا ہو جاتی جس کی جانب اسلام نے اپنے نظام میں توجہ دلائی ہے اور پھر نہ اشتراکیت سے انتری پھیلتی اور نہ سماجی نظام سے بدحالی و تباہ کاری

لہٰذا عام حالات میں وہ ایسی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے تیار نہیں ہے اور بعض مخصوص حالات میں عطیہ یا اجارہ داری کے جواز و اباحت کی شکل میں بھی اس "بنیادی اصول" کو فراموش کرنا نہیں چاہتا کہ ہر حالت میں مفاد عام خطرہ سے محفوظ رہے اور مذموم سرمایہ داری کو سر اٹھانے کے لئے بہانہ ہاتھ نہ آجائے کیونکہ اس قسم کی کمپنیاں جب اپنے تجارتی نظام کو وسیع کرنے کے لئے بین الاقوامی حالات پر نگاہ ڈالتی ہیں تو اپنے خصوصی مفاد کے پیش نظر عام افادہ اور عام لوگوں کے نفع سے آنکھ بند کر کے ملک اور حکومت کے تمام سیاسی اقتصادی معاشرتی رجحانات کو اسی ایک رخ پر چلانے کی سعی کرتی ہیں جن سے ان کا ذاتی مقصد فروغ پا سکتا ہے خواہ اس کی بدولت ملک کی عام حالت یا انسانوں کی عام زندگی خطرہ ہی میں کیوں نہ پڑ جائے اور یہی وہ زہر ہے جو اگرچہ اپنی ابتدائی شکل میں نہایت شیریں مفید اور حیات پرور نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر خدا کی مخلوق کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے اور بالآخر خدا کی اس مخلوق پر موت کی نیند طاری کر دیتا ہے

آپ شاید اس بیان کو حیرت سے پڑھیں کیوں کہ جدید ترقی پذیر دنیا نے تو کمپنیوں کے اسی سسٹم ہی سے ترقی اور اقتصادی سربلندی حاصل کی ہے لیکن اگر آپ فلسفہ اجتماع اور انسانی تشریع و تقنن کے مقصد عظیم "اخوت عامہ" کے پیش نظر باریک بینی سے مطالعہ کریں گے تو اندازہ ہوگا کہ

یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اسی سسٹم نے قوموں کے باہمی عداوت اور استحصال بالجبر کی بنیاد ڈالی، اسی نے خود اپنے ملک کی آبادی کو چند مخصوص سرمایہ داروں کا غلام بنا کر تباہ کیا اور اسی نے "اقتصادی ترقی" کے نام سے دنیا کے ہر گوشہ میں بے اطمینانی، خود غرضی اور جذبہ ڈاکہ زنی کو عام کر دیا ہے۔

اور گراں اشیاء کو "مفاد عامہ کی ملک قرار دیا جاتا اور اسی مقصد کے اندر محدود رہ کر حکومت اُن کا انتظام کرتی یا پبلک کے افراد کے ذریعہ کمپنی کی شکل میں مفاد عامہ کے نقطہ نظر سے فروغ دیتی تو یہ صورت کبھی پیدا نہ ہونے پاتی اور ملک میں ایک عام متوسط زندگی کا دور ہوتا اور انسان کی زندگی نصیب ہوتی۔ قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر یہ کہا جائے کہ کانوں (معدن) سے متعلق اگر اسلام کا معتدل اقتصادی نظریہ تسلیم کر لیا جائے جو مخصوص حالات میں بعض بنیادی شرائط کے ساتھ انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے حقیقتاً اجتماعی ملکیت کو اساس سمجھتا اور اس طریق عمل کو مفاد عامہ کے لئے ضروری مانتا ہے تو نہ صرف پبلک میں عام خوشحالی کا دور پیدا ہو جائے گا بلکہ اس طرح عام رفاہیت تجارت کی فراوانی اور [illegible]اعت کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ ذرائع مہیا ہو سکیں گے

مثلاً جب پٹرول کی کانیں ملک میں برآمد ہوں اور اجارہ دارانہ سسٹم کی کمپنیوں کی بجائے خود حکومت کی اپنی سرکاری کمپنی اس کی برآمد کا انتظام کرے تو ظاہر ہے کہ درمیانی کمپنیوں کی من مانی زیادہ ستانی سے اس کی قیمت میں موجودہ دور کی طرح ناقابل برداشت گرانی نہیں ہو سکے گی۔ تب حرف اس کا فائدہ صرف مخصوص سرمایہ داروں ہی تک محدود نہ رہے گا بلکہ عام اور متوسط طبقہ پیدا ہو سکے گا جس پر ملک کی بہتری کا بہت کچھ مدار ہے اور اس طرح استعمال کرنے والے بھی اس کا فائدہ عام ہو جائے گا۔

کیا کوئی کاروباری آدمی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر پٹرول "کو" درمیانی کمپنیوں کے ذاتی منافع کے شکار سے نکل کر براہ راست خود گورنمنٹ کے ہاتھوں ملک تک پہنچے تو ضروریات کی

ہزاروں اشیاء جن کی ارزانی اور گرانی کا مدار کوئلہ کی ارزانی اور گرانی پر ہے اس قدر ارزاں ہوجائیں کہ دولتمندوں کی طرح عوام اور متوسط بھی ان اشیاء سے کافی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

جہازوں اور ریلوے کے ٹکٹ، محصولات اور آلات حمل ونقل کی فراوانی وغیرہ اس ترقی کے دور میں بڑی حد تک اسٹیم اور بجلی کی قدر وقیمت کے ساتھ وابستہ ہیں اور اسٹیم وبجلی کا وجود کوئلہ پر موقوف ہے۔ پس اگر کوئلہ ارزاں ہے تو اس کا اثر مذکورہ بالا اشیاء پر پڑتا ہے اور اگر گراں ہے تو یہ تمام اشیاء پر اثر انداز ہے۔ لہذا اقتصادی نظام کے مسطورہ بالا نظریہ کا یہ پہلو اس قدر صاف ہے کہ کوئی صاحب عقل وخرد اس کی صحت کا انکار نہیں کرسکتا۔

ملیں اور کارخانے جب صنعت وحرفت انسانی ہاتھوں سے نکل کر مشینوں اور کلوں کے قبضہ میں چلی جاتی ہے تو سرمایہ دار کے لیے جنت کی ایک کھڑکی کھل جاتی ہے اور وہ ملیں اور کارخانے قائم کرکے خدا کے لیے ہی جیسے بندوں "غریبوں اور مزدوروں" پر آقائی بلکہ العیاذ باللہ خدائی کرنے لگتا ہے وہ مزدوروں کے نام سے ان کی جان ومال اور آبرو پر قابض ہوجاتا اور ان انسانوں کو غلاموں کی نہیں بلکہ حیوانوں کی طرح اپنے مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کا عادی بنجاتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے ؎

دے رہا ہوں مزد کی صورت میں اس کو میں زکوٰۃ — درحقیقت اس کی خدمت کا صلہ کچھ بھی نہیں
اس کی کم ظرفی نے فطرت کا بگاڑا ہے مزاج — رفتہ رفتہ ہو رہی ہے وہ خسیس وخشمگیں
سیم وزر لیکر بھی ہیں راضی نہ تھا روز ازل — بن گیا مزدور جھٹ جاروب کش بتکدہ رہیں

اور طرفہ تماشا یہ کہ اس دور تہذیب وتمدن کے موجد جو غلامی کو لعنت کہتے اور اس کے خلاف بڑھ بڑھ کر لیکچر دیتے رہتے ہیں غلامی کے اس اقتصادی جال کو نہ صرف جائز رکھتے بلکہ اپنی حکومتوں اور شاہنشاہیتوں کی ترقی کے لئے بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کو ہر وقت سرمایہ اور سرمایہ دار کے اس جال کی بندشوں کو قوانین کی راہ سے اور زیادہ مضبوط کرتے رہتے ہیں اور اس جال کی بندشوں کا حسن وجمال اس وقت اور زیادہ قابل دید ہوتا ہے جب اس کے جواز کے لئے دھرم اور مذہب کے نام پر غلط حمایت بھی شامل ہوجاتی ہے۔

محنت کی زیادتی، حق محنت کی کمی اور عام حقوق انسانی سے محرومی کے بعد اس ایلوٹنگ کی زبوں
حالی دیکھنی ہو تو بمبئی، کلکتہ، کراچی، مدراس، دہلی، کانپور اور شولاپور جیسے تجارتی مقامات میں جا کر
دیکھئے پہلے "مل اونرز" کی چمن زار کوٹھیوں اور جنت نظیر بنگلوں پر ایک نظر ڈالئے، اور اس کے بعد
پھر ان غلیظ اور نجس چالوں اور کوارٹرز کو ملاحظہ فرمائیے جس میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح مزدور رہتے ہیں

لیکن قانون فطرت انتقام لئے بغیر کب باز رہتا ہے آخر مزدور و سرمایہ دار کی جنگ کے تمام
سے وہ شعلے بھڑک اٹھے ہیں جس نے "سرمایہ دارانہ نظام" کو بھسم کر کے بالآخر ایک قدیم مگر عادلانہ نظام
کے لئے زمین ہموار کر دی ہے لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا

سرمایہ اور محنت میں توازن

اسلام چونکہ خود دین فطرت ہے اور اس کا نظام کسی انتقام یا ردعمل پر مبنی نہیں ہے
بلکہ نام اور حقیقت دونوں لحاظ سے کائنات انسانی کی عام فلاح و بہبود کا ضامن
نظام اور انسانی ضروریات دینی و دنیوی کے ہر شعبہ میں مستقل انقلابی پیغام ہے اس لئے اس
نے اپنے اقتصادی نظام میں اس جگہ بھی مذموم سرمایہ داری کی حمایت نہیں کی بلکہ سرمایہ اور محنت
میں ایک ایسا معتدل توازن قائم رکھا ہے کہ اس کے بعد اس جنگ کے لئے کوئی جگہ ہی باقی نہیں
رہتی۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ سرمایہ دار "مزدور" کو اپنے سرمایہ داری کے جال میں کن راہوں سے پھانستا
اور تباہ و برباد کر دیتا ہے اور اگر وہ راہیں بند کر دی جائیں تو پھر تعاون اور امداد باہمی کا وہ قانون
جو انسان کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے یہاں بھی بغیر افراط و تفریط کے صحیح نقشہ کے مطابق کس
طرح حسن وجوہ نافذ ہو سکتا ہے۔

(۱) پہلی گرہ جو اس جال میں مزدور کو پھنسانے کے لئے لگائی گئی ہے وہ اجرت کی کمی ہے وہ
نادار ہے، مفلس ہے، بیچارہ ہے، فاقہ کش ہے اس لئے اس کی محنت کا صلہ ایک روپیہ ہونے کے
باوجود سرمایہ دار اس کو چار آنے پر راضی کر لیتا ہے اس لئے کہ وہ بھوکا ہے تن، پیٹ دونوں کے لئے
عاجز و درماندہ ہے، سرمایہ دار خوش ہے کہ اس نے جبر نہیں کیا بلکہ مزدور اپنی مرضی سے اس پر آمادہ
ہو گیا اور مزدور یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ اس ناواجب اجرت کو اضطراری طور پر قبول نہیں کرتا تو فاقوں

کی بدولت موت کا استقبال لازمی ہے اور یہ کہ دوسرا مزدور مجھ سے زیادہ بدحالی اور اضطرار کی وجہ سے اس سے بھی کم اجرت پر کام کرنے کو تیار نظر آتا ہے۔

(۲) دوسری گرہ یہ لگائی گئی کہ کم سے کم مزدوری میں مزدور سے کام زیادہ سے زیادہ لیا جائے اور وہ اس کو بھی اپنے افلاس اور تنگ حالی بلکہ فاقہ کشی کی خاطر منظور کر لیتا ہے اور اپنی بیچارگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہا کر نو دس گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ محنت کر کے سرمایہ دار کو خوش کرتا ہے تب جا کر مشکل چار آنے کا حقدار ہوتا ہے۔

لیکن اسلام اپنے نظام میں مفلس اور صاحب حاجت کی اس رضامندی کو "مرضی" تسلیم نہیں کرتا اور سرمایہ دار کے ان دونوں پھندوں کو ظلم قرار دے کر اس طلسم کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

فیلسوفِ اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:۔

"بس اگر مالی نفع ایسے طریقہ پر حاصل کیا جائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار، یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سود کی کا دو بار توان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے مجبور ہو کر ایسی ذمہ داریاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے اور نہ ان کو پاکیزہ ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے بلاشبہ یہ حالت تمدنی حکومتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہے" [۱]

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ عزوجل ثلثۃ انا خصمھم یوم القیمۃ ومن کنت خصمہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں میں کو مغلوب و مقہور کئے بغیر چھوڑوں گا ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پورا پورا لے لیکن

[۱] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ من ابواب ابتغاء الرزق۔

خصمتہ (الی) ورجل استاجر اجیرا استوفی منہ ولم یوفہ[۱] ولیستعملھما فیما یحسنانہ ولیطیقانہ بلا اضرار بھما[۲]

مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا، کام لینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ (آزاد ہو یا غلام دونوں قسم کے اجیروں) سے اس حد تک کام لے کہ وہ اچھی طرح کام انجام دے سکیں اور بقدر طاقت کام لینا چاہئے اور یہ نہ ہو کہ ان کو اتنی محنت کرنی پڑے کہ انکی صحت وغیرہ کو نقصان پہنچے[۳]

(۳) سرمایہ داری کے جال کی تیسری گرہ یہ ہے کہ مزدور کی اجرت معین نہ کرے اور اس کی غربت سے فائدہ اٹھا کر یونہی کام پر لگائے اور کام مکمل کرانے کے بعد جو اجرت چاہے دیدے اسلام نے اسکو بھی ناپسند اور ناجائز کہا ہے اور ایسے معاملہ کو خیانت سے تعبیر کیا ہے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن استجار الاجیر حتی یبین لہ اجرہ[۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کئے بغیر کام پر لگا لیا جائے۔

(۴) چوتھی گرہ یہ ہے کہ حق محنت تو مقرر کر دیا جائے لیکن ادائیگی میں من مانی رکاوٹ پریشان کن ترکیبیں اور ظلم و جبر کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ مزدور کو وقت پر اپنے معمولی حق محنت سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔

اسلام نے اس کا بھی سد باب کیا ہے اور ایسا کرنے کو بدمعاملگی "ظلم" اور بڑا گناہ قرار دیا ہے اور وہ اپنے اقتصادی نظام میں ایک لمحہ کے لئے بھی سرمایہ دار کے اس ظلم سے درگذر نہیں کرنا چاہتا

عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مالدار کا مال اری

۱؎ بیہقی ج ۶ کتاب الاجارہ ۲؎ محلی ابن حزم احکام الاجارات ج ۸ ۳؎ اجیر و مستاجر کے درمیان محنت و اجرت کے صحیح توازن اور کام کے اوقات کے تعین جیسے مسائل کا تعلق مفتی کے فتوی سے نہیں بلکہ خلیفہ اور قاضی کے اختیارات سے تعلق رکھتا ہے اس لئے فقہ کے ان ابواب یا مسائل کی جانب مراجعت ضروری ہے جنہیں مختلف مسائل کے ذیل میں یا مستقل طور پر ان اختیارات اور مداخلت قاضی سے بحث کی گئی ہے ۴؎ بیہقی کتاب الاجارہ ج ۶ ص ۱۲۰

علیہ وسلم قال مطل الغنی ظلم ۔ [1]
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ ۔ [2]

کہ باوجود مقدرت کے ادائے حق میں تاخیر کرنا ظلم ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدور کی مزدوری
اس کے پسینے کے خشک ہونے سے پہلے ادا کرو

(۵) پانچویں گرہ یہ ہے کہ "مزدور" کا حق تلف کرنے اور بہانہ سازی سے سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لئے مزدور پر کام خراب کرنے کا الزام لگا کر دیئے ہوئے چند ٹکے بھی جرمانہ کے نام سے واپس لے لئے جائیں، گویا بزعم خود یہ ظالم سرمایہ دار اپنے نقصان کا تاوان "انصاف" کے نام سے وصول کرتے ہیں۔

اسلام نے اس کو بھی افراط و تفریط سے الگ اعتدال کی حالت پر لانے کی کوشش کی ہے اور عدل و انصاف کے صحیح اصول پر یہ فیصلہ کیا ہے۔

"اور اجیر مشترک ہو یا خاص یا کاریگر ہو اس پر مال میں نقص پیدا ہو جانے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا، تاوقتیکہ اس کا ارادی قصور یا ضائع کر دینا ثابت نہ ہو اور ان تمام امور میں جب تک کہ اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں اجیر ہی کا قول معتبر ہے قسم کے ساتھ" [3]

ان تصریحات کے بعد اسلام اپنے اقتصادی نظام میں مزدوروں اور پیشہ وروں کو بھی جب راس المال کے ساتھ زیادتی اور بیجا تعدی کرنے سے روکتا ہے اور نہیں چاہتا کہ

---

[1] بخاری و مسلم ۔ [2] بیہقی ج ۶ ۔ [3] محلی ج ۸ ص ۲۰۱ ۔ اور حنفیہ کے نزدیک اجیر خاص کا اگرچہ یہی حکم ہے مگر اجیر مشترک اس اجیر کو کہتے ہیں جو اپنا ایک مستقل فنی کاروبار کرتا ہو اور ہر شخص اس کام کے سلسلہ میں اس سے خدمت لیتا ہو مثلاً پیشہ کپڑا رنگنے وغیرہ کا کام لینا، اور اجیر خاص سے مراد وہ اجیر ہے جو اپنی خدمات کسی ایک شخص کے لئے بعوض وقف کر دے مثلاً گھر کا ملازم، بیرہ، باورچی وغیرہ اور اجیر خاص پر ضمان نہ آنے کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

لانہ یدہ ید امین والعین فی یدہ لہ
حکم الامانۃ الا اذا تعمد الفساد فانہ
یضمن للتعدی ۔

مستاجر کی شے اس کے ہاتھ میں امانت ہے اس لئے اس کا
حکم امانت ہی کا رہے گا مگر یہ کہ جان بوجھ کر چیز کو برباد
یا خراب کرے تو اس صورت میں ضمان آئے گا۔

طرف سے افراط اور دوسری طرف سے تفریط ہو۔

عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال خیر الکسب کسب العامل اذا نصح[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین کمائی مزدور کی کمائی ہے بشرطیکہ وہ خیر خواہی اور بھلائی کے ساتھ کام والے کا کام کرے۔

ان تمام احکام عدل و انصاف کے بعد وہ مستاجروں اور اجیروں دونوں کے لئے ایک جامع قانون بیان کر کے میزان عدل کو مساوی رکھنے کی سعی کرتا ہے شرح شرعۃ الاسلام میں ہے

"اسلام کی سنت یہ ہے کہ لوگوں (اجیر و مستاجر، بائع و مشتری وغیرہ) کو آپس میں مہربانی رحم اور باہم یک دگر خیر خواہی کے ساتھ معاملات کرنے چاہئیں، اور وہ یہ کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے ---------- جو اپنے لئے پسند کرتا ہے یعنی معاملات میں صرف اپنے فائدہ ہی کا پیش نظر نہ ہو بلکہ فریق ثانی کے فائدہ کا بھی خیال رہے۔"[2]

یہی وجہ ہے کہ فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ شاہ دہلوی نے "اجارہ" کو تعاون اور معاونت میں شمار کیا ہے یعنی ایسے کل معاملات اور کاروبار جو دو فریق کے باہم دگر مدد و اعانت سے نفع بخش ثابت ہوتے ہیں "باب تعاون" ہی میں داخل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں)۔

معاونت کی چند اقسام ہیں اور اجارہ بعض لحاظ سے مبادلہ اور بعض لحاظ سے معاونت ہے۔[3]

لیکن اگر ان حقوق میں تصادم پیش آجائے اور ایک دوسرے کے حقوق پر دستبرد کرنے لگے تو اس قسم کے تمام معاملات میں یعنی تعیین مدت عمل تعیین مقدار اجرت، آسائش و راحت کے انسانی حقوق وغیرہ میں "حکومت" کو دخل اندازی کرنی چاہئے اور خود عدل و انصاف کے ساتھ ان معاملات کو اس طرح طے کر دینا چاہئے کہ جانبین کے واجبی حقوق میں ظلم کا شائبہ تک باقی نہ رہے چنانچہ نرخ کی گرانی کی بحث میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جب ضرر عام اور اجتماعی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس وقت حکومت کو مداخلت کا حق ہے۔

ولا یسعر حاکم الا اذا تعدی

حاکم نرخ میں اس وقت تک مداخلت نہ کرے جب تک

---

[1] رواہ احمد مجمع الزوائد ج ۴ ص ۹۸ [2] ص ۳۲۲ فصل فی طلب الحلال۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲

الا ارباب عن القیمۃ تعدیا فاحشا فیسعر بمشورۃ اھل الرائ [1]

مگر ارباب نرخ "قیمت کی گرانی میں زیادتی پر اتر آئیں اس وقت امام کو اہل الرائے کے مشورے سے نرخ مقرر کر دینا چاہیے۔

یعنی امام کو متعلقہ امر کے ماہرین کی مجلس شوریٰ یا سب کمیٹی مقرر کر کے اس کے مشورے سے اقدام کرنا چاہیے۔

الحاصل اسلام اپنے اقتصادی نظام میں صنعت و حرفت اور تجارت پر بہت زور دیتا ہے اور جگہ جگہ ایماندار تاجروں کو خدا کی رضا اور جنت کی بشارت سناتا اور اس کو خوش عیشی اور رفاہیت کی راہ بتاتا ہے نیز انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پیشے اور کسب معاش کے واقعات سنا کر صنعت و حرفت کی ترغیب دیتا اور گھریلو اور دستی کاریگری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے عوام کی بیروزگاری دور ہوتی اور عام طور پر متوسط خوش حالی کی راہیں کھل جاتی ہیں

اسی طرح "ملوں اور کارخانوں" کی جدید ایجادات کے سلسلہ میں بھی اس کا قانون اجتماعی فلاح و بہبود کے قوانین سے عاجز و درماندہ نہیں ہے اسی لئے وہ حکم دیتا ہے کہ اس کے نظام میں ان ملوں اور کارخانوں کا استعمال صحیح طور پر تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ حکومت رفاہ عام اور مفاد عامہ کی خاطر ان سے کام لے اور ارباب دولت کو ایسے مواقع مہیا نہ ہونے دے کہ وہ غریب لوگوں کو اپنی مشینوں کے پرزوں ہی کی طرح سمجھ کر اپنی اغراض کا آلہ کار بنا لیں اور اس طرح عام فقر و فاقہ کے ساتھ مخصوص افراد یا گروہ میں دولت "کنز" بن کر جمع ہو جائے اور اگر پبلک میں سے دولت مند حضرات ملک کی دولت میں اضافہ کرنے اور اپنی رفاہیت میں جائز بہتات پیدا کرنے کے لئے حکومت سے اجازت خواہ ہوں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ بالا شرائط و حدود کے ساتھ ان کو اجازت دے تاکہ افراط و تفریط سے الگ اس بارہ میں ایسا توازن قائم ہو جائے کہ ارباب سرمایہ مذموم سرمایہ داری تک نہ پہنچ سکیں اور اجیر و مزدور حیوانوں اور غلاموں کی طرح نہیں بلکہ باہمی اشتراک و تعاون کے ساتھ اپنی معاشی زندگی کو بحسن وجوہ حاصل کر سکیں کیونکہ

[1] در مختار مع الشامی ج ۵ باب الحظر والاباحۃ۔

یہ اگر حاصل ہوجائے تو پھر مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ کے امکانات خود بخود ختم ہوجاتے ہیں۔

سے مزدوروں اور غریبوں کے حفظانِ صحت، خوراک و لباس کی آسائش، بچوں کی تعلیم وغیرہ معاملات سو ان کے لئے اسلام کا ایک ہی فیصلہ ہے کہ حکومت (خلافت) بغیر امتیاز امیر و غریب پبلک کی تمام قسم کی جائز اور واجب ضروریات کی کفیل اور ذمہ دار ہے۔

انفرادی عیش و تنعم یوں تو ہر شخص اپنے روپے، پیسے اور ذرائع آمدنی کو انفرادی ملکیت کی بنا پر اپنی راحت اور اپنے عیش پر صرف کرنے میں مختار و مجاز ہے لیکن اگر یہی اختیار و اجازت حد اعتدال سے نکل کر اس غلط راہ پر پڑ جائے کہ عورتوں میں زیور کی کثرت، زیب و زینت کے لئے گراں قیمت کی اشیاء کی خریداری، فیشن کی دلدادگی اور مردوں میں اسراف و نمائش سے متعلق عام ضروریاتِ انسانی سے الگ خارج از اعتدال تفریحی اخراجات کا ایسا ہمہ گیر شوق و ذوق پیدا ہوجائے کہ قوم کی قوم اس میں مبتلا نظر آنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ بازاروں میں عام حاجات کی اشیاء کے مقابلہ میں بناوٹی حسن اور زیبائش کی اشیاء کا لین دین بڑھ جائے۔ اہل صنعت و حرفت کی نظر ان ہی امور کی دیدہ زیبی اور لطافت آفرینی میں محو اور مصروف ہوجائے، تجار کی تجارت کا فروغ صرف اسی پر رہ جائے، مزدوروں کی محنت کا ثمرہ دولت اسی پر خرچ ہونے اور عام ضروریات کی تجارت خام اجناس کی زراعت اور رفاہِ عام کے سلسلہ کی صنعت و حرفت، کساد بازاری کے نذر ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کا اقتصادی جہاز گرداب ہلاکت میں گھر چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کے لئے تخت کی جگہ تختہ اور زربفت و کمخواب کی جگہ ٹاٹ و پلاس بھی میسر نہیں آئے گا۔

پس ملک کی ایسی خستہ حالت کو روکنا اور اس کے انفرادی اختیارات کی اس آزادی پر اخلاقی اور آئینی پابندیاں عائد کرنا اور اس ملک کی اقتصادی زندگی کو تباہی و بربادی سے بچانا حکومت کے اہم فرائض میں سے ہے۔ اسی لئے اسلام نے اگرچہ ذرائع آمدنی "اور آمدنی" کی بہت سی شقوں میں انفرادی حق ملکیت کو تسلیم کیا ہے لیکن [illegible] کہ یہ منشاء اور خواہش ہے کہ اختیار کی یہ باگ اس قدر ڈھیلی رہنے دی جائے جس کی بدولت عام انسانی دنیا اقتصادی [illegible]

میں گرفتار ہوجائے اور صرف چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی سرمایہ دارانہ عیش پسندی کی مرضیات میں ڈوب کر خدا کی عام مخلوق ہلاکت وتباہی کے گھاٹ اتر جائے اسلام کے مایۂ ناز فلسفی شاہ ولی اللہؒ نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدن و معیشت کے فساد کی راہوں میں یہ بہت بڑی راہِ فساد ہے، لکھتے ہیں۔

"اسی طرح تمدن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ یہ امت کے مالدار، زیورات، لباس، مکانات، خورد و نوش اور عورتوں کے حسن و زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مبتلا ہوجائیں اور حاجات وضروریات سے زیادہ عیش و تنعم کی زندگی میں مشغول و منہمک رہنے لگیں"۔ [۱]

اور آخر کار نتیجہ یہ نکلے کہ :-

"لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے مثلاً ان لوگوں کے لئے جو زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کے مختلف کاموں کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور آخر کار اس شہر یا ملک کا یہ ضرر آہستہ آہستہ ایک عضو اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرایت کرتا جائے یہاں تک کہ تمام مخلوق ایک عام تباہی میں گرفتار ہوجائے"۔ [۲]

لہٰذا اسلام نے ایسے تمام ذرائع کا سدِ باب بھی ضروری سمجھا اور اس کی اصلاح کے لئے بھی مختلف قدم اٹھائے جن میں سے بعض کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہوچکا اور بعض قانونی حیثیات کا ذکر شاہ ولی اللہؒ نے ان سطور میں کیا ہے :-

"اور یہ مرض عجمی تمدن پر چھایا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس مرض کا اس طرح علاج کریں کہ اس فاسد تمدن کا مادہ ہی ہمیشہ کے لئے منقطع ہوجائے اس لئے آپ نے دیکھا کہ اس تمدن کی زیادہ تر بنیاد، مردوں کو طرح طرح کے ریشمی اور حریری لباس کی نزاکت کے ذوق، گلنے والی عورتوں کے شوق اور سونے کے زیورات

[۱] و [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ابواب من ابتغاء الرزق۔

کی دیہات، اور چمک دمک کے عشق میں سونے کا سونے کے ساتھ کمی زیادتی کے لین دین پر قائم ہے۔ لہٰذا آپ نے ان باتوں کی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی ممانعت کر دی اور حکم دیدیا کہ اس مصنوعی اور تباہ کن عیش پسندی کو ختم ہونا چاہئے اور سادہ زندگی کو اختیار کرنا چاہئے۔ [1]

زکوٰۃ تجارتی بدعنوانیوں کے انسداد کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں "اکتناز" اور "احتکار" دونوں حرام ہیں یعنی چونکہ یہی دو راہیں سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کو نشوونما کرتی ہیں اس لئے ان کا استیصال ضروری ہے احتکار کی بحث تو اپنے بعض گوشوں کے لحاظ سے صفحات گذشتہ میں آچکی اب بعض وہ احکام قابلِ ذکر ہیں جو انفرادی ملکیت کو بے قید ہونے سے روکتے اور اکتناز سے محفوظ رکھتے ہیں۔

دولت کے جمع اور ذخیرہ کی وہ تمام صورتیں جن میں دولت کی تقسیم سے انکار کیا گیا ہو اکتناز میں داخل ہیں لہٰذا اسلام کے معاشی نظام کا اعتدال اس کے مقابلہ میں یہ حکم دیتا ہے کہ دولت جمع اور ذخیرے کے لئے نہیں ہے بلکہ تقسیم اور گردش کرنے کے لئے ہے تاکہ افراد کے درمیان دولت کا توازن صحیح رہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم قانون "زکوٰۃ کا قانون" ہے اور اسی لئے اس کی ادا صرف رضاکارانہ اصول پر نہیں بلکہ قانون فرض کی شکل پر قائم ہے اور جو لوگ اس فرض کی ادا میں کوتاہی کرتے اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لئے قانونی سزا کے علاوہ آخرت کے سخت عذاب سے بھی ڈرایا گیا ہے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (توبہ)

اور جو لوگ خزانہ بناتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی اس کی زکوٰۃ و دیگر حقوق واجبہ مالیہ ادا نہیں کرتے) تو آپ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ

جس دن کہ آگ دہکائیں گے اس مال پر دوزخ کی پھر داغیں گے اس مال سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشت اور

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ (توبہ) کہا جائیگا، اب چکھو مزہ اس مال کے خزانہ کرنے کا۔

علمارِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ اور حقوقِ واجبہ ادا نہ کرنے کی وعید میں نازل ہوئی ہے اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ "ایتائے زکوٰۃ" کا ذکر قرآنِ عزیز میں بہت زیادہ ہے۔

زکوٰۃ کے لغوی معنی طہارت و پاکیزگی کے ہیں چونکہ یہ دولت کو نجس اور ناپاک سرمایہ داری سے بچاتی انسان کے دل و دماغ کو غرور و تکبر اور قارونی ذہنیت سے پاک کرتی اور اپنی محنت کی کمائی میں جماعتی حقوق کا پاک جذبہ پیدا کرتی ہے اس مناسبت سے اس کا نام "زکوٰۃ" ہے حقیقتِ زکوٰۃ دو اصول پر مبنی ہے۔

(۱) مذموم سرمایہ داری سے روکنا اور غربار کی حاجات کو پورا کرنا۔

(۲) اقتصادی فلاح کی جد و جہد کا جذبہ پیدا کرنا۔

پہلا اصول تو واضح ہے اس لئے کہ اسلام کی نظر میں ایسا شخص بھی سرمایہ دار ہے جس کے پاس صرف ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا موجود ہو یا ضروریاتِ زندگی سے فاضل ایسی اشیار موجود ہوں جنکی قیمت اسی نصاب تک پہنچ جاتی ہو چنانچہ ان اشیار پر اگر ایک سال گذر جائے تو مالکِ اشیار سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اجتماعی حقوق کی تکمیل کے لئے چالیسواں حصہ "زکوٰۃ" کے نام سے سرکاری بیت المال میں داخل کرے۔

اسلام نے ادائے زکوٰۃ کو "فرض" قرار دے کر درحقیقت صاحبِ ثروت اور نادار انسانوں کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کر دیا ہے کہ اگر مسلمان بحیثیت جماعت اس فرض کو پورا کریں

---

[۱] انسان جب خدائے تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کا قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہے اس لئے ایمان میں تازگی، روح میں پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی قربت کے لئے زکوٰۃ کو فرض کیا گیا جو درحقیقت ابتلا بانعام اور عطائے نعمت پر شکرِ الٰہی کا مظہر ہے نماز اگر بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ مالی عبادت ایک شخص کی بدنی عبادت کا معاملہ اگر خلوص و صداقت پر مبنی ہے تو مالی عبادت اس کے لئے صحیح کسوٹی ہے تاکہ معلوم ہو اس عمل کا ثابت نہ ہو۔

گر زر طلبی سخن درین است گر جان طلبی مضائقہ نیست

تو ایک جانب مذموم اور مطلق العنان سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے اور دوسری جانب فاقہ مست اور خانماں برباد فقراء و مساکین کا وجود باقی نہ رہے اور دنیائے انسانی کی تمام زندگی میں ایسا اعتدال پیدا ہو جائے کہ موجودہ طبقاتی جنگ اور معاشی رقابت کے نام سے گروہ بندی مفقود ہو کر رہ جائے جیسا کہ خلافت راشدہ خصوصاً دورِ صدیقی و فاروقی کی روشن تاریخ شاہد عدل ہے۔

یمن کے باشندے جب نورِ اسلام کی روشنی سے منور ہو کر مشرف باسلام ہو گئے تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) کو ان پر والی اور معلم بنا کر بھیجا اور ان کو وصیت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

کہ تمہارا سابقہ اہل کتاب (یہود) سے پڑے گا۔ تم اول ان کو شہادتین "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تلقین کرنا اور جب وہ قبول کر لیں تو پنج وقت کی نماز کی فرضیت کی تلقین کرنا اور جب وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تب ان سے کہنا کہ اللہ تعالے نے تمہارے مال پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے زکوٰۃ کیوں فرض ہے اور اس کی کیا حکمت و مصلحت ہے تو ان کو بتلانا کہ یہ لے کر

تو خذ من اغنیاءھم فترد — ان کے اہل ثروت سے لی جائیگی اور ان کے فقراء پر
الی فقراءھم [1] — تقسیم کر دی جائے گی۔

یہ پُر از حکمت جملۂ مبارک دراصل "زکوٰۃ" کی حقیقت کا ترجمان ہے اور جانِ حکمت بن کر اعلان کرتا ہے کہ صاحبِ ثروت و دولت کو ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ دولت تنہا اس کی اپنی ملکیت ہے اس لئے کہ یہ خدا کا فضل ہے جس کے لئے اس کو منتخب کیا گیا لہٰذا اس کا بھی فرض ہے کہ وہ اس حقیقتِ حال کو کبھی فراموش نہ کرے کہ جو جس قدر کماتا ہے اسی قدر اس پر اجتماعی حقوق کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے" اور جو اس حقیقت کا منکر ہو کر غرور اور تکبر سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی اپنی محنت کی کمائی عطاءِ الٰہی نہیں بلکہ اس کی عقل و محنت کا ثمرہ ہے تو وہ خدا کے برتری دی ہوئی نعمت کا کفران کرتا اور اس طرح تاریخ ماضی سے آنکھیں بند کر کے گویا خدا کے عذاب و عتاب کو چیلنج کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کا واقعہ تاریخ کی نگاہ میں کل کا واقعہ ہے۔ حضرت

---

[1] بخاری ج کتاب الزکوٰۃ۔

موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم نے جب قارون جیسے سرمایہ دار کیپٹلسٹ، کو اس کا یہی فرض رکوٰۃ یاد دلایا تو اس نے نہایت غرور و تمکنت سے اس کے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى	قارون، موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا، پس وہ ان کے مقابلہ
فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ	میں اترانے اور شرارت کرنے لگا باوجودیکہ ہم نے اس
مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ	کو دولت کے اتنے خزانے بخشے تھے کہ اس کے کنجیوں کے بوجھ
اُولِى الْقُوَّةِ ۔	سے طاقتور مزدور بھی تھک جاتے تھے (یا اس کی کنجیوں
(القصص)	کے نقل و حمل سے مضبوط مزدور بھی تھک جاتے تھے)

قارون کی قوم نے خدا کی نعمتیں یاد دلاتے اور فساد و تکبّر سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے قارون سے جب یہ کہا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ	جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ شیخی نہ کر۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ
لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ وَابْتَغِ فِيْمَآ	شیخی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ
اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا	تجھ کو دیا ہے اس کے ذریعہ سے آخرت کا سامان کر اور
تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا	اس کو نہ بھول کر دنیا میں تجھے کیا کچھ ملا ہے اور لوگوں
وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ	کے ساتھ اسی طرح بھلائی کر جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر
وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ اِنَّ	بھلائی کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور زمین میں فساد
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۔	کا خواہش مند نہ بن، اللہ تعالیٰ مفسدوں کو ناپسند
(القصص)	کرتا ہے۔

تو قارون نے جواب دیا

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ	یہ مال تو مجھ کو میرے اس ہنر کی بدولت ملا ہے جس کا میں واقف کار ہوں
عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِیْ	(یعنی میری سرمایہ داری میری قابلیت و ہنرمندی کا نتیجہ ہے نہ کہ خدا کا
(القصص)	عطیہ اس صورت میں دوسروں کو اس میں شریک نہیں کر سکتا)

قارعین کی قوم اور قارون کے سوال و جواب کے بعد اللہ تعالیٰ اس غافل، سرکش اور مغرور انسان کو اس کے زعمِ باطل پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے حکیمانہ انداز میں کتاب کائنات کے ان صفحات کی جانب پُر زور توجہ دلاتی ہے جن پر اقوام ماضی کے مغرور، سرکش اور صاحب نخوت و قوت افراد و اقوام کے نتائج بد منقوش و مکتوب ہیں اور جو بلاشبہ صاحب بصیرت کے لئے صد ہزار سرمایہ عبرت و موعظت ہیں چنانچہ وہ اسلوب حکیم، اعجاز بلاغت و فصاحت اور علی الاطلاق قاہرانہ قدرت کے ساتھ کہتا ہے۔

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ	کیا اس کے علم میں یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ ایسی
مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ	کتنی ہی جماعتیں تباہ کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت والی
أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا ؕ (قصص)	اور سرمایہ دار تھیں۔

اور جب اس نے اس عبرت و بصیرت پر بھی کان نہ دھرا اور صفحات عالم کے ان ابھرے ہوئے نقوشِ ماضی سے بھی سبق حاصل نہ کیا تو آخر کار سنت اللہ کے ہمہ گیر قانون گرفت نے اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو اگلوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ	پس ہم نے اس کو اور اس کے خانۂ دولت کو تہ زمین دھنسا دیا
فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ	پھر کوئی جماعت اسکی مدد کے لئے سامنے نہ آئی جو اللہ کے مقابلہ
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ	میں ہوتی اور نہ وہ خود مدد لا سکا یعنی خدا کا انقلابی ہاتھ
الْمُنْتَصِرِينَ (قصص)	جب ایسے سرمایہ داروں کو ہلاک کرتا ہے تو پھر کوئی نصرت
	مددان کو نہیں بچا سکتی

اسی طرح ادائے صدقات و زکوٰۃ کے اہم "فرض" اور نظامِ معاشی کے اس بنیادی اصول سے غفلت برتنے والوں کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے سورۂ براءۃ میں سخت وعید کا اعلان سنایا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ	اے ایمان والو اہل کتاب کے بہت سے عالم اور درویش
الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ	لوگوں کے مال ناحق کھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں

النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (توبہ)[۱]

اور جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ بناتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوشخبری سنا دے دردناک عذاب کی۔

یہاں ادائے فرض کا نام "انفاق فی سبیل اللہ" رکھا اور اس سے غفلت برتنے والے دولتمند کی دولت کو "کنز" بتلاکر متنبہ فرمایا کہ یہی وہ سرمایہ داری ہے جو اسلام میں قابلِ لعنت ہے اور خدا کی عام مخلوق میں اقتصادی تباہی کا باعث بنتی ہے آخر انسان، ثروت و دولت کے نشہ میں اس درجہ کیوں غافل ہے اور اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے کہ اس نے اپنی عقل و محنت سے ہی اگر دولت کمائی ہے تب بھی انسانوں کے باہمی تعاون و مواسات سے ہی کمائی ہے ورنہ تو بغیر دوسرے انسانوں کے تعاون و اشتراک کے اس کو تجارت یا صنعت و حرفت وغیرہ میں کامیابی ناممکن تھی بس کیا اس کا یہ فرض نہیں ہے کہ اگر انہی انسانوں میں سے بعض انسان، مرض، اعضاء کی کمزوری ضعفِ پیری یا دوسرے نامساعد اسباب کی بناء پر افلاس اور احتیاج تک پہنچ جائیں تو یہ ان کی مدد کرے اور اس کے مال میں ان کا حصہ محض تبرع اور احسان کے طور پر نہ ہو بلکہ "فرض" کی حیثیت میں ہو، زکوٰۃ مسلمانوں کو اقتصادی جد و جہد میں فلاح و بہبود کی راہ دکھلاتی ہے اس اصول کی تشریح یہ ہے کہ جو کاہل اور ہمت کی بنا پر بیکاری کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور تھوڑی بہت پونجی

[۱] صحیح حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں کو بہت شاق گذرا اور انھوں نے خیال کیا کہ شاید مردت کے لئے معمولی پس انداز کرنا بھی اس کے تحت میں آتا ہے یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کام کو میں انجام دونگا اور اس مشکل کو میں حل کردوں گا چنانچہ انھوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صرف اسلئے فرض کیا ہے کہ تمہارے باقی مال کو زکوٰۃ کے ذریعہ پاک کر دے یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ اجتماعی حقوق ادا کرنے کے بعد اس کے پاس اپنی ضرورت کے لئے جو بھی اندوختہ ہو وہ بھی کنز میں داخل ہو حضرت عمرؓ نے جب زبان مبارک سے یہ سنا تو بہت مسرور ہو کہ اللہ اکبر کا نعرہ لگایا (ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ)

رکھنے کے باوجود ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کے خوگر ہیں یہ اجتماعی ٹیکس ان کے لئے مہمیز کا کام دے اور وہ یہ سوچیں کہ ہمارا یہ مال جس کو قدرت نے نشوونما کی صلاحیت دی ہے ایسا نہ ہو کہ دو چار سال میں ذاتی ضروریات اور "زکوٰۃ" کی نذر ہو کر رہ جائے اور بمصداق حدیث:۔

الید العلیا خیر من الید السفلی (دینے والے کا) بلند ہاتھ (لینے والے کے) پست ہاتھ سے بہتر ہے۔ دوسروں کی طرح ہمیں بھی ایک روز غیر کا دست نگر نہ بننا پڑے یہ سوچ کر وہ آگے بڑھیں اور ترقی مال کے لئے جائز سعی کریں اور اس طرح ہر شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بن جائے یہاں تک کہ یہ اجتماعی ٹیکس ایک روز صرف "رفاہِ عام" ہی کی ضروریات کے لئے رہ جائے، اور ہر جگہ دینے والے ہاتھ ہی باقی رہ جائیں اور مانگنے والا ہاتھ ایک بھی باقی نہ رہے۔

فرضیت زکوٰۃ میں اسلام نے کن مصالح کا لحاظ رکھا ہے فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ زکوٰۃ میں دو مصلحتوں کی رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے (۱) تہذیب نفس (۲) ملی واجتماعی حاجات کا انسداد تہذیب نفس سے مراد یہ ہے کہ "مال" بخل، خود غرضی جنسی عداوت جنسی بد اخلاقیاں، پیدا کرتا ہے اور ان بد اخلاقیوں کے انسداد کا بہترین علاج "انفاق یعنی حبۃ اللہ صرفِ مال" اور سخاوت ہے اس سے بخل کا خاتمہ ہو جاتا ہے خود غرضی مٹ جاتی ہے اور عداوت جنسی کی بجائے برادرانہ محبت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی جنسی محبت ان تمام اخلاق کریمانہ کی اساس و بنیاد ہے جو انسان کو حسنِ معاملات کا خوگر بناتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "انسان" اخلاق حسنہ کا پیکر بن جاتا ہے اور اسی کا نام تہذیب نفس ہے اور زکوٰۃ، مدنی و اجتماعی حاجات کے انسداد کا بہترین علاج ہے اس لئے کہ نظامِ مدنی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس نظام میں مضبوط "مالی نظام" موجود نہ ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے مدنی نظام کے اعلےٰ و ادنیٰ عمال اور رعایا "پبلک" کے مناسبِ حال حاجات و ضروریات کو پورا کیا جا سکے نیز فقراء، مساکین، ضعفاء، یتامیٰ، بیوگان اور اسی قسم کے دیگر حاجت مند دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور ذلیل و رسوا ہونے سے

محفوظ رہیں اور حکومت ان کی پوری کفالت کرسکے اور یہ تمام مشترک ذمہ داریاں اسی طرح پوری ہوسکتی ہیں کہ بجملہ دیگر ذرائع آمدنی کے حکومت کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ اہلِ سرمایہ سے حصولِ زکوٰۃ کی شکل میں حاصل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ فطرت و عقلِ سلیم کے تقاضہ کے مطابق اسلام نے اس ٹیکس کو چار اصناف میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) اس مال سے زکوٰۃ لی جائے جس میں نمو اور ترقی کی استعداد ہو۔ اور اس کی تین قسمیں ہیں (و) وہ جانور جو چراگاہوں میں اضافہ نسل کے لئے پالے جاتے ہوں (ب) غلہ (ج) تجارت۔

(۲) ان اشخاص سے لی جائے جو شریعت کی نگاہ میں اہلِ سرمایہ شمار ہوتے ہیں جن کو قرآن عزیز میں "الذین یکنزون الذھب والفضۃ" کہکر پکارا گیا ہے (یعنی نقد سونا یا چاندی رکھنے والے۔

(۳) ان اموال میں لی جائے جو لوگوں کو بغیر محنت و تعب کے آسانی سے حاصل ہو گئے ہوں مثلاً خزانوں کی دریافت یا جواہرات کی دریافت میں وہ اپنا مقررہ حصہ پائیں۔

(۴) اہلِ صنعت و حرفت کی صنعت و حرفت پر مقرر کی جائے۔

پھر اسلام نے موسمی حالات، اتفاقی حادثات، عام معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے لئے ایک مدت[ٹ] معین کی، مقدار معین[ا] کی، نیز ضروریات و حاجات عامہ کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا اس تفصیل سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام نے اپنے فریضہ میں مدنی و اجتماعی اور اقتصادی حالات کی بہتری کا کس قدر خیال رکھا ہے بلکہ اس کی بنیاد ہی صرف دو امور پر قائم کی انفرادی تہذیبِ نفس اور اجتماعی؛ اقتصادی فلاح و بہبود[۲]۔

دنیا کے تمام سچے مذاہب اگرچہ ابناءِ جنس کی خدمت اور حاجتمندوں کی اعانت کی ترغیب

ٹ حولانِ حول یعنی ایک سال پورا ہوجانا ضروری ہے تاکہ مختلف موسموں اور حوادث کے گزر جانے کے بعد جو بچت ہو اسی پر زکوٰۃ لی جائے اور یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔ [ا] چاندی ۵۲ ۱/۲ تولہ سونا ۷ ۱/۲ [۲] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ مختصراً ابواب زکوٰۃ۔

تعلیم دیتے ہیں، لیکن یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے محض تلقین و تعلیم ہی نہیں کی بلکہ اسکے ساتھ ہی ایک سالانہ ٹیکس کا آئین قائم کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرے اور اس کو اس درجہ اہم قرار دیا کہ نماز کے بعد اس کا ہی درجہ رکھا گیا اور قرآن عزیز میں دونوں کو ایک ہی فہرست میں گنا کر اس کو بھی ایمان کی علامت قرار دیا

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ۔ (نمل)

ہدایت اور بشارت کا پیغام ہے ان کے لئے جو مومن ہیں کہ جن کے ایمان کی علامت یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

اسی لئے مانعین زکوٰۃ کے بارہ میں صحابہؓ کے عظیم الشان مجمع میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا اور جمہور صحابہؓ نے اس پر صاد کیا۔

وَاللّٰهِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ۔ (بخاری)

بخدا میں ضرور ان سے جہاد کرونگا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرتے ہیں یعنی نماز تو پڑھتے ہیں مگر زکوٰۃ دینے پر آمادہ نہیں۔

نیز اس بارہ میں اسلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فرضیتِ زکوٰۃ کی علت کو ان صاف الفاظ میں بیان کر کے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔

تاکہ یہ نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں کے گروہ ہی میں محدود ہو کر رہ جائے

یہ بھی بتایا کہ معاشی وسائل میں اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ دولت سب میں تقسیم ہوتی رہے اور کسی ایک گروہ کی اجارہ داری میں ہو کر ہی نہ رہ جائے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کے پیش نظر حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی اور معلم بنا کر ارکانِ اسلام کی وصیت فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔

تؤخذ من اغنیاءھم و ترد الی فقراءھم

زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ) اُنکے مالداروں سے وصول کی جائے اور ان کے محتاجوں پر تقسیم کر دی جائے

غرض "زکوٰۃ" عام خیرات کی طرح نہیں ہے بلکہ وہ سرکاری انکم ٹیکس کی طرح ایک "ٹیکس" ہے جو موجودہ ٹیکسوں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے یعنی وہ صرف کاروبار کی آمدنی کی کمی و بیشی ہی پر واجب نہیں ہوتا بلکہ اس اندوختہ پر واجب ہوتا ہے جس پر سال موجودہ میں کسی آمدنی کا اضافہ تک نہ ہوا ہو بشرطیکہ اس میں نمو (بڑھنے کی استعداد) موجود ہو۔

بہرحال زکوٰۃ، اجتماعی معاشی نظام کا ایک خاص اور اہم مالی جزء ہے اسی لئے اس کے وصول کرنے کا حقیقی اور اصولی طریقہ حکومت کے نظم و انتظام کے ساتھ وابستہ کیا گیا اور اس کی تحصیل کا معاملہ حکومت کے ہاتھ میں دیا گیا ہے یعنی حکومت اپنے گورنروں اور تحصیلداروں کے ذریعہ اس کو وصول کرے اور بیت المال میں داخل کر کے اس کے صحیح مصارف پر خرچ کرے۔

عن ابن عمر ادفعوا الزکوٰۃ الی الامراءُ فقال له رجل انهم لا یضعونها مواضعها فقال وان "وقال ابن عمر قال ما اقاموا الصلوٰۃ تادفعوها الیهم۔ لہ

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فرمان ہے کہ زکوٰۃ امراء کو ادا کرو۔ ایک شخص نے کہا کہ امراء و خلفاء تو اس کو صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے، آپ نے جواب دیا۔ "اس کے بعد بھی ان کو ہی ادا کرو" "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تک خلفاء نماز ادا کرتے رہیں تم انہی کو زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔"

ابو صالح کہتے ہیں میں نے سعد بن ابی وقاص، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ یہ حاکم جو بے عنوانیاں کر رہے ہیں آپ کے پیش نظر ہیں کیا ایسی حالت میں بھی ہم انہی کو زکوٰۃ ادا کریں سب نے متفق آواز سے کہا کہ ضرور ان ہی کو ادا کرو اس لئے کہ اجتماعی زندگی کے لئے بھی از بس ضروری ہے۔ سلہ

امام حدیث و فقہ ابو بکر جصاص حنفی احکام القرآن میں مصارف زکوٰۃ کی اس بحث میں کہ جو صدقہ واجب ہے وہ امام ہی کے حوالے کیا جائے وہ غیر مسلم پر خرچ نہیں کیا جا سکتا ایک اعتراض

لہ ابوداؤد مصنف ابن ابی شیبہ، بیہقی۔

کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فان قیل فزکوۃ المال لیس
یأخذھا الی الامام ولا یجوز له ان یطالب
اھل العامۃ قیل اخذھا فی
الاصل الی الامام وقد کان النبی
صلے اللہ علیہ وسلم یأخذھا و
کذلک ابوبکرؓ وعمرؓ فلما کان عثمانؓ
قال للناس ان ھذا اشھر زکاتکم
فمن کان علیه دین فلیؤدہ ثم لیزک
بقیۃ مالہ فجعل ارباب الاموال
وکلاء لہ فی ادائھا ولم یسقط فی
ذلک حق الامام فی اخذھا لہ ؎

اگر یہ کہا جائے کہ اموال (باطنہ) کی زکوٰۃ پر امام کا یہ حق نہیں ہے
کہ خود وہ اسی کے ہی حوالے کی جائے اور پھر اس کو ذی کو زکوٰۃ عام مسلم
معاملہ پر خرچ کرنا جائز نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل
قانون شریعت میں اموال باطنہ کے لئے بھی یہی ضروری
ہے کہ امام (خلیفہ) کو دی جائے اور اس کی وصولیابی امام ہی
کا حق ہے چنانچہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ
عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ برابر وصول فرماتے تھے جب
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے فرمایا لوگو
یہ زکوٰۃ کا مہینہ ہے پس جس شخص پر تم میں سے قرض ہو پہلے وہ قرض کو
ادا کرے اور اس کے بعد باقی مال کی زکوٰۃ ادا کرے تو اس اعلان
کا یہ ہے کہ جب اموال اسلام کی جانب سے ادائے زکوٰۃ میں وکیل قرار
پائے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اموال باطنہ پر امام کا یہ حق
جاتا رہا کہ وہ خود وصول کرے۔

لہٰذا زکوٰۃ کا موجودہ طریقہ ادا اور طریقۂ وصول ان ہی مجبوریوں کی ایک کڑی ہے جو اسلامی نظام
امارت کے فقدان سے پیدا ہوتی ہیں اور جس کا رفع کرنا ہر مسلمان کا دینی و مذہبی فریضہ ہے اس لئے کہ اگر
ہندوستان میں اسلامی حکومت کا وجود مسلمانوں کی بدبختی و بدقسمتی سے باقی نہیں رہا تھا تو یہ ہر وقت
مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا کہ وہ بیت المال کے قیام اور اجتماعی مذہبی امور کے انتظام کے لئے
اپنا ایک امیر مقرر کر لیتے مگر افسوس کہ ہندوستان میں یہ اسلامی فریضہ اس وقت تک شرمندۂ معنی نہیں ہے۔
یہ واقعہ ہے کہ افراد کی تجارتیں اور ان کی فیاضیاں وقتی طور پر کتنی ہی بیش از بیش کیوں نہ ہوں ملت
اور قوم کے اجتماعی نظام کی تکمیل کو ہرگز ہرگز پورا نہیں کر سکتیں کیونکہ اگر سرمایہ دار اور مالدار افراد کے

؎ بدائع ج ۲ ص ۳۶

عطیات اور انجمنوں کے قیام و نظام سے اقتصادی مسئلہ حل ہو سکتا تو امریکہ اور یورپ میں کبھی کا حل ہو گیا ہوتا جہاں دولت مندوں کی دولت کے بے شمار انبار ہیں اور جنہیں قومی نظام کے لئے انجمن سازی کا بہتر سے بہتر شعور ہے مگر حقیقت سامنے ہے کہ ان کا قومی نظام اور قومی سرمایہ کسی طرح بھی پست و متوسط طبقوں کی بیکاری اور افلاس کا انسداد نہ کر سکا اور نہ عملی طور پر اس کا کوئی حل سوچ سکا

پس اس صورتِ حال کا اگر کوئی بہترین اور صحیح علاج ہو سکتا ہے تو وہ وہی ہے جس کو اسلام نے تجویز کیا کہ قانون کے ذریعہ متمول افرادِ قوم کی پوری کمائی کا ایک معین حصہ کمزور اور پست افراد کی اجتماعی اور اقتصادی بہتری کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی کا نام "زکوٰۃ" ہے۔

صدقات واجبہ

زکوٰۃ کے علاوہ "صدقات" کی اسلامی اصطلاح اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اسلام متمولین سے "زکوٰۃ" لینے کے بعد بھی اس کو قومی و اجتماعی انفاق کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ انفاق کے لئے دوسری راہیں کھولتا اور ان کو صدقات سے تعبیر کرتا ہے

"صدقات" کی دو نوع ہیں ایک "نافلہ" اور دوسری "واجبہ" پہلی نوع کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے کہ وہ حسبِ مرضی جس کارِ خیر میں چاہے حصہ لے اور دوسری نوع پھر دو حصوں پر منقسم ہے ایک انفرادی یعنی کسی متمول فرد کا کسی حاجت مند کی حاجت روائی بذاتِ خود خرچ کرنا مثلاً صدقۃ الفطر، غریب والدین کا نفقہ، غریب اولاد کا نفقہ، پس اگر کوئی شخص اس انفرادی انفاق میں کوتاہی کرتا ہے تو امام کو حق حاصل ہے کہ اس کو اس انفاق کے لئے مجبور کرے دوسرا اجتماعی یعنی زکوٰۃ کی طرح قوم کی اجتماعی اقتصادی حالت کی بہتری اور حاجتمندوں کی حاجت کے انسداد کے لئے بذریعہ حکومت خرچ کرنا مثلاً جہاد اور رفاہِ عام کے اہم مواقع پر زکوٰۃ "عشر" اور "خراج" کے علاوہ اربابِ دولت و ثروت سے حسبِ تقاضا حقوقِ اجتماعی وصول کرنا

دولت و سرمایہ پر زکوٰۃ کے علاوہ حقوق واجبہ کا مطالبہ

اس مقام پر یہ بحث بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ زکوٰۃ، عشر، اور خراج کے علاوہ بھی کیا مال پر مزید حقوق واجبہ ہیں؟ بعض علماء نے اس کا جواب نفی میں دیا ہے مگر یہ ان کے قلتِ فکر و تدبر کا نتیجہ ہے اس لئے علماء محققین کا مسلک یہ ہے کہ بلاشبہ

زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال پر حقوقِ واجبہ ہیں اور ان کا وجوب اس حد تک اہمیت پذیر ہے کہ اگر کوئی شخص ان حقوقِ واجبہ سے گریز کرے تو بلا تأمل امام اس کو ان حقوق پر مجبور کر سکتا ہے۔

مغرب (اندلس) کے مشہور محدث وفقیہ ابو محمد بن حزمؒ نے ——— کہ جن کو بعض علماء نے قرنِ خامس کا مجدد کہا ہے ——— اس مسئلہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے۔ بلکہ نفقاتِ نوافل و فرائض پر بحث کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں قرآنِ حکیم اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں اسلام کے معاشی نظام کا ایسا نقشہ پیش کیا ہے کہ موجودہ دورِ ترقی کے معقول نظامہائے اقتصادی کی علمی تحقیقی مباحث سے قطع نظر ان کے عملی ثمرات ونتائج اور علمی پہلوؤں کے نقطہائے نظر اس نقشہ سے بہتر معاشی حل پیش کرنے سے عاجز نظر آتے ہیں۔

ابن حزمؒ نے دو ورق میں جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ اپنی تفصیل وتفسیر میں ضخیم جلدوں کا محتاج ہے تاہم اس مقام پر شرح وبسط سے گریز کرتے ہوئے حرف بحرف اس کا ترجمہ پیش کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ اہلِ بصیرت اور دقیقہ رس حضرات کے لئے اس مختصر متن ہی میں "معاشی حل کے لئے" وہ سب کچھ موجود ہے جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے

ابنِ حزم اپنی شہرۂ آفاق کتاب المحلّی میں تحریر فرماتے ہیں:-

(مسألة) قال ابو محمد: وفرض على الاغنياء من اهل كل بلد ان يقوموا بفقرائهم ويجبرهم السلطان على ذلك، ان لم تقم الزكوات بهم ولا في سائر اموال المسلمين بهم، فيقام لهم بما يأكلون من القوت الذي لا بد منه ومن اللباس للشتاء والصيف بمثل ذلك وبمسكن يكنهم من المطر والصيف والشمس وعيون المارة

برهان ذلك قول الله تعالى (وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل) وقال تعالى (وبالوالدين احسانا وبذي القربى واليتامى والمساكين والجار ذي القربى والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت ايمانكم)

فاوجب تعالیٰ حق للمساکین وابن السبیل وما ملکت الیمین مع حق ذی القربیٰ و افترض الاحسان الی الابوین وذی القربیٰ والمساکین والجار وما ملکت الیمین والاحسان تقتضی کل ما ذکرنا ومنعہ اساءۃ بلا شک الخ

اور ہر ایک شہر کے ارباب دولت پر فرض ہے کہ وہ فقرا اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کا سامان کریں اور اگر نہ کریں، تو ان کو اس ادائیگی فرض پر سلطان اسلام مجبور کر سکتا ہے اور اگر زکوٰۃ اور فَیٔ و اموال بیت المال ان کی کفالت کے لئے کافی نہ ہوں

پس ایسی صورت میں اُن کی ضروریات کی کفالت سے متعلق از بس ضروری ہے کہ بقائے حیات کے لئے خورد و نوش، گرمی اور سردی کے موسموں کے مناسب لباس، رہنے سہنے کے لئے ایسے مکان کا انتظام ہر فرد کے لئے مہیا کیا جائے جو بارش دھوپ، تپش اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔

ارباب دولت کے اس فرض کے عائد ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے۔" اور قرابت والوں کو اور مسکین اور مسافر کو اُن کا حق دو" نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی لائق بیان ہے" اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور قرابت والوں، یتیموں مسکینوں قرابتی ہمسائیوں، اجنبی پڑوسیوں دوستوں مسافروں اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

پس یہ آیات ہیں جن سے ثابت ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دولتمندوں پر مساکین مسافروں اور افراد ملک یمین کا حق واجب مقرر فرمایا ہے اور ساتھ ہی قرابت والوں کا حق بھی اور والدین کے اور اہل قرابت مساکین ہمسایہ، اور افراد ملک یمین کے ساتھ حسن سلوک کو فرض کیا اور احسان کا اولین تقاضہ ان حقوق کی ادائیگی ہے جن کو ہم نے ابھی خوراک لباس اور مکان کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو شخص ان حقوق کے ادائے فرض سے باز رہتا ہے وہ گناہ کا مرتکب ہے۔

اور اللہ تعالٰے نے ارشاد فرمایا (مَا سَلَکَکُمْ فِی سَقَرَ ؟ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ) (اہل جنت دریافت کریں گے) تم کو جہنم تک کس عمل نے پہنچایا تو جہنمی کہیں گے اس بات نے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین اور حاجتمند کی ضروریات خورد ونوش کو پورا نہیں کرتے تھے۔

پس اس مقام پر اللہ تعالٰے نے مسکین کے خورد ونوش کی کفالت کو نماز کی وصیت کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ غایت صحت بہت سے طریقہائے روایت سے یہ منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ۔ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔ اللہ تعالٰی اس پر رحم نہیں فرماتا۔

میں کہتا ہوں کہ جو شخص مالدار ہو اور وہ مسلمان بھائی کو بھوکا ننگا دیکھے اور اس کی امداد نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس نے اس بھائی پر قطعاً رحم نہیں کیا اور یہ حدیث بہت پختہ ہے کیونکہ اس کو نافع بن جبیر بن مطعم اور قیس بن ابی حازم اور ابوظبیان اور زید بن وہب نے حضرت جریر بن عبداللہ (جلیل القدر صحابی) سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے[۱] اور زہری نے بھی اس مطلب کی حدیث ابوسلمہ سے عن ابی ہریرہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔[۲]

اور مجھ سے عبدالرحمن بن عبداللہ بن خالد نے بسلسلہ سند حضرت عبدالرحمن بن ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کی ہے " کہ اصحاب صفہ حاجتمند لوگ تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ جس شخص کے یہاں دو آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ ان میں سے کسی کو تیسرا بنا کر شریک طعام کرے اور جس کے یہاں چار آدمیوں کا کھانا موجود ہو وہ پانچویں اور چھٹے کو شریک طعام کرے۔

پس ہم اسی ارشاد کے حرف بہ حرف قائل ہیں۔

---

[۱] مسلم [۲] بخاری " من لا یرحم لا یرحم "

اور بطریق لیث بن سعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے
کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " والمسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ"
ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لئے چاہئے کہ نہ مسلمان مسلمان پر ظلم کرے
اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑے۔

ابو محمد (ابن حزم) کہتا ہے کہ اگر ایک شخص ننگا بھوکا ہے اور دوسرا شخص اس کو کھلانے
پہنانے پر قادر ہے اور پھر اسی حالت میں اس کو چھوڑتا ہے تو بلا شبہ اس نے حدیث کے
فرمان "لا یسلمہ" کی خلاف ورزی کی اور اس کو بے مدد چھوڑ دیا۔

مجھ سے عبداللہ بن یوسف نے بہ سلسلہ سند حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ)
یہ حدیث بیان کی ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من کان معہ
فضل ظہر فلیعد بہ علی من لا ظہر لہ ومن کان لہ فضل من زاد فلیعد بہ علی
من لا زاد لہ قال: فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رأینا انہ لا حق لاحد منا فی فضل۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس ضرورت سے فاضل سواری ہو
اس کو چاہئے کہ جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دیدے
اور جس کے پاس اپنی اصل حاجت سے زائد زاد خورد و نوش وغیرہ کا سامان ہو اس کو چاہئے
کہ وہ اس شخص کو دیدے جس کے پاس سامان خورد نوش نہیں۔ حضرت ابو سعید فرماتے ہیں کہ آپ
مختلف اقسام اموال کو شمار کر کے اسی طرح فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ حاجت سے زائد
مال پر ہمارا اپنا کوئی حق نہیں ہے (بلکہ وہ جماعت کے ان دوسرے افراد کا حق ہے جو اس کے
محتاج ہیں)

میں کہتا ہوں کہ یہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا اجماع ہے جس کی اطلاع حضرت ابو سعید رضی
اللہ عنہ دے رہے ہیں اور اس حدیث میں جو حکم ہے ہم اس کے حرف بحرف قائل ہیں

اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی سند سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے

اطعموا الجائع وفکوا العانی" (بھوکے کو کھلاؤ کھلاؤ اور قیدی کو رہائی دلاؤ)

غرض نصوص قرآنی اور احادیث صحیحہ اس بارہ میں بکثرت موجود ہیں۔

اور عبدالرحمن بن مہدی کے سلسلۂ سند سے ہم کو یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین جو بات مجھ کو بعد میں معلوم ہوئی اگر پہلے سے معلوم ہوتی تو دولتمندوں کی فاضل دولت کو ان سے لے کر فقراء مہاجرین پر تقسیم کر دیتا اور اس روایت کی سند اپنی صحت اور رفعت کے لحاظ سے بہت رفیع المرتبہ ہے" وهذا اسناد فی غایة الصحة والجلالة"

اور سعید بن منصور کے سلسلۂ سند سے مجھ کو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پہنچی ہے کہ وہ فرماتے تھے" ان الله تعالی فرض علی الاغنیاء فی اموالهم بقدر ما یکفی فقراءهم فان جاعوا او عروا او جهدوا فبمنع الاغنیاء وحق علی الله تعالی ان یحاسبهم یوم القیمة ویعذبهم علیه" بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب دولت و ثروت پر اس قدر مال کی ادائیگی کو فرض قرار دیا ہے جو ان کے فقراء اور حاجتمندوں کی حاجت کی کفالت کر سکے۔ پس اگر لوگ بھوکے اور ننگے اور تکالیف و شدائد میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اصحاب دولت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ قیامت میں اُن سے اس عدم ادائیگی فرض پر محاسبہ اور عذاب میں مبتلا کرے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے فی مالك حق سوی الزکوة تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

اور حضرت عائشہ ام المؤمنین، حسن بن علی، ابن عمر رضی اللہ عنہم سے جب کوئی اس سلسلہ میں سوال کرتا تو فرماتے

ان کنت تسأل فی دم موجع، او غرم مفظع او فقر مدقع فقد

وجیب حقلت۔ اگر تو اس حالت میں سوال کرے کہ دردناک خون کا معاملہ ہے یا ناقابل برداشت تاوان کا اور یا مہلک فقر و فاقہ کا معاملہ ہے تو اصحاب دولت پر تیرا حق واجب اور فرض ہو گیا۔ (جس کی ادا ان کے ذمے لازم ہے)

اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور ان کے رفقا تین سو صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے بسلسلہ صحت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان ذاد ھو فنی فامرھم ابوعبیدۃ فجمعوا ازوادھم فی مزودین وجعل یقوتھم ایاھا علی السواء جب مجاہدین کی اس جماعت کے پاس کھانے پینے کا سامان قریب بختم ہو گیا۔ تب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جس قدر سامان خورد و نوش باقی ہے وہ میرے پاس لائے اور جب سب جمع ہو گیا تو بغیر لحاظ کمی و بیشی اس کو سب پر یکساں تقسیم کر دیا یعنی جن حضرات کے پاس بالکل نہیں رہا تھا اور جس کے پاس کم تھا اور جس کے پاس قدرے زائد تھا ان سب کے درمیان مساوی تقسیم فرما دیا پس یہ جلیل القدر صحابہؓ کا اجماع ہے جس کے خلاف ایک رائے بھی نہیں ہے۔

اور مشہور تابعین شعبیؒ مجاہدؒ طاؤسؒ وغیرہ سے منقول ہے کہ وہ باتفاق اس کے قائل تھے کہ "فی المال حق سوی الزکوٰۃ" کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق مفروض ہے

میں کہتا ہوں کہ ان حضرات اہل علم میں سے بجز ضحاک بن مزاحم کے علاوہ کسی کو اس کا مخالف نہیں پایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اور حقوق مال ہیں جو فرض و وجوب کا درجہ رکھتے ہیں البتہ تنہا ضحاک یہ کہتے ہیں کہ فرضیت زکوٰۃ نے مال سے باقی حقوق واجبہ کو منسوخ کر دیا اور ضحاک کی رائے تو کیا حجت ہوتی ان کی روایت بھی حجت نہیں ہے اس لئے کہ اس دلیل کے قائل خود دلیل کے خلاف اپنا مسلک رکھتے ہیں اور فرضیت زکوٰۃ کے علاوہ اس کے قائل ہیں کہ مال دار کے مال میں قریب والدین کا نفقہ، زوجہ کا نفقہ، غلام کا نفقہ، پالتو حیوان کی خورد و نوش اور قرض و تاوان کی ادا یہ سب حقوق و فرائض ہیں اس لئے ان کی روایت اور رائے دونوں میں تناقض و تضاد پایا جاتا ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ابن ابی شیبہ کے سلسلۂ سند سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے تم یہ نقل کرتے ہو کہ انھوں نے فرمایا ہے من ادی زکوٰۃ مالہ فلیس علیہ جناح ان لا یتصدق "جس شخص نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی تو اب اس پر گناہ نہیں ہے اگر وہ صدقہ و خیرات نہ کرے"

اور اسی طرح تم نے بطریق حکم حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہ روایت کیا ہے کہ "واٰتوا حقہ یوم حصادہ" کا حکم عشر اور نصف عشر کے حکم سے منسوخ ہوگیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری روایت جس کو مقسم نے روایت کیا ہے ساقط الاعتبار اور ضعیف ہے اور اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی ہمارے خلاف نہیں ہے (کیونکہ آیت میں حق واجب کا ذکر نہیں ہے نفل کا تذکرہ ہے) اور پہلی روایت جس کو عکرمہ نے روایت کیا ہے اس کا مطلب تو صاف طور پر یہ ہے کہ اس شخص پر مستحب و نفل صدقہ و خیرات لازم نہیں ہے لیکن نادار کی کفالت کا حق تو حقِ واجب اور اس کے ذمہ قرض ہے صدقہ نافلہ نہیں ہے۔

اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ علماء کہتے ہیں "جو شخص پیاسا ہو اور پیاس کی وجہ سے موت کا ڈر ہو تو اس پر فرض ہے کہ جس جگہ اور جس طرح سے پانی مل سکے پانی حاصل کرے اگرچہ اس جدوجہد میں قتال کی نوبت ہی کیوں نہ آجائے تو اب فرمایئے کہ یہ فرق کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو موت سے بچنے کے لئے پیاس بجھانے پر قتال تک کی اجازت دیدی جائے اور اسی شخص کو بھوک یا عریانی سے پیدا شدہ موت کے خوف سے بچنے کے لئے قتال کی ممانعت کردی جائے یہ بات تو اجماع کے خلاف قرآن، سنت اور قیاس صحیح کے خلاف ہے اور اگر قتال کی اجازت دیجائے گی تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ درا صل اصحاب مال کے مال میں یہ حقِ واجب تھا جس کو حاجتمند شخص زبردستی حاصل کرنے کا مجاز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس مثلاً اپنی حاجت اصلیہ سے زائد خورد و نوش کا سامان موجود ہے اور دوسرا شخص بھوک سے اس درجہ مضطرب ہے کہ موت طاری ہوجانے کا اندیشہ ہے تو اس مضطر کو مردار یا خنزیر کھانا جائز نہیں ہے

بلکہ اس کا حق ہے کہ زبردستی اس پر قبضہ کر کے بقدرِ حاجت استعمال کرے خواہ وہ مال مسلمان
کا ہو یا ذمی (غیر مسلم معاہد) کا اور یہ اس لئے کہ صاحبِ طعام پر فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھانا کھلائے۔
لہٰذا ایسی صورت میں اس حاجت مند کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خنزیر یا مردار کھانے پر مضطر
ہو چکا ہے۔

بہر حال حاجت مند کے لیے درست ہے کہ وہ اس مال سے لڑ کر
زبردستی ضرورت کی مقدار مال پر قبضہ کرے پس اگر اس نے قبضہ کر لیا تو سرمایہ دار مارنے والے
پر قصاص آئے گا اور اگر سرمایہ دار اس آویزش سے مارا گیا تو "الیٰ لعنۃ اللہ" اللہ تعالیٰ کی
پھٹکار کو پہنچا اس لئے کہ اس نے اس حق کو ادا کرنے سے انکار کیا جو اس کے ذمہ فرض تھا
اور اس صورت میں اس مال دار شخص کا حکم طائفہ باغیہ کا حکم ہے چنانچہ ان کے متعلق اللہ
تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ
اللّٰهِ "اور اگر مسلمانوں میں سے ایک فریق دوسرے فریق پر بغاوت کرے تو باغی فریق سے اس
وقت تک جنگ کرتے رہو کہ وہ خدا کے حکم کی طرف آ جائے" اور ظاہر ہے کہ صاحبِ حق کے
مقابلہ میں حق و فرض کا منکر باغی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین
زکوٰۃ کے مقابلہ میں جہاد کیا۔ وباللہ التوفیق [1]

محلیٰ کی اس عبارت کا بغور مطالعہ کیجئے اور پھر فیصلہ فرمائیے کہ اجتماعی نظام اقتصادی کی فلاح
وسعادت کے لئے اسلام نے جن بنیادی حقوق کا اعلان کیا ہے اور نظام عمل میں جس طرح ان کی تشکیل
کی ہے عام بدحالی کے انسداد، طبقاتی جنگ کے سدباب اور رفاہیتِ عام کے قیام کے لئے اس سے
بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور رفاہیتِ عمومی کے مدعی نظامہائے معاشی نے فلسفیانہ دلائل و نظریات
کی روشنی میں جو حل تجویز کیا ہے اسلام کا معاشی نظام کیا اس پر اس لئے برتری نہیں رکھتا کہ اس
کے پیش کردہ حل میں نہ طبقاتی جنگ کے وجود پذیر ہونے کا اندیشہ ہے اور نہ دولت و غربت ا

لہ محلیٰ ج ۶ ص ۱۵۶ تا ۱۵۹۔

کے درمیان موجودہ تصادم کی صورت منصۂ شہود پر آسکتی ہے

قانونِ وراثت مذموم سرمایہ داری اور "اکتناز" کی ایک بدترین شکل یہ ہو کہ دولت ایک جگہ جمع ہوتی رہے اور مرنے کے بعد بھی وہ ورثاء میں تقسیم نہ ہو بلکہ سٹیٹ کی شکل میں ایک ہی جگہ محفوظ رہے موجودہ زمانہ کے تعلقے اور ریاستیں اگر ورثاء میں تقسیم ہوتی رہتیں تو آج ایک تعلقہ بھی تعلقہ اور ایک ریاست بھی ریاست نظر نہ آتی بلکہ تقسیم ہو ہو کر دولت کے یہ خزانے ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کے درمیان چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح نظر آتے ——— اسٹیٹ[1] اور تعلقہ کا یہ مذموم طریقہ جو سرمایہ داری کی اصل جڑ ہے اسلام سے پہلے بھی دوسری قوموں میں رائج تھا اور آج بھی دنیا کے اکثر حصوں میں رائج ہے۔

اس لئے اسلام کے انقلابی پیغام نے دوسری اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اصلاح کا فیصلہ کیا اور اس قدیم طریقہ کو اقتصادی تباہی کا پیش خیمہ بتایا اور اس کو ہٹا کر اس کی جگہ "قانون وراثت" کو قائم کیا۔

اسلام نے جب اس سسٹم کا اعلان کیا تو سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اس کے خلاف یہ نعرہ بلند کیا کہ اگر "اسٹیٹ" یا تعلقہ میں تقسیمِ وراثت کا یہ نظام جاری کر دیا جائے تو اس سے دولت و ثروت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بڑی بڑی جائدادیں تقسیم ہو کر چند کھیتوں کی صورت میں باقی رہ جائیں گی۔

اس وقت اگر ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ اسلام کا تو منشا ہی یہ ہے کہ سرمایہ داری کا یہ نظام

---

[1] اس جگہ اسٹیٹ سے مراد (خلافت) حکومت نہیں ہے بلکہ تعلقہ داری یا زمینداری کی وہ سب سے اونچی شکل مراد ہے جو با اختیار حکومت کے ماتحت صرف اس لئے قائم ہے کہ اس کا رئیس بے روک ٹوک عیش پسند زندگی بسر کرے رعایا کی جان و مال کو اپنی ملکیت سمجھے اور اپنی ہر قسم کی مادی طاقت کو بالا طاقت کے لئے آلۂ کار بنانے میں مجبور و مقہور ہو اور مرنے کے بعد اسلامی وراثت کے خلاف کسی ایک فرد خاندان کو تمام دولت کا مالک بنانے پر حکومتِ بالادست کے قانون یا خود ساختہ قانون کی رو سے مجبور ہو۔

اس صورت میں باقی نہ رہے اور دولت تقسیم ہونے کے بجائے "کنز" بن کر مخصوص طبقہ میں محدود نہ ہو جائے تو دنیا کے لئے عجیب حیرت زا یا مضحکہ خیز معاملہ بن جاتا اور اس کو ظلم سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن زمانہ آیا کہ تقسیم دولت کے اس قانون کو رحمت سمجھا جانے لگا اور غیر مسلم اقوام نے بھی اس کو قانونی حیثیت دینے کی سعی شروع کر دی اور اب عقل و نقل دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ "دولت" تقسیم کے لئے ہے "جمع" کے لئے نہیں۔

بہر حال اسلام نے تمام اقوام کے ترقی پذیر اقتصادی نظریوں سے صدیوں پیشتر اس سرمایہ دارانہ مذموم سسٹم کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور قانونِ وراثت کے ذریعہ تقسیمِ دولت کی راہ کھول دی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (نساء)

مردوں کا اس (مال) میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں تھوڑا ہو یا بہت اس میں (خدا کا) مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا (نساء)

تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے (ان کے متعلق) تم نہیں جانتے کہ تمہارے لئے ان میں سے کون نفع پہنچانے کے ذریعہ قریب ہے یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اقسموا المال بین اھل الفرائض علی کتاب اللہ (مسلم و ابوداؤد)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) کے مطابق اپنا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کر دیا گیا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت میں "تقسیمِ دولت" کا جو طریقہ ہے وہ ایسا معتدل اور مدبرانہ ہے کہ اگر صحیح طور پر اُس کو اختیار کیا جائے اور سوسائٹی میں اس کا رواج عام ہو جائے تو نہ اس سے سرمایہ دارانہ دولت پیدا ہونے کا امکان باقی رہتا ہے کہ جس سے تعلقہ اور اسٹیٹ بنتے ہیں اور نہ افراد و اشخاص کے درمیان افلاس و فاقہ مستی کو فروغ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس سے دولت کے سامان ہر وقت گردش میں رہتے اور ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں پہنچتے رہنے کی وجہ سے کم و بیش ہر ایک فرد کو فائدہ بخشتے رہتے ہیں۔

مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ نے اس مسئلہ پر نہایت مفصل اور لطیف مقالہ حجۃ اللہ البالغہ میں "الفرائض" کے عنوان سے لکھا ہے جو قابلِ مراجعت ہے۔ اس مقالہ کی تمہید کے چند جملوں کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے

غور کرو، بلاشبہ عقل و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان یہ "طریقہ" لازمی اور ضروری ہونا چاہیے کہ اہل قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور دردمندی و بہی خواہی کا ثبوت دیں اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع و نقصان سمجھیں اور یہ بات ایسی خلقت اور جبلّت کے بغیر ناممکن ہے جس کی پشت پر اس کو مضبوط بنانے کے لئے خارجی اسباب اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے سنتِ متوارثہ موجود ہو۔

یہاں جبلت تو اس تعلق کا نام ہے جو باپ بیٹے یا مثلاً بھائی بھائی کے درمیان موجود ہے اور اسی طرح دو یا چند عزیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

اور اسباب خارجی، باہمی الفت و مودت، رہنمائی، غم گساری اور ہمدردی وغیرہ کا نام ہے کیوں کہ یہ امور آپس میں محبت اور باہمی مودت کی تخلیق کرتے اور مصائب و آلام میں ایک دوسرے کی بصیرت و اعانت کے لئے بہادر بناتے ہیں۔

اور سنت ان امور کو کہتے ہیں جن کو شریعت کی زبان، لوگوں میں رشتۂ الفت پیدا کرنے کے لئے ضروری قرار دیتی اور اس کے نہ کرنے پر قابلِ ملامت ٹھیراتی ہے مثلاً وہ حکم دیتی ہے کہ صلۂ رحمی

ضروری اور فرض ہے اور ایسا نہ کرنے والا آثم اور گنہگار ہو گا مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض انسانی طبائع برے خیالات اور بیہودہ افکار کے پیچھے لگی رہتی اور صلۂ رحم جیسے عمدہ رجحان کے خلاف بغاوت کرتی ہیں اور بہت سے غیر ضروری کام کرنے پر آمادہ رہتی ہیں، تو ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہوئی کہ اس قسم کے (اخلاقی) امور کو ضروری قرار دیا جائے بجز لوگوں کے قبول و انکار سے بالاتر ہو کر ان پر لازم کر دیا جائے مثلاً عبادات، مریض، مصیبت زدہ، مقروض، اسیر وغیرہ کی گلو خلاصی، دیت (قریبی پر پڑے ہوئے تاوان کی ادائیگی) یعنی رحم کو غلامی سے نجات دلانا وغیرہ اور اس قسم کی معاونت و نصرت کا سب سے زیادہ استحقاق اس وقت ہو جاتا ہے جب انسان موت کے کنارے کھڑا ہو اور مال سے بے پروا ہو جائے اس لئے کہ ایسے وقت میں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کو یا اپنی ذاتی معاشرتی اور منزلی مفید کاموں پر زیادہ سے زیادہ صرف کرے اور یہ پھر بعد موت کے بعد اپنے عزیزوں کے لئے چھوڑ جائے اور اس طرح ان کی امداد و مدد کرے۔ بہر حال تقسیم دولت کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ [1]

لیکن اسلام کے ان عادلانہ قانون کے خلاف خود مسلمانوں کی کیا روش ہے اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو مسلم تعلقہ داروں اور ریاست کے نوابوں کے اس مظاہرہ کو دیکھئے جب کہ وہ عدالتوں میں کھڑے ہو کر بے محابا اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ہم کو قرآن عزیز کے بتائے ہوئے قانون وراثت کی ضرورت نہیں ہے ہم تو اپنے املاک کے فیصلے رسم و رواج کے اصول پر کرانا چاہتے ہیں یعنی انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین تحفظ ریاست اور ہندوؤں کے قانون "عدم توریث ریاست" کو مانتے ہیں اور "معاذ باللہ" اسلام کے قانون توریث و وراثت تسلیم کرنے سے بیزار ہیں۔

پنجاب، بمبئی، گجرات اور مختلف صوبوں کی ان عدالتی شہادتوں کے ریکارڈ کا اگر مطالعہ کیجئے گا جن میں مذکورہ بالا مطالبہ موجود ہے تو بے اختیار کہنا پڑے گا۔

تُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (بقرہ) کیا تم خدا کی کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۴۔

کا مظاہرہ اس سے بڑھ کر نا ممکن ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (بقرہ)

اے ایمان والو اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر چلنے کی سعی نہ کرو۔

انفرادی ملکیت کے بعض اور اہم جزئیات بھی ہیں جو اقتصادی نظام میں قابل غور ہیں مگر ہمارا مقصد تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہے بلکہ خاکہ پیش کرنا ہے اس لئے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں اب آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام نے ایک جانب تو انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا اور دوسری جانب اس میں ایسی شرائط اور حدود لگا دیں کہ کسی وقت بھی یہ انفرادی ملکیت اجتماعی معیشت کے لئے تباہی و بربادی کا نہ ہو سکے

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ اس نے فطری اور نیچرل تفاوت ملی کو انسانوں میں تسلیم تو کیا ہے مگر سرمایہ داری کی اس زندگی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جو سرمایہ کو مخصوص افراد یا گروہ میں سمیٹ کر کے باقی عام مخلوق خدا کی اقتصادی تباہی کا باعث بنتی اور انسانوں کو انسانوں پر آقائی اور خداوندی کا حق دیتی ہے

وہ یہ تو جائز رکھتا ہے کہ آمدنی اور ذرائع آمدنی کے مختلف شعبوں میں اشخاص و افراد کو حق ملکیت حاصل ہو جائے لیکن اس کو حرام قرار دیتا ہے کہ کوئی بھی انفرادیت کا شعبہ اجتماعی بدحالی کا سبب بن سکے گویا وہ انسانوں کے لئے قدر مشترک کے طور پر ایک عادلانہ زندگی کا خواہاں ہے نہ افراط کی راہ اس کو پسند ہے کہ سرمایہ داری فروغ پا جائے اور نہ تفریط کا راستہ اس کو بھاتا ہے کہ افراد کی آمدنی و ذرائع پر بالکل ہی قفل ڈال دیئے جائیں۔

یا یہ کہہ دیجئے کہ اسلام اس فطری نظام کا حامی ہے جو نہ ایسی مساوات تسلیم کرتا ہے جس میں تمام انسان بغیر کسی فرق کے اپنی معاشی زندگی میں بالکل مساوی ہوں اور ان کے درمیان ملی درجہ کا ادنیٰ سا بھی تفاوت نہ پایا جاتا ہو، اور نہ ایسے ظالمانہ تفاوت کا قائل ہے جس میں غربت و امارت کا امتیاز اس طرح قائم ہو جائے کہ غریب نان شبینہ کو محتاج رہے اور امیر دولت قارون کا مالک بن جائے

حصۂ دُوُم کے شعبے

اسلام کے معاشی نظام میں حکومت پر براہ راست جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا ذکر صفحات گزشتہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اب مختصر طور پر بعض اُن ذمہ داریوں کا تذکرہ بھی کر دینا مناسب ہے جو نظامِ اسلامی میں قانون کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ترغیب و تلقین اور اخلاقی خطابت کے ذریعہ پبلک کو اُن کی جانب توجہ دلائی جاتی اور یہ ذہنیت پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ افرادِ ملت میں سے ہر شخص کی زندگی جس طرح انفرادیت رکھتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس پر اجتماعیت کا فرد ہونے کی ذمہ داری عائد ہے اس لئے اس کو زندگی کے کسی ایک لمحہ میں بھی اپنی انفرادیت میں اس طرح گم نہ ہو جانا چاہئے کہ اجتماعیت کا فرد ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہیں وہ مذر تغافل ہو جائیں اور اس کی تمام مالی جد و جہد اور اس کی کامرانی جماعت کے افراد کی مالی ترقی کے لئے مفید و نافع ثابت ہو اور ضیق و تنگی کا باعث نہ بنے۔

قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو اپنے خاص انداز میں "انفاق فی سبیل اللہ" کا نام بخشا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

افرادِ ملت کے وہ تمام طریقے جن سے ایک دوسرے کو کسی نہ کسی طرح مالی مدد مل سکتی ہے۔ "انفاق" کی حدود میں شامل ہیں چنانچہ یہ انفاق واجب بھی ہے جیسا کہ گذر چکا اور نفل (حق فاضل) بھی ہے جو اس جگہ زیر بحث ہے انفاق کی اس دوسری قسم میں ایک حاجت مند کی حاجت روائی کے لئے مالی عطاء بھی انفاق کی ایک شکل ہے اور مالک بنائے بغیر منفعت کے خیال سے بے پروا اور یکسو ہو کر مالی مدد کرنا بھی انفاق ہی کے شعبہ میں داخل ہے۔

چنانچہ صدقاتِ نافلہ، وقف، وصیت اور ہبہ حقِ فاضل کی پہلی شکل کی جزئیات میں شمار ہیں اور قرضِ حسنہ، عاریت، اور امانت، انفاق کی دوسری صورت سے تعلق رکھتی ہیں علماء اخلاق

ہیں اس قسم کی اعانت و امداد کو "ایثار" اور "قربانی" سے تعبیر کیا جاتا ہے

صدقاتِ نافلہ اسلام کے معاشی نظام میں "انفرادی صدقات" کو بھی اہمیت حاصل ہے اور زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اسلام نے حاجتمندوں کی وقتی حاجت کے انسداد کے لئے ضروری عطایا کو "عملِ خیر" کہہ کر ترغیب دی ہے اور دنیا و آخرت کے اجر و ثواب کو نعم البدل بتا کر قرآن عزیز اور احادیث نے اس کے متعلق جگہ جگہ برانگیختہ اور آمادہ کیا ہے اور چونکہ اس کا تعلق انفرادی عطا سے ہے اور یہ اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ فاضلہ کی ایک کڑی ہے اس لئے اس میں دو اخلاقی خطرات کے پیش آجانے کا اندیشہ تھا۔ ایک یہ کہ معطی اپنے دیئے کا احسان جتلائے اور حاجتمند کو نادم اور شرمسار کرکے اس کو اذیت پہنچائے۔ دوسرے یہ کہ اس کا یہ انفاق رضائے الٰہی اور غربا کی حاجت روائی کے لئے نہ ہو بلکہ دکھاوے اور نمائش کے لئے ہو چنانچہ ان دونوں کے انسداد کے لئے نفسِ امّارہ کی زجر و توبیخ اور انابت و خودی پر تہدید کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ	اے ایمان والو! اپنے صدقات و خیرات کو احسان جتا کر
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ	اور ایذا دے کر ضائع مت کرو اس شخص کی طرح جو
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر
الْاٰخِرِ الآیۃ (بقرہ)	یقین رکھتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر

اوقاف انفاق فی سبیل اللہ کے اخلاقی وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ وقف بھی ہے اس لئے اسلام کے معاشی نظام نے اس کے اجراء اور توسیع کے لئے بہت زیادہ ترغیب دی ہے اور صحابہؓ نے اس کا عملی مظاہرہ کرکے اس کو مستحکم اور مضبوط بنا دیا ہے۔

ارباب ثروت کی شبانہ روز زندگی کا یہ نقشہ ہمارے سامنے ہے کہ ایک شخص اپنی پیدا کی ہوئی یا دوسرے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت کو اگرچہ اپنی ضروریات سے فاضل سمجھتا ہے پھر بھی دولت کی محبت اور سرمایہ کی فراہمی کا عشق اکثر و بیشتر اس کو حاجتمندوں کی اعانت اور جماعت کے غریب افراد کی امداد کی جانب کسی طرح متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ لیکن جب اس کا

آخری وقت آتا ہے اور وہ موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں اگر مغلوب ہو جاتا ہے تو با حسرت و یاس اس دولت سے منہ موڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مگر اس صبح و شام پیش آنے والے منظر کے باوجود دولت میں سرشار دولت مندوں کو وقت سے پہلے اس کا تصور بھی نہیں آتا اور یتامیٰ، بیوگان اور دوسرے حاجتمندوں کی فریادیں اس کی ہوس کے مستحکم قلعوں کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اس لئے اسلام اہل ثروت کے اجتماعی حقوق سے تغافل کو دور کرنے اور جذباتِ عالیہ اور اخلاقِ حسنہ کی روح پیدا کرنے کے لئے توجہ دلاتا ہے کہ اہل ثروت کی فاضل دولت کو کارِ خیر میں صرف کرنے اور اجتماعی حیات کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان، موت کے فولادی پنجہ کی گرفت میں آنے سے قبل بحالتِ صحت و تندرستی اور بقائے ہوش و حواس اپنی دولت کا ایک حصہ "صدقہ جاریہ" کر دے اسی کا نام "وقف" ہے۔

چنانچہ قرآنِ عزیز میں اس قسم کے انفاق اور اجتماعی افادیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران)	تم ہر گز خیر اور بھلائی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک خدا کی راہ میں) اس چیز کو خرچ نہ کرو جو تمہارے لئے سب سے پیاری اور محبوب ہے

اور داعیٔ انقلاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہ الا من ثلثۃ صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعو لہ۔ (مسلم وغیرہ)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر تین مستثنیٰ ہیں ایک صدقہ جاریہ دوسرا "علم نافع" تیسرا "نیک اولاد" جو اس کے لئے ہر وقت دعا گو رہے۔

"صدقہ جاریہ" کی جس قدر جزئیات علماء اسلام نے شمار کرائی ہیں ان سب میں "وقت" اعلیٰ

اہم ہے اسی لئے اہلِ خیر صحابہؓ نے اس ترغیب پر لبیک کہا۔ اور اپنی ملکیت کو وقف کر کے خدا کی ملک بنا دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے انصاریوں میں سب سے زیادہ مال دار تھے اور اُن کا سب سے زیادہ محبوب مال بیرحا تھا (یعنی کھجوروں کا باغ) جو مسجد نبوی کے قریب اور سامنے تھا۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے اور وہاں کا شیریں پانی پیتے پھر جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تو حضرت ابو طلحہؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالےٰ اپنی کتاب میں یہ فرماتا ہے اور میں اپنے مال میں سب سے زیادہ محبوب بیرحا کو سمجھتا ہوں اور تم سے یہ اللہ کے نام صدقہ (وقف) ہے میں خدائے تعالیٰ کے اجر اور اس کے ذخیرۂ خیر کا طالب ہوں۔ اب آپ مختار ہیں جس طرح چاہیں اس میں تصرف فرمائیں [۱] چنانچہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کے اقربا و اعزا میں اسکی آمدنی کو وقف کر دیا۔

اسی طرح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ارضِ خیبر کی "جاگیر" کو جو اُن کے حصہ میں آئی تھی اللہ کے نام پر وقف کر دیا تھا۔

پس حضرت عمرؓ نے اس کو صدقہ (وقف) کر دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ اس زمین کو نہ خرید و فروخت کیا جائے اور نہ وراثت اس میں جاری ہو اور نہ ہبہ کیا جائے اور حضرت عمرؓ نے اسکو فقراء، اقرباء، غلاموں کی آزادی، کارہائے خیر اور مسافروں، اور مہمانوں کے لئے وقف کر دیا اور یہ بھی تصریح کر دی کہ جو اس کا متولی ہو وہ اس سے مناسب طور پر اپنا روزینہ لے سکتا ہے اور ذخیرہ کئے بغیر اپنے دوست کو بھی مناسب طریق پر کھلا سکتا ہے۔ [۲]

وقف کی صحیح تعریف یہی ہے جو حضرت عمر بن الخطاب کے واقعہ میں مذکور ہے یعنی جو جائداد

[۱] [۲] بخاری مسلم۔ ترمذی

یا کوئی شئے خدا کے نام پر وقف ہو اس کی آمدنی فقراء، مساکین، مسافر، قرضخواہ، ذوی القربےٰ یتامیٰ پر صرف کی جائے اور اس کو نہ کوئی فروخت کر سکتا ہو نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ وہ واقف کے ورثار میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

وقف اگر جائداد اور آراضی کی شکل میں ہی تو وہ خلیفہ اور حاکم کے ان تصرفات اور مداخلت سے آزاد رہتا ہے جو مصالح وقف کے خلاف ہوں۔ اس لئے نہ بغیر مصالح وقف کے اس میں تبدیلی درست ہو اور نہ اس پر کوئی ایسا عمل کیا جا سکتا ہے جو اس کی آمدنی اور ذرائع آمدنی میں کمی کا باعث ہو یا اس کو تباہ و برباد کرنے کا باعث ہو۔

وقف میں سب سے زیادہ یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ واقف کی بیان کردہ جائز اغراض کو شریعت کے صاف اور صریح احکام کی طرح پوری کرنا ازبس ضروری ہے البتہ عرف عام بعض اوقات کسی حکم عام میں تخصیص پیدا کر سکتا ہے۔

بہرحال لگان و مالگذاری کے طے شدہ مالیہ کے علاوہ وقف کی اصلاح و مصالح سے الگ اس پر مزید ٹیکس لگانے اور باعثِ نقصان قیود عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے اس لئے کہ وہ کسی کی ذاتی جائداد (پراپرٹی) یا شخصی ملکیت نہیں رہتا بلکہ "رفاہِ عام" کا ایک قائم و دائم سرمایہ بن جاتا ہے۔[1]

وقف کی دو قسمیں ہیں ایک وقف اہلی (وقف علی الاولاد) اور دوسری وقف خیری (وقف علی الخیر) وقف اہلی یعنی وقف علی الاولاد میں اولاد اقرباء کے نام بھی وقف ہوتا ہے اور ساتھ ہی امور خیر کے لئے بھی۔ اور وقف خیری میں صرف امور خیر ہی کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔

بہرحال وقف میں تابید شرط ہے[2]

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے حضرت ابو طلحہؓ کا وقف (وقف اہلی) ہیں شمار

---

[1] درالمختار ج ۲ کتاب الوقف۔ جامع الفصول ج ۲ ص ۱۷۷۔

[2] یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو خاص وقت میں محدود نہ ہو۔

کیا گیا اور حضرت عمر بن الخطابؓ کا وقف علی الخیر کی قسم میں رکھا گیا۔[1]

لیکن قانونِ وقف میں یہ سب اقسام بحیثیت وقف ایک ہی حکم رکھتی ہیں البتہ وقف علی الاولاد میں آمدنی وقف جب افرادِ اہلی میں تقسیم ہو جائے تو اس پر ٹیکس اور مزید محصولات کی وہ تمام قیود اور پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں جو ذاتی املاک رکھنے والوں پر عائد ہوتی ہیں۔

ہبہ اجتماعی معاشی نظام میں ہبہ بھی ایک مفید طریق کار ہے بشرطیکہ واہب کا مقصد نیک ہو اور حقوق اللہ (زکوٰۃ و صدقات) اور حقوقِ عباد (دوسرے انسانوں کے عائد شدہ انفرادی و اجتماعی حقوق) میں سے کسی کی حق تلفی پیشِ نظر نہ ہو اس لئے اس کی افادیت کی شکل یہ ہے کہ ایک متموّل شخص اگر اپنے ذاتی حقوق اور اجتماعی حقوق سے سبکدوشی کے بعد بھی فاضل مال یا ملک ہے تو اسکے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ اس فاضل پونجی کو حاجت مندوں کی حاجت میں صرف کرے اور اخلاقی راہ سے بھی اجتماعی خدمت سے منہ نہ موڑے اور اس انفاق کی جہاں اور مختلف راہیں ہیں ان میں سے ایک راہ یہ ہے کہ وہ نقد یا مال کسی ضرورت مند کو ہبہ کر دے

قانون ہبہ میں اگرچہ فقیر یا حاجتمند کی شرط نہیں ہے بلکہ غنی اور مالدار کے نام بھی ہبہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام میں ہماری بحث ہبہ کی صرف اسی شق کے ساتھ محدود ہے جس کا تعلق غربا، اور اہلِ حاجت کی غربت و حاجت کے انسداد سے ہے حدیث نبوی میں ہبہ کی ترغیب دیتے ہوئے یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ ہدیہ اور ہبہ کی عادت ڈالو کہ یہ رسم باہمی محبت و مودّت کے قیام و استحکام کے لئے از بس مفید ہے ارشاد مبارک ہے:۔

تہادوا تحابوا[2] آپس میں ہدیہ دیا کرو اور اس طرح باہم محبت کی طرح ڈالو۔

فقہ اسلامی میں ہبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے "کسی شے کو دوسرے کی ملکیت میں بغیر عوض کے دیدینا" اور حدیث صحیح میں اس کی حکمت "معاشی وسائل" میں اضافہ بتائی گئی ہے۔

اگر سوال اور انتظار کے بغیر ایک شخص اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مالی بھلائی کرتا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہئے

---

[1] الناسخ الجامع الاصول ج ۲ ص ۲۰۷ ۔ [2] مسند ابو یعلی از جامع صغیر ج ۱ ص ۱۵۴ ۔

اور رد نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بہانہ سے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔[1]

وصیت | وصیت بظاہر ایسے امور میں سے ہے جن کے متعلق یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس کا بھی کوئی تعلق معاشی نظام سے ہو سکتا ہے لیکن اس کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بے شبہ اس کو بھی معاشی نظام میں ایک حد تک دخل ہے اور مفید دخل ہے۔

انسان اپنی زندگی کے لمحات میں موت کی حقیقت سے آگاہ ہونے اور مسلسل مشاہدہ کرتے رہنے کے باوجود اکثر حقوق واجبہ و نافلہ سے غافل رہتا ہے لیکن جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ پنجۂ موت نے دبا لیا ہے تب اضطرابی کیفیت کے ساتھ تلاش کرتا ہے کہ کیا اب بھی مکافات کی کوئی شکل ممکن ہے تو اسلامی قانون میں صرف ایک شکل نظر آتی ہے جس کا نام "وصیت" ہے۔

اسلامی شریعت میں کسی شے کو یا اس کے منافع کو بطریق حسن سلوک یہ کہہ دینا یا لکھدینا کہ میری موت کے بعد فلاں کے لئے ہے "وصیت" کہلاتا ہے مگر چونکہ اس کے مال میں ورثہ کا حق بھی شامل ہو گیا ہے اس لئے شریعت نے صرف ثلث (تہائی) میں وصیت کو جائز اور نافذ قرار دیا ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوص بالثلث والثلث کثیر۔ اور اس کے علاوہ بھی اور شرائط مقرر فرما دی ہیں مثلاً "لا وصیۃ لوارث" وارث کے لئے وصیت درست نہیں، اس لئے کہ وہ بحیثیت وراثت حق دار ہے لہٰذا اس کے لیے وصیت کرنا گویا دوسرے ورثہ کی حق تلفی کرنا ہے یا مثلاً قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الاضرار فی الوصیۃ من الکبائر اس لئے وصیت کرنا کہ اس کے ذریعہ کسی صاحبِ حق کو نقصان پہنچایا جائے بہت بڑا گناہ ہے یا مثلاً "لیس لقاتل وصیۃ" قاتل کے لئے کسی حال میں بھی وصیت درست نہیں ہے اور ان سب شرائط سے مقدم شرط یہ ہے کہ وصیت کرنے والا اس قدر مقروض نہ ہو کہ جس مال کی وہ وصیت کر رہا ہے سب ادائے قرض ہی میں چلا جائے کیونکہ ادائے قرض وصیت اور وراثت دونوں پر مقدم ہے۔

غرض وصیت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ سے ایک متموّل اپنے آخری لمحاتِ حیات میں

---

[1] سعیدیات حصہ دوم ص ۱۳، نصف آخر۔

تبرع اور حسنِ سلوک کے طور پر غرباء اور اہل حاجات کو مالی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور بسا اوقات اس طریقِ کار سے اہم اور ضروری اجتماعی کام بخوبی انجام پا جاتے ہیں اس لئے قرآنِ عزیز نے وراثت کے احکام بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ "وصیت" "وراثت" سے مقدم ہے۔ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّۃٍ یُّوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ ؕ

قرضِ حسنہ: انفاق فی سبیل اللہ اور تعاون باہمی" کے وسائل میں سے ایک مفید و کارآمد وسیلہ "قرضِ حسنہ" ہے یہ حاجتمند کی وقتی حاجت روائی کا بھی ذریعہ ہے اور غریب اور بے مایہ انسان کو تجارتی زراعتی یا صنعتی کاروبار کے لئے بھی مؤثر وسیلہ ہے۔

قرضِ حسن کی تعریف یہ ہے کہ ایک دولتمند کسی ضرورتمند کی ضرورت کے انسداد اور اس کی حاجت روائی کے لئے اس طرح اپنی رقم سے اس کو فائدہ پہنچائے کہ اس کا کوئی بدل (سود) اس سے حاصل نہ کرے، اور چونکہ یہ اخلاقی مسئلہ ہے اس لئے احادیث میں قرض خواہ کو قرض دار کی دعوت قبول کرنے سے بھی احتیاط کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عوض خواہی کا قطعاً سدِّ باب ہو جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ قرض دار اس لیے قرض خواہ کی دعوت کرتا یا اس کو ہدیہ پیش کرتا ہے کہ وہ اپنے قرض کا جلد مطالبہ نہ کرے اس حالت میں یہ بھی ایک قسم کا ربوا ہو جائے گا الّا یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس معاملہ سے قبل بھی اس قسم کے تعلقات قائم ہوں۔

چونکہ اس معاملہ میں قرضدار کی جانب سے بددیانتی اور وفائے عہد کے فقدان کا زبردست خطرہ ہے اس لئے اس قسم کی اعانت کو واجب نہیں کہا گیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کے وعدوں کے ساتھ صرف اخلاقی ترغیب ہی پر اکتفا کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (حدید)

کوئی شخص ہے کہ اللہ کو قرضِ حسن دے اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مرضی سے چند در چند کر کے ادا کرے (یعنی آخرت کا اجر عطا فرمائے جو دنیوی منافع سے کہیں زیادہ ہو) اور اس کیلئے پسندیدہ ثواب ہے

اور ساتھ ہی قرضدار کو بھی سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ قرضِ حسن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدرتِ ادا

کے باوجود دوسرے کی رقم کو ہضم کر جائے یا تاخیر کر کے قرض دہندہ کو نقصان پہنچائے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:-

مطل الغنی ظلم[۱]

دینے کی قدرت کے باوجود دوسروں کے حق مطالبہ کی ادا میں تاخیر بہت بڑا ظلم ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدین مقضی[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرض کی بروقت واپسی واجب اور فرض ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الید ما اخذت حتی تودی[۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چیز کسی نے کسی سے لی ہے جب تک اس کو ادا نہ کر دے اس کا بار ادا اس پر برابر قائم ہے۔

بہر حال قرض حسنہ دینے والا اگر دیانتدار اور بددیانت کا لحاظ رکھ کر اس کے لئے اقدام کرتا ہے تو یہ اس کا واجبی حق ہے اور قرض لینے والوں کی اخلاقی قوت پر ہی اس کی ترویج کا دارومدار ہے۔

عاریت اقتصادی نظام کے اخلاقی شعبہ میں "عاریت" بھی نمایاں جگہ رکھتی ہے کسی شخص کا اپنی ملکیت کے منافع کو بغیر معاوضہ کے دوسرے کی ملکیت بنا دینا" اسلامی نقطہ نظر سے عاریت کہلاتا ہے عاریت کا سسٹم کس لئے ہے اس کا جواز اسلامی فقہ میں اس طرح دیا جاتا ہے۔

واجمعت الامۃ علی جوازھا و استحبابھا و استحسانھا لما فیھا من اجابۃ المضطر و اغاثۃ الملہوف[۴]

اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ عاریت نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اسلئے کہ اس میں مضطر کی حاجت روائی اور نادار کی اعانت و امداد ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ضرورت کی ہر شے ہر شخص کے پاس نہیں ہوتی اور نہ ہی انسان ہی جو قیمت خرید بھی نہیں رکھتے پس اگر ان کی اعانت کا یہ طریقہ جو عاریت کی شکل میں پیش آتا ہے معاشی نظام کا حصہ نہ بنا اور اس کو رائج کرنے کے لئے اقدام نہ کیا جائے تو باہمی معاشی تعاون کا ایک ضروری

[۱] بخاری و مسلم [۲] ابوداؤد [۳] ترمذی [۴] سعدیا ص جلد ۲ ص ۱۳۱-

حصہ معدوم ہو جائیگا۔ — قرآنِ عزیز میں ان انسانوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو اپنے مضطر اور نادار کی امداد و اعانت سے باز رہتے اور اپنی چیز کو رعایت پر دینے سے گریز کرتے ہیں، ارشاد ہے۔

وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (ماعون) — اور ان کے لئے بھی ہلاکت ہے جو برتنے کی چیز کو عاریت پر نہیں دیتے[1]

غرض عاریۃ، ایثار اور اخلاقی بلندی کا ایک ثبوت ہے جس کے لئے اخلاقی ترغیبات ہی سے کام لیا گیا ہے اور چونکہ اس میں چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے اس لئے عاریت پر لینے والے کو بھی سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ رعایت پر لی ہوئی چیز کو اپنی ملک نہ سمجھے اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد فوراً مالک کو واپس کر دے اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

العاریۃ مؤداۃ[2] — عاریت کی واپسی عاریت لینے والے کے ذمہ ہے

امانت | اگرچہ بظاہر ہیں نگاہوں میں اس کا تعلق معاشی نظام سے نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی بعض حالات میں اہم معاشی ضرورت کے پورا کرنے کی کفیل ہے ایک شخص اگر نقد یا مال کسی دوسرے شخص کے پاس امانت رکھتا ہے اور امین کو اس کی ضرورت کے وقت امانت میں تصرف کرنے کی اجازت دے دیتا ہے تو کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح کس قدر اہلِ حاجات کی ضروری حاجات کو پورا کیا جاسکتا ہے؟ اور جب کہ امانت کے معاملہ میں خیانت کا ہر وقت خوف رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ دونوں جانب اخلاقی دباؤ ڈالا جائے ذاتی ضرورت سے فاضل مال رکھنے والوں کو جہاں انفاق فی سبیل اللہ کے دوسرے طریقوں کی ترغیب دی جائے وہاں امانت کی بھی ترغیب دی جائے تاکہ اس بہانہ سے اہلِ حاجات کی حاجت پورا ہونے کی ایک اور سبیل پیدا ہو اور ساتھ ہی امین کو خائن بننے کی ترغیب دی جائے اور عذابِ الٰہی اور دنیا کی رسوائی کا خوف دلا کر صحیح معنی میں امین و بننے پر آمادہ کیا جائے چنانچہ قرآنِ عزیز میں ان دونوں باتوں کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (نساء) — اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ جس شے کے تم امین بنائے گئے ہو اس کو مالک شے کے پاس امانت کے ساتھ واپس کر دو۔

---

[1] ماعون کی متعدد تفاسیر میں سے ایک تفسیر یہ بھی ہے یعنی معمولی برتنے کی چیزیں۔ [2] ترمذی ابوداؤد۔

ادّالامانة الیٰ من ائتمنك ولاتخن	امانت کو امین کے پاس رکھو اور اگر کسی شخص نے تمہارے
من خانك۔ [1]	ساتھ خیانت کی ہو تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔
لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ [2]	جس میں امانت کا مادہ نہیں اسکو ایمان سے بھی حصہ نہیں
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝ (انفال)	اللہ تعالیٰ خیانت کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔

غرض "امانت" اجتماعی معاشیات میں ایک خاص مقام رکھتی ہے اس لئے کہ اگر ایک متمول اور دولت مند اپنی فاضل "دولت" کو بغرضِ حفاظت کسی امین کے پاس امانت رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس کو اجازت دیتا ہے کہ وہ حسبِ ضرورت اس سے اس شرط کے ساتھ استفادہ کر سکتا ہے کہ بوقتِ طلب بجنسہٖ واپس کر دے تو یہ معاملہ قریب قریب موجودہ زمانہ میں بینکوں کے اندر روپیہ داخل کرنے کی مثال بن جاتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ جبکہ بینک میں روپیہ داخل کرنے پر سود کی ایک مقدار سالانہ ملتی رہتی ہے اور خود بینک بھی اس روپیہ سے سودی کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن "امانت بشرط تصرف" میں سود کے لین دین دونوں صفر اور نفی کے درجہ میں رہتے ہیں۔

پس بینک میں سپرد امانت کا نتیجہ تو بینکر کے لئے مذموم سرمایہ داری کی تخلیق نکلتا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق "امانت سے استفادہ" اس مذموم طریقہ کا انسداد کر کے صاحبِ دولت کی دولت کو بھی ہلاکت سے بچانا اور اصحابِ حاجت کی تکمیلِ حاجات مثلاً تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ یا وقتی حصولِ معیشت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اور "بینک سسٹم" کی طرح چند افراد میں "اکتناز" کی راہ سے دولت کو سمیٹ کر عوام کی معاشی تباہی و تنگدستی اور ان کے افلاس کا باعث نہیں بنتا

اسی لئے اسلام کے معاشی نظام میں "امانت" کے مفید پہلو کو باقی رکھا گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی مضرت کو فنا کرنے کے لئے اس کے ربوی شعبہ کو حرام قرار دے دیا گیا۔

چنانچہ ایک حدیث میں اس کے افادی پہلو کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے "الامانۃ غنی"

---

[1] ترمذی ابوداؤد [2] بیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ)

امانت ایک قسم کی مالی رفاہیت ہے اور مشہور محدث ابن اثیر نے نہایہ میں اس جملہ کی یہ تشریح فرمائی ہے

حدیث کے جملہ کی مراد یہ ہے کہ امانت، امین کی رفاہیت کا باعث بنتی ہے اس لئے کہ جب اس

کی امانت داری کی شہرت ہوگی تو لوگ کثرت سے اپنے فاضل مال کو اس کی امانت میں رکھنے کا اقدام

کریں گے اور اس طرح یہ معاملات اس کی رفاہیت کے باعث ہوں گے لہ

اقتصادی انقلاب کے دو فطری طریقے

عقل اور دلیل، دونوں اس جانب راہنمائی کرتے ہیں کہ جماعتی زندگی میں معاشی وسائل کو عام کرنے، سرمایہ اور دولت کو محدود طبقوں میں "کنز اور جمع" ہونے سے

بچانے اور مذموم سرمایہ دارانہ نظام کو قائم نہ ہونے دینے کے لئے دو ہی مؤثر طریقے ہو سکتے ہیں

ایک یہ کہ قانون کے ذریعہ ایسی تمام راہیں بند کر دی جائیں جن سے عوام کی تباہی و بربادی

پر خواص کی مالی سربلندی کی عمارت تعمیر ہوتی ہو اور جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے وہ قانونی مجرم

قرار دیا جائے اور اس طرح افراد کی خوشی و ناخوشی سے بلند رہ کر اقتصادی نظام کی تمام تر بنیادیں

صرف اسی پر قائم ہوں تاکہ اقتصادی نظام کا حقیقی فائدہ بروئے کار آسکے۔

دوسرے یہ کہ سوسائٹی اور جماعت میں اخلاق کی ایسی عملی تعلیم دی جائے کہ جو مذموم سرمایہ داری

کا قلع قمع اور احتکار اور اکتناز کی جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتی ہو چنانچہ اسلام نے

ان دونوں پہلوؤں کو اپنے اقتصادی نظام میں مؤثر جگہ دے کر کائناتِ انسانی کی فلاح عام کا بیڑا

اٹھایا اور خلافت راشدہ کے مقدس دور نے عملاً ان کو حدِ کمال پہنچایا۔

پس اسلامی احکام میں سود، مسکرات کی خرید و فروخت، نجس اشیاء کی بیع و شریٰ، قمار و قمار

کی طرح کے کاروبار، تعلقہ داری اور جاگیرداری کے ظالمانہ رسم و رواج کا انسداد اور زکوٰۃ، صدقاتِ

واجبہ، عشر و خراج اور وراثت کا ایجاب و لزوم، پہلی قسم کی بہترین مثالیں ہیں۔

اور حتی الامکان زمینداری کو مستقل معاشی زندگی بنانے سے پرہیز، مضاربت، عنان اور

عقد شرکت کے ذریعہ باہمی تعاون اور صدقات و اوقاف اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے

لہ ج ۱، باب الامانۃ۔

دوسروں کے ساتھ اخوت وہمدردی، دوسری قسم کی صحیح اور عمدہ مثالیں ہیں۔

لہٰذا بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عالمگیر اقتصادی نظام کے لیے جو طریقِ کار اختیار کیا ہے وہ اپنے عملی تجربہ اور علمی نظریہ دونوں کے اعتبار سے اس مشکل کا بہترین اور منصفانہ حل ہے جو دنیا کے مدبروں کے سامنے اقتصادی نقطۂ نظر سے سرمایہ دار و مزدور یا سرمایہ و محنت کی جنگ کی صورت میں نمودار ہے۔

دیگر نظامہائے اقتصادی کا موازنہ

اسلام کے معاشی نظام کا اصولی خاکہ پیش کرنے کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم مختصر طور پر دوسرے نظامہائے معاشی پر بھی نظر ڈالیں تاکہ یہ موازنہ مقصدِ کتاب کے متعلق مزید روشنی کا باعث ہو۔ ہمارے سامنے عالم کے اقتصادی نظام دو راہوں سے آتے ہیں ایک مذہبی اور دوسری دنیوی۔

مذاہبِ عالم اور اسلام کا اقتصادی نظام

مذاہبِ عالم کی تاریخ میں اسلام کے علاوہ نصرانیت، یہودیت، ویدک دھرم اور زرتشتی مذہب بڑے مذاہب شمار ہوتے ہیں جن کی پشت پر ان کی اپنی مستقل تاریخ ہے اس لئے ہمارا موضوعِ سخن ان چار کے اندر ہی محدود رہنا مناسب ہے۔

ان مذاہب میں سے نصرانیت کی بنیاد یوحنا، متی، مرقس، لوقا حواریوں کی چار انجیلوں پر ہے ان چار انجیلوں کی تعلیم کو بغور مطالعہ کرنے سے ہم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ عیسوی عقیدہ میں یہ بات نمایاں طور پر ملتی ہے کہ وہ بار بار لوگوں کو رہبانیت (جوگی پن) کی تعلیم دیتا ہے اور ارباب ثروت و دولت کے لئے خدا کی بادشاہت میں کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتا۔

تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے؛ کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؛ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں اور نہ کاٹتے ہیں اور نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے[۱]۔ اور اس نے ان سے کہا کہ خبردار اپنے آپ کو ہر طرح کے لالچ سے بچائے رکھو کیونکہ کسی کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں اس نے ان سے ایک تمثیل کہی کہ کسی دولتمند

[۱] انجیل متی باب ۶، آیات ۲۴-۲۶۔

کی زمین میں بڑی فصل ہوئی پس وہ اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگا کہ میں کیا کروں کہ میرے یہاں جگہ نہیں جہاں پیداوار بھر رکھوں اس نے کہا میں یہ کروں گا کہ اپنی کوٹھیاں ڈھا کر ان سے بڑی بناؤنگا اور ان میں اپنا سارا اناج اور مال بھر رکھونگا اور اپنی جان سے کہوں گا۔ اے جان تیرے پاس بہت برسوں کے لئے بہت سامان جمع ہے۔ چین کر، کھا پی، خوش رہ، مگر خدا نے اس سے کہا اے نادان۔ اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے گی پس جو تو نے تیار کیا ہے وہ کس کا ہوگا۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو اپنے لئے خزانہ جمع کرتا ہے اور خدا کے نزدیک دولت مند نہیں

پھر اس نے اپنے شاگردوں سے کہا اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کا فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے۔ کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے اور بدن پوشاک سے[۱]

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔[۲]

غرض عہد نامہ جدید (اناجیل اربعہ) کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت سرمایہ داری کو تو ناپسند کرتی ہے لیکن اقتصادی نظام کے نقطہ نظر سے اس میں ترغیب و تلقین کے علاوہ کوئی قانونی اور عملی نقشہ مذکور نہیں کہ جس کو سامنے رکھ کر اقتصادی عادلانہ نظام مرتب کیا جا سکے اور ایک دین دار کو صحیح دنیادار بنا کر اجتماعی زندگی کا مفید جزء بنایا جا سکے بلکہ اس کے برعکس اس سے صرف رہبانیت اور دنیا کشی کی تعلیم نکلتی ہے اور بس۔ اور ایک دین دار اور خدا رسیدہ انسان کو بہترین دنیادار بنانے اور اجتماعی زندگی میں کسی بہتر مالی نظام قائم کرنے کی اس میں مطلق کوئی گنجائش نظر نہیں آتی

عہد نامہ جدید (انجیل) کے بعد عہد نامہ قدیم (توراۃ) کو لیجئے اور اس کے ابواب

[۱] لوقا باب ۱۲۔ آیات ۱۵-۲۱ - [۲] متی باب ۱۹۔ آیات ۲۳-۲۴

"قاضیوں" اور "سلاطین" کا غائر نظر سے مطالعہ کیجیے جو حکومت سے متعلق ہیں تو کسی ایک مقام میں بھی "اقتصادی نظام" کی جھلک نظر نہ آئے گی، ان کی پوری داستان، یا دشمنوں سے مقابلہ کرنے اور ان پر غالب آنے سے متعلق ہے اور یا بادشاہت کے جاہ و حشم، دولت و ثروت، صولت و شوکت کی مدح و منقبت سے معمور ہے اور ان دونوں ابواب کے علاوہ جو اس سلسلے کے خصوصی مواقع ہو سکتے تھے پورے عہد نامہ میں کوئی ایسا مضمون نہیں ملتا کہ جس سے چند اصول یا چند احکام اس نظام کے لئے حاصل کئے جا سکیں۔ یا کم از کم عہد نامہ جدید کی طرح سرمایہ داری کی منفعت کے لئے ہی اخلاقی سرمایہ بہم پہنچ سکے۔

علاوہ ازیں عہد نامہ جدید و قدیم میں ایک بات نمایاں اور امتیازی طور پر یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان میں "شراب" کے استعمال کا نہ صرف جواز بتایا گیا ہے بلکہ مقدس نبیوں اور رسولوں کی ضیافتوں میں بھی اس کا استعمال تقدس اور برکت کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے جس سے باسانی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس نظام میں "شراب کی خرید و فروخت" اور عام شرعی و بیع اور استعمال اقتصادی زندگی کے لئے مفید سمجھا گیا ہے بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک اہم جزء مانا گیا ہے۔

علاوہ ازیں انجیل و توراۃ سے "سودی" لین دین کی بھی اجازت ثابت ہوتی ہے البتہ توراۃ میں یہ شرط بھی مذکور ہے کہ "سود محتاج اسرائیلی سے نہ لیا جائے" بلکہ صرف اسرائیلی (یہودی) سے نہیں لینا چاہیئے۔ باقی افرادِ انسانی سے سود لینا درست ہے چنانچہ موجودہ انجیل کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) ایک تمثیل میں فرماتے ہیں

> اس کے مالک نے جواب میں اس سے کہا۔ اے شریر اور سست نوکر! تو جانتا تھا کہ جہاں میں نے نہیں بویا۔ وہاں سے کاٹتا ہوں اور جہاں میں نے نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہوں پس تجھے لازم تھا کہ میرا روپیہ ساہوکاروں کو دیتا تو میں آ کر اپنا مال سود سمیت لیتا[۱]

اور انجیل لوقا میں ہے

[۱] متی باب ۲۰ آیات ۲۷-۲۸

پھر تو نے میرا روپیہ ساہوکار کے یہاں کیوں نہ رکھ دیا۔ تاکہ میں آکر اسے سود سمیت لے لیتا۔[1]

اور توراۃ میں ہے۔

اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دے تو اس سے

بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر[2]

اور دوسری جگہ مذکور ہے

تو اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دیجیو نہ نقد کے سود پر، نہ غلہ جات کے سود پر، نہ کسی چیز کے
جس کی بابت سود لیا جاتا۔ تو اجنبی کو سودی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض
مت دیجیو۔[3]

زرتشتی تعلیم کی بیشتر الہامی کتابیں "ژند اوستا" کا اگرچہ میں نے مطالعہ نہیں کیا لیکن
اس مذہب کے عقیدہ کے مطابق بانی مذہب (زرتشت) کے علاوہ نبیوں اور رسولوں کے صحیفے
جو "دساتیر آسمانی" کے نام سے موسوم ہیں فارسی اور پہلوی زبان میں نہ صرف میری نظر سے
گذرے بلکہ عرصہ دراز تک زیر مطالعہ رہے ہیں مگر توراۃ اور انجیل کی طرح یہاں بھی مجھے تو یہی
کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اس لئے کہ ظالمانہ طریق پر حصول دولت و ثروت کی بجز مذمت کے باوجود
بصورتِ احکام و قوانین اقتصادی نظام کی ترتیب میں مطلق کوئی مدد نہیں ملتی۔

اسی طرح ویدوں کی اصل زبان "سنسکرت" سے ناواقفیت کی وجہ سے مجھ کو ان کے
تراجم اور ان کی بنیادی تشریحات کی کتابوں "ستیارتھ پرکاش اور آدی بھاشیہ بھومیکا" پر ہی اعتماد
کرنا پڑا ہے مگر عرصہ دراز تک ایک مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ مختلف اوقات میں ان کا بخوبی مطالعہ
کیا ہے اور کافی غور و خوض کے ساتھ ان کے مطالب، معانی اور مفہوم و مراد تک پہنچنے کی سعی بلیغ کی
ہے لیکن بلا شائبہ تعصب و ارادہ مبالغہ دیانت و انصاف کے ساتھ اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان میں
بھی یہ مسئلہ دو متمدنوں کے بیجا مظالم کے خلاف چند پند و نصائح یا ان کے مقابلہ میں جنگ کے علاوہ

---

[1] لوقا باب ۱۹ آیات ۲۳۔ [2] توراۃ باب ۲۲ آیت ۲۵ خروج [3] توراۃ استثنا باب ۲۳، آیات ۱۹-۲۰۔

اقتصادی نظام کے لئے احکام و قوانین کی دفعات و جزئیات کی شکل میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

مزید برآں یہ کہ "منو" کا قانون کہ جس پر ہندوستان کے مشہور و قدیم مذہب کے نظامِ تمدن کی بنیاد قائم ہے ایک حد تک "سود" کی اجازت دیتا ہے وراثت میں تقسیمِ دولت کی بجائے مشترک خاندان کے نام سے "کنز" اور جمعِ دولت کو جائز قرار دیتا ہے اور اس طرح "مذموم سرمایہ داری" کو دھرم کی پناہ مل جاتی ہے۔

اس کی شہادت موجود ہے کہ "سودی" قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بینکروں کے بارے میں بھی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو بیاج پر قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے ان بینکروں کو "شریشتھی" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا

بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا، راجہ گرہا، سراوستی، کوسامبی اور آونتی میں بہت سے نہایت بااثر سریشتھی یعنی بینکر رہا کرتے تھے

کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں یہ بتلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جاسکتی ہے دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے ارتھ شاستروں اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستروں میں کسی خاص ذات کے لئے ساہوکاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لیکن دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف "ویشیوں" کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے[1]

ان حوالجات سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس نظام اقتصادی میں "مہاجنی سود" اور "جمع سرمایہ" کو باقاعدہ قبول کیا گیا ہو اس میں "مذموم سرمایہ داری" کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے اور مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش اور سرمایہ و محنت کی کشاکش کا اس کے ذریعہ حل کرنا ناممکن ہے۔

اس جگہ مذاہبِ عالم کے ان شواہد و نظائر پیش کرنے سے مقصود صرف یہ ہے کہ اقتصادی نظام کے اساس و بنیاد اور نصب العین (کریڈٹ) کے پیشِ نظر نیز سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار و غریب سے

[1] ماخوذ از مضمون رسالہ جامعہ دہلی بابت فروری ۳۹ء

متعلق جدید و قدیم کشمکش کے متعلق "مذہب" اور "دھرم" کی معرفت قانونی اور اخلاقی دونوں طریقوں
سے جس قدر صاف اور تفصیلی حل اسلام کے اقتصادی نظام میں پایا جاتا ہے دوسرے مذاہب
کی روایات و تعلیم میں نظر نہیں آیا بلکہ اکثر مذاہب و ادیانِ موجودہ میں مذہب کی معرفت اقتصادی
نظام کا وجود ہی مفقود ہے۔

گزشتہ سطور میں اسلام کے اقتصادی نظام کا اور موجودہ مذاہبِ عالم کے اقتصادی
نقطہ ہائے نظر کا مقابلہ زیرِ بحث آچکا، اب ضروری ہے کہ اس کے دوسرے جز کو بھی زیرِ نظر لایا
جائے یعنی اسلام کے معاشی نظام اور دنیوی معاشی نظام کے درمیان بھی موازنہ کیا جائے تاکہ
اسلام کے نظامِ معاشی کی برتری واضح ہو سکے۔

دنیوی نظام ہائے معاشی اور اسلام کا اقتصادی نظام

اس بحث کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ وہ دنیوی نظام ہائے اقتصادی جو اس
دورِ جدید میں دنیا کی حکومتوں پر مسلط ہیں اور پروپیگنڈے کے ذریعہ
مسلط ہونا چاہتے ہیں اسلامی اقتصادی نظام کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں اور کیا واقعی
اقتصادی نظام کے مقصدِ عظمیٰ کا حل انکے ذریعہ سے ہو سکتا ہے یا اسلام کا اقتصادی نظام ہی
اس مرض کا واحد علاج ہے۔

موجودہ دور میں دنیا کی حکومتوں پر مختلف شکلوں میں مکمل یا ناقص دو ہی نظام کا تسلط
ہے اور اس لئے وہی دونوں قابلِ بحث ہیں ایک فیسزم اور دوسرا سوشلزم

فاشیت یا نازیت[1]

(۱) فیسزم یا فاشیت کا نظریہ یا فلسفہ اگرچہ اپنے اندر ایک طویل بحث رکھتا ہے لیکن
نتیجہ کے اعتبار سے وہ حسبِ ذیل چند اصول پر قائم ہے اور اسکا تمام نظام ان ہی اصول
کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۱) تمام ذرائعِ پیداوار افراد کے ہاتھوں میں اس طرح آزاد ہوں کہ اُن کا مفاد مخصوص افراد
کے حق میں ثابت نہ ہو کر جماعت اور سماج کی اکثریت کے حق میں۔

---

[1] نازی ازم "نازیت" بھی اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ۱۲

(۲) پیداوار بجی فائدے کے اصول پر ہو نہ کہ عوام کی ضروریات کے فائدے کے اصول پر اور اس لئے ضروریات کے تخمینہ کی مطابقت کی بجائے ذاتی اغراض کے اندھا دھند طریقہ پر ہو۔

(۳) ان ہر دو مقاصد کو کامیاب بنانے کے لئے ایسے طرز حکومت کی طرح ڈالی جائے جس میں قوانین کے ذریعہ سرمایہ داری کی حفاظت و ترقی کا سامان فراہم ہو سکے

اس اجمال کی تفصیل کے لئے اول فاشیت یا فسطائیت کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ کائنات انسانی میں عادلانہ نظام کے مقابلہ میں سرمایہ دارانہ نظام نے ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں ابھرنے اور دنیا پر چھا جانے کی سعی کی ہے اور اسکو اپنی سعی میں کامیابی بھی ہوتی رہی ہے۔

قریبی زمانہ میں ایسی ہی کوشش کا ترقی یافتہ نظام "فسطائیت" کے نام سے موسوم ہے جو یورپ کی حکومتوں میں جرمنی اور اٹلی پر خصوصیت کے ساتھ حاوی ہے اور انگلستان و فرانس کو بڑی حد تک اس نے فتح کر لیا ہے اور امریکہ اور جاپان بھی اس کے لئے گہوارہ بنے ہوئے ہیں۔

یورپ میں تقریباً پندرھویں صدی عیسوی سے دور جہالت ختم اور دور علم و ترقی شروع ہو گیا تھا اور بعض یوروپین حکومتیں دنیا کی جدید دریافت اور حصول زر و مال کے لئے دھر ادھر تگ و دو میں منہمک نظر آنے لگی تھیں اس وقت انگلستان میں جاگیرداری اور شاہی استبدادیت کا دور دورہ تھا مگر آہستہ آہستہ تجارتی اور کاروباری طبقہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور بعض سیاسی حالات نے ان کی قوت کو اور مضبوط بنا دیا تھا اور وہ ملک کی بہت بڑی طاقت سمجھے جانے لگے تھے ان کا بیشتر کاروبار تجارت "اون کی تجارت" تھا۔ خاندان اسٹوارٹ جب انگلستان پر حکمراں ہوا تو اس نے ان تاجروں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف ہو کر تجارت پر قانونی پابندیاں عائد کرنی شروع کر دیں نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت پیشہ طبقہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور ۱۶۴۲ء میں انگلستان کی مشہور خانہ جنگی میں انھوں نے فتح پائی اور جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا اور شاہی نام کو برقرار رکھتے ہوئے شاہی اقتدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ان کو اپنی تجارت کے فروغ دینے کا کافی موقعہ میسر آیا اور قوانین حکومت کے ذریعہ ان کو بیش از بیش مدد ملی۔

اگرچہ انگلستان کے اس دور میں جاگیرداری سسٹم ختم ہو چکا تھا مگر تجارت کے اس دور میں تجارت کا مفہوم "عوام کی فلاح و بہبود" نہ تھا بلکہ مخصوص افراد اور خاص طبقہ کی برتری تھا۔ اس لئے اس طبقہ نے فاتی اور نجی کارخانے کھول کر دولت کمانی شروع کی اور قوانین کی مدد سے اس کی ترقی کے ممکن ذرائع بہم پہنچائے لیکن ابھی تک چونکہ کارخانوں میں صرف ہاتھ ہی سے کام ہوتا تھا اس لئے آمدنی بھی محدود ہوتی تھی اور مال بھی حسب ضرورت تیار نہ ہو پاتا تھا اور دولت و سرمایہ کے پجاری فراوانیٔ دولت کے دوسرے بہترین ذرائع کے لئے بیقراری کے ساتھ متلاشی نظر آتے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد یعنی اٹھارویں صدی کے آخر میں مشینوں کی ایجاد شروع ہو گئی اور اب دستی کارخانوں کی جگہ مشینری کارخانوں نے لے لی اور اس طرح ان تاجروں اور سرمایہ داری کے مخصوص طبقہ نے دولت کے بے شمار خزانے حاصل کرنے شروع کر دیئے۔

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب مشینوں کے ذریعہ کام شروع ہو گیا تو دستکاروں پر آفت نازل ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کو اپنا کام بند کر دینا پڑا اور افلاس کی مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے مشینری کارخانوں میں ایک "مزدور" کی حیثیت سے وہ اپنی "محنت" کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لئے مجبور ہوئے اور کارخانہ دار ہونے کی بجائے مشین مالک کے غلام بن کر رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔

اس واقعہ سے ہٹ کر پھر ایک مرتبہ چودھویں صدی عیسوی کی طرف نظر ڈالیے انگلستان میں "اون" کی تجارت کے فروغ پا جانے سے زمینداروں کو فراوانیٔ دولت کے لالچ نے مجبور کیا کہ وہ کاشتکاروں سے زمینیں خالی کرائیں اور ان میں "باڑے" قائم کر کے بھیڑوں کی پرورش کریں تاکہ "اون" کی تجارت سے فائدہ اٹھائیں جو زمینداری آمدنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی یہ وبا اس قدر پھیلی کہ ہزاروں لاکھوں کسان افلاس اور بھوک کا شکار ہونے لگے اور بیکاری ترقی پانے لگی۔

اب جبکہ مشینوں کا دور شروع ہوا تو زمینداروں نے کاشت بھی مشینوں کے ذریعہ شروع کر دی اور کسانوں کی رہی سہی معاشی بھیں کو اس طرح ختم کر دیا گیا اور اب انکے لئے بھی بجز غلامانہ مزدوری کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا اور پھر بھی ایک بہت بڑی تعداد کی قوتِ لایموت کیلئے سامان مہیا

نہ ہو سکا اور طرفہ یہ کہ مشینوں کے اس صنعتی انقلاب نے ان دونوں "کاریگروں" اور "کسانوں" کو دیہات و قصبات کی آزاد اور پُر فضا زندگی کو خیرباد کہہ کر شہروں کے غلیظ اور گندہ مقامات میں غلاموں کی طرح آباد ہونا پڑا۔

صنعتی ابتدائی کا یہ وہ ابتدائی دور تھا جس میں فیکٹریوں کے متعلق نہ قوانین تھے اور نہ مزدوروں کی ترقی یافتہ یونین تھیں (اس لئے) سرمایہ داروں نے من مانی حکومت کی اور اپنی فراوانی دولت کے لئے مزدوروں پر بے پناہ مظالم روا رکھے ـــــ ان سے چودہ سے لیکر سولہ سترہ گھنٹے تک عموماً کام لیا جاتا اور بعض اہم کاموں کے موقعہ پر مسلسل بیس سے تیس گھنٹے تک بھی ان کو مصروف رہنا پڑتا تھا اور اس طرح ضعیف و ناتوان افراد بہت جلد موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس بہیمانہ محنت کرانے کے بعد ان کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی اور رہنے کے لئے ایک چھوٹی کوٹھری یا ایسا کمرہ دیا جاتا تھا جس میں بمشکل لیٹنے کے لئے جگہ میسر آ سکتی تھی اور وہ غلاظت، عفونت اور کمرے میں ہوا کے نفوذ کے لئے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے جہنم زار بنے ہوئے تھے

یہ سرمایہ داری کا وہ بھیانک نقشہ ہے جو سب سے پہلے انگلستان میں بروئے کار آیا اور اسکے بعد یورپ کی تمام حکومتوں پر "اصول" بنکر چھا گیا۔ چونکہ سرمایہ داری کے اس سسٹم میں مفادِ عامہ اور عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بلکہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے ...... ناجائز فائدہ اٹھا کر تمام ذرائعِ پیدائش کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے خاص کر لیا جاتا تھا اس لئے فیکٹریوں اور مشینوں میں جو سامان تیار ہوتا تھا وہ کم سے کم اجرت دے کر زائد سے زائد مال تیار کرانے اور دوگنی فائدہ حاصل کرنیکے اصول پر عالم وجود میں آتا تھا اس لئے گوداموں میں مال کی فراوانی ہونے لگی اور نکاسی کی محدود راہوں کی وجہ سے مال ضائع ہونے لگا نیز اس فراوانی سے مزدوروں اور غریبوں کو یہ مطلق فائدہ نہ پہونچا اور وہ اپنی ضروریات کے لئے ان چیزوں کی خریداری سے اب بھی اسی طرح محروم رہے جس طرح مال کے بنانے کے ابتدائی دور میں تھے[1]

[1] یہ بات کہ مشینوں کی بدولت کثرت سے مال تیار ہوتا اور گوداموں کے پڑ ہو کر مال کے ضائع جانے تک کی حالت میں مزدور اور غریب کی قوت خرید اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی اور سابق بدحالی ہی میں گذارتی ہے تفصیل طلب اقتصادی مسئلہ ہے جو قوت خرید اور توازن تیاری مال کی بحثوں پر مبنی ہے اس کے لئے اقتصادی معلومات کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے (مصنف)

لہٰذا سرمایہ داری کے اس بھوت نے دوسرے ممالک پر لالچ اور حرص و آز کی نگاہ ڈالنی شروع کر دی اور "ھل من مزید" پکارتے ہوئے ان کو محکوم بنانے کے لئے قدم آگے بڑھایا اور اپنی جوع الارض و زمین کی بھوک کو پورا کرنے کے لئے اپنے ملک کے آزاد کاروباری لوگوں کو غلام بنانے کے بعد کمزور ملکوں اور قوموں کو غلام بنانا شروع کر دیا اور اٹھارویں اور انیسویں صدی میں افریقہ جیسے برِ اعظم میں یورپین نو آبادیات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہندوستان جیسا بڑا ملک بھی آخر اسی استعمار کی نذر ہو گیا اور اس طرح تھوڑے سے عرصہ میں ساری دنیا ایک طرح انگلستان کے سرمایہ داروں کی خصوصاً اور دوسرے سرمایہ دار طاقتوں کی عموماً تجارتی منڈی بن گئی۔

ذرائع پیداوار کو مخصوص طبقے کی ذاتی ملکیت قرار دینے اور عوام کی بہبودی سے قطع نظر ان کی پیداوار کو نجی اور انفرادی مفاد کی بھینٹ چڑھا دینے کا یہ سسٹم اب بھی مطمئن نہیں ہے اور اب خود آپس میں دست و گریباں نظر آتا ہے ہر ایک ملک اپنی اس تجارتی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے جانا چاہتا ہے اور اس دوڑ میں آزاد قوموں کو غلام بنانے، تباہ و برباد کرتے اور صفحۂ دنیا سے مٹا دینے کو بھی اپنا جائز حق تصور کرتا ہے۔ جرمنی، اٹلی، انگلستان، فرانس، جاپان، امریکہ وغیرہ ذاتیت حکومتوں کی اس مسابقت میں عراق، البانیہ، فلسطین، زیکوسلواکیا، چین اور خود فرانس کا جو حشر ہوا اور ہو رہا ہے وہ اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔[1]

[1] اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت تو اس جنگ عظیم نے بہت ہی بھیانک نقشہ تیار کر دیا ہے اور جوع الارض میں مسابقت اور تگ و دو کے نتیجے نے ان طاقتوں کی باہمی رقابت کو ہلاکتِ عالم کا اجارہ دار بنا دیا ہے "ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس" "خشکی اور تری میں جو فساد برپا ہے یہ انسانوں کے خود اپنے ہاتھوں کا کمایا ہوا ہے" اور اب جب کہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے بساطِ جنگ پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کا فاشزم اور نازی ازم تو شکست کھا کر موت کی آغوش میں جا چکا ہے اور برطانیہ اور امریکہ کی مفروضہ ڈیماکریسی (جمہوریت) فریب آمیز رنگ میں اسی فسطائیت اور نازیت کا نفرت انگیز مظاہرہ کر رہی اور ضعیف اقوام کو غلام رکھنے میں ہولناک استبداد کا ثبوت دے رہی ہے اور حیرت انگیز بات یہ کہ روس جو عوام کی فلاح اور انسانی مساوات کا علم بردار بننے کا دعویٰ کرتا ہے اپنی ملکی مصالح کے پیش نظر ان دونوں کا حلیف اور معین بنا ہوا ہے "ان ھذا لشیء عجاب"۔

اس تفصیل سے اب آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ "سرمایہ داری نظام" (فسطائیت) کیا ہے اور یہ کس طرح آہستہ آہستہ عوام کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا اور امنِ عالم کو جنگ کی شعلہ زا ہولناکیوں میں ڈال کر خاکستر بنا دیتا ہے۔ یہ شروع میں تو اپنی شکل و صورت کو جمہوریت کی نام نہاد شکل و صورت میں چھپا کر دنیا کے سامنے آتا ہے اور پس پردہ عوام کو تباہ کرتا ہے جیسا کہ انگلستان اور امریکہ میں نظر آتا ہے اور جب اس کا مفاد اس شکل و صورت میں خطرہ میں پڑنے لگتا ہے تو صاف کھل کر خالص (آمریت) ڈکٹیٹر شپ کے اصل رنگ و روپ میں ظاہر ہو جاتا ہے جیسا کہ جرمنی، اٹلی، اور جاپان میں ہو رہا ہے۔

اس لئے ایک لمحہ کے لئے بھی دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ یہ جمہوری حکومتیں فیسزم (فسطائیت) سے الگ کوئی چیز ہیں بلکہ ڈکٹیٹرشپ ہو یا موجودہ جمہوری نظام ان سب میں وہی سرمایہ دارانہ نظام کارفرما ہے اور ان سب کے پیشِ نظر یہی ایک مقصد ہے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو — آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(اقبال)

غرض تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا انگلستان سے ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ تمام یورپ پر چھا گیا اور آج جرمنی و اٹلی اس کے بہت بڑے عالم تسلیم کئے جاتے ہیں اور مملکتِ انگلستان و امریکہ بھی اصولاً ان کی تائید ہی میں ہے اور اگرچہ اس وقت حریف باہمی مسابقت میں رقیب نظر آتے ہیں لیکن اصل میں متحد ہیں اور اس طرح جرمنی کا نازی ازم جمہوریت امریکہ برٹش ڈیماکریسی و شاہی نظام، اٹلی کی فسطائیت اور جاپان کا شاہنشاہیت پسند نظام یہ سب ایک ہی قسم کی سرمایہ داری کے مختلف نام یا ایک ہی صورت کے مختلف رنگ روغن ہیں۔

اس تفصیل کے بعد بآسانی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مقابلہ میں فسطائیت کو پیش کرنا در اصل "اقتصادی نظام" کی توہین کرنا ہے۔

اسلام میں اگرچہ پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت ایک حد تک جائز رکھی گئی ہے لیکن اس کا جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ انفرادی ملکیت اجتماعی مفاد سے کسی حال میں متصادم نہ ہونے پائے بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے ممد و معاون اور باعثِ تقویت ثابت ہو اور جس جگہ اس تصادم کا غالب گمان ہو، وہاں اس کے مقابلہ میں اجتماعی مفاد کو ترجیح دی جائے اس لئے محض جزئی مشابہت سے اسلامی نظام کو فاشیت کے ہمنوا قرار دینا یا اس سے قریب تر ثابت کرنا اسلام پر بہت بڑا ظلم اور حد درجہ ناانصافی ہے ذیل کے نقشہ سے اس کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام	فسطائی اقتصادی نظام
(۱) دولت و ذرائع دولت کا مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر عوام کی معاشی ہلاکت کا باعث بننا حرام ہے	(۱) دولت و ذرائع دولت کو مخصوص طبقے کی انفرادی و اجتماعی اغراض کے لئے ہونا از بس ضروری ہے
(۲) انفرادی ملکیت پر شرائط کی حدود عائد ہیں	(۲) انفرادی ملکیت لامحدود ہے۔
(۳) انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق کے زیر اثر ہے۔	(۳) انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق اور مفادِ عامہ سے مستغنی و بالاتر ہے
(۴) اقتصادی نظام کی بنیاد عوام کے مفاد اور حاجات کے انسداد پر قائم ہے	(۴) اقتصادی نظام کی بنیاد مخصوص افراد اور خاص طبقہ کے مفاد پر قائم ہے۔
(۵) عام معاشی خوشحالی ضروری ہے	(۵) عوام کی معاشی تباہی و کساد بازاری اس کا لازمی نتیجہ ہے
(۶) معاشی دستبرد کے ذریعہ حاکمیت و محکومیت اقوام لعنت ہے	(۶) معاشی دستبرد کے ذریعہ غلامی اور اقوام کی محکومی لازم و ضروری ہے۔
(۷) اکتناز (جمع خزانہ) و احتکار (اجتماعی حقوق سے باز رہنا) کی مطلق گنجائش نہیں	(۷) اکتناز و احتکار ضروری اور موجبِ سعادت امور اقتصادی ہیں۔

(۸) نسلی، خاندانی، طبقاتی اور جغرافیائی امتیازات اس سلسلہ میں قابلِ تسلیم نہیں۔	(۸) نسلی جغرافیائی اور طبقاتی امتیازات ضروری ہیں۔

اس موازنہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام اور فسطائی سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان کوئی ایسی مشترک کڑی نہیں پائی جاتی جس کی بدولت ان دونوں میں کسی قسم کی بھی مفاہمت ممکن ہو سکے اس لئے یہ ایک مسلم امر ہے کہ ایسے نظام کو اسلامی اقتصادی نظام کے ساتھ کسی طرح نہیں جوڑا جا سکتا جو چند سو یا چند ہزار یا چند لاکھ انسانوں کی خوشحالی، عیش پسندی، اور راحت کوشی کی قربان گاہ پر کروڑوں انسانوں کو بھینٹ چڑھا دے اور صرف یہی نہیں بلکہ عام کساد بازاری اور بیروزگاری کا باعث بنکر دنیا کے امن و امان کی تباہی و بربادی اور مظلوموں کو محکوم بنا کر ظالم کے ہاتھوں ہلاکت آفرینی کا موقع بہم پہنچائے۔

اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کے اس ظالمانہ دستبرد نے آخر مزدوروں اور غریبوں میں بھی شعور، احساس اور بیداری کا جذبہ پیدا کر دیا اور انھوں نے ردعمل کے طور پر حقوق کے نام سے شور و غوغا مچایا، مجالس اور یونینیں قائم کیں، بغاوتیں کیں اور اٹھارویں صدی کے آخر ہی سے سوشلزم کے نظریہ ان کی حمایت شروع کر دی اور روس جیسے بڑے ملک میں اس بیسویں صدی میں انقلاب برپا ہونے کے بعد کارل مارکس کے نظریہ "سوشلزم" کے ماتحت جدید اقتصادی نظام بھی قائم ہو گیا جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مفاد عام کا داعی اور مزدوروں، کسانوں اور پست و مظلوم طبقوں کا حامی ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کا اس سے بھی موازنہ کیا جائے اور محض تقلید کے اتباع اور حسن ظن کی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ دونوں نظامہائے اقتصادی کے اصولوں اور عملی تجربوں کے زیر اثر عدل و انصاف کے ساتھ محاکمانہ اور تبصرہ کیا جائے۔

ابھی کہا جا چکا ہے کہ سوشلزم کی تاریخ کا آغاز بھی اٹھارویں صدی کے اواخر سے ہی ہو جاتا ہے، ہیگل نے اس کو اول ایک "علمی نظریہ" کی شکل میں پیش کیا اور اقتصادی اُمور میں بنیاد قرار دیا اور اس کے اس نظریہ کو اقتصادی زندگی بخشنے، بلکہ معاشرتی اصول بنانے اور تمدنی پروگرام

میں ڈھالنے والا شخص "کارل مارکس"[1] ہے اور یہی نظریہ آج کل "کمیونزم" کی شکل میں روس پر حاوی ہے اور دنیا میں انقلاب برپا کرنے میں مشغول و مصروف نظر آتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں جو اشارات اس سلسلہ میں سپرد قلم کئے گئے ہیں ان سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جس مکمل قانون کا نام ہے اس کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا بھی رابطہ اتحاد ناممکن ہے اس لئے کہ کارل مارکس اور دوسرے اشتراکی رہنماؤں نے جس فلسفہ پر (مارکسزم) کی بنیاد قائم کی ہے اس میں خدا سے انکار اور الہیات کی نفی صف اول میں جگہ پاتے ہیں اور اس لئے اس کا علم الاخلاق بھی اسی روشنی میں مہذب و مرتب کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس کے فلسفہ لادینیت کے ساتھ اسلام کا کوئی رابطہ اور تعلق قائم نہیں ہو سکتا لیکن جب ہم اس فلسفہ کے فقط اقتصادی پہلو سے بحث کرتے ہیں اور دنیا کے دوسرے غیر اسلامی نظام ہائے معاشی کے مقابلہ میں اس کو پیش نظر لاتے ہیں تو اس وقت ہم کو اس حقیقت ثابتہ کے اظہار میں کوئی باک نہ ہونا چاہیئے کہ اس میں شک نہیں کہ اقتصادی نظام کے بہت سے امور میں اسلام اور اشتراکیت باہم متقارب نظر آتے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف دونوں ہم آہنگ ہیں اگرچہ طریق کار کے اختلاف سے دونوں کی راہیں اس وادی میں قطعاً جدا جدا ہیں۔

اسلامی نظام اقتصادی اور اشتراکی نظام اقتصادی کے درمیان جن امور میں اتفاق ہے وہ حسب ذیل ہیں

(۱) اکتناز و احتکار یا جمع دولت کا مذموم طریق کار اور مخصوص طبقہ میں دولت کی تحدید نہ جائز قرار دیتا ہے اور نہ وہ۔ دونوں ان ہر دو امور کو باطل اور اقتصادی زندگی کے لئے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

(۲) دونوں ضروری سمجھتے ہیں کہ اقتصادی نظام کی اساس و بنیاد عام معاشی مفاد پر قائم ہو اور ہر شخص کو معاش سے حصہ ملے اور کوئی شخص بھی اس سے محروم نہ رہے۔

(۳) دونوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اقتصادی نظام کے دائرہ میں تمام انسانی دنیا جغرافیائی، طبقاتی اور نسلی و خاندانی امتیازات سے یکسر جدا ہو کر یکساں اور برابر حیثیت میں شمار ہو۔

[1] اور فریڈرک انگلز کی علمی و عملی جدوجہد کا بھی اس تحریک میں بہت زیادہ دخل ہے۔

(۴) ان دونوں کے درمیان اس میں بھی اتفاق ہے کہ جماعتی حقوق، انفرادی حقوق پر مقدم ہوں

(۵) ان دونوں کے درمیان یہ بھی مسلم ہے کہ معاشی دستبرد کے ذریعہ حاکم و محکوم اور غلام و آقا کا سسٹم قائم نہ ہو سکے اور قائم شدہ کو مٹا دیا جائے۔

یہ وہ امور ہیں جن میں دونوں اقتصادی نظام ہم آہنگ نظر آتے ہیں لیکن دو امر ایسے ہیں کہ جن میں ان دونوں کے درمیان بنیادی اور اساسی اختلاف ہے اور ان ہر دو امور میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح مطابقت پیدا نہیں کی جا سکتی اور یہ اختلاف اس وقت اور زیادہ وضاحت کے ساتھ رونما ہو جاتا ہے جب کہ سوشلزم کا آخری درجہ "کمیونزم" کی شکل میں سامنے آتا ہے اور جس کا تجربہ آج کل روس میں کیا جا رہا ہے۔

اسلامی اقتصادی نظام	اشتراکی اقتصادی نظام
(۱) دولت و ذرائع دولت میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حدود قائم کر دی جائیں	(۱) دولت و ذرائع دولت سے انفرادی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔
(۲) حق معیشت کی مساوات کے اعتراف کے ساتھ بلحاظ معیشت، اختلاف مدارج تسلیم کرتے ہوئے احتکار کو روکا جائے۔	بلحاظ معیشت اختلاف درجات کا انکار کیا جائے اور معاشی لحاظ سے بھی سوسائٹی میں مساوات تسلیم کی جائے۔

پہلا اختلافی مسئلہ اس طرح قابل غور ہے کہ اگر آمدنی اور ذرائع آمدنی پر انفرادی ملکیت کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو عقل اور تجربہ اس طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ ایسا ہو جانے کے بعد ذرائع پیداوار اور آمدنی میں بہت بڑا اختلال اور اضمحلال پیدا ہو جائیگا اس لئے کہ انفرادی ملکیت کے نظام کو یکسر تباہ و برباد کرنے اور اس تمام سلسلہ کو اسٹیٹ کے حوالہ کر دینے کے بعد انسانوں کے قوائے عمل میں وہ زبردست تحریک پیدا نہیں ہو سکتی جو انفرادی ملکیت کی مسابقت کی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ جبکہ میری تمام جد وجہد اور حاجات و ضروریات کا عملی نظام اسٹیٹ کے ذمہ اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے تو میں کس لئے اپنے قوائے دماغی، قوائے جسمانی، اور

قوائے عملی کو زیادہ محنت میں لگاؤں اور تنازع للبقا کے اس میدان میں کس لئے گوئے مسابقت حاصل کرنے کی سعی کروں۔

لیکن اس کے برعکس انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے باہمی مسابقت اور دوڑ میں جو خرابی پیدا ہونے اور اجتماعی نقصانات کے بروئے کار آنے کے اندیشے پائے جاتے ہیں اگر ان کا انسداد ضروری قرار دے کر قوائے عملی و دماغی کو بھی اپنی فطری نشوونما کے مطابق کام کرنے کے لئے موقع بہم پہنچایا جا سکے تو یہ طریق کار ہی صحیح طریق کار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ روس کے دس سالہ پروگرام کی ترمیم نے بھی اس کی تصدیق اس طرح کر دی ہے کہ بہت سی زمینیں معطل رہ جانے اور ذرائع پیداوار میں رفتار کے سست پڑ جانے کی وجہ سے اب دس سالہ پروگرام میں ایک حد تک زمینوں میں انفرادی قبضہ کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور بعض بعض مقامات پر ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت داخل ہونے لگی ہے اور تجربے سے حقائق تک پہنچنے کی اگر یہی طلب صادق رہی تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ اسلام کے نظریہ اور اصول ہی کو اصولِ کار بنانا پڑے۔

اس لئے قرآنِ عزیز نے باوجود اس بات کے تسلیم کر لینے کے کہ "اصل ملکیت صرف خدا کی ہے اور اسی لئے تمہاری انفرادی ملکیت میں خدا کی عام مخلوق کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس میں اجتماعی حقوق مقدم ہیں" ذاتی ملکیت کا اعتراف و اقرار کرتے ہوئے انسان کے فطری قوائے عملی و دماغی میں مسابقت کا جذبہ پیدا کیا اور اُن کو کشمکش حیات میں داخل کر کے ان پر حصول مال کی راہیں کھول دیں نیز عقل و تجربہ کی بنا پر یہی راہ صحیح اور درست ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا جائے اور پھر اس پر اجتماعی بوجھ ڈالا جائے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝	تم ہرگز بھلائی کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے پسندیدہ اور محبوب مال میں سے خرچ نہ کرو۔

اور قانونی و غیر قانونی ضابطوں کے ذریعہ انفرادی ملکیت کا رُخ بھی اجتماعی فلاح اور بہبودی عامہ کی طرف پھیر دیا جائے۔

اس موقعہ پر اس اندیشہ کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اگر پیداوار اور ذرائع پیداوار میں انفرادی ملکیت کے لیے ادنیٰ سی بھی گنجائش نکل آئے گی تو پھر مذموم سرمایہ دارانہ نظام کو اس سوراخ سے سر اٹھانے کا موقعہ ہاتھ آجائے گا لیکن یہ اندیشہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ یہ ایسی حالت میں ضرور ممکن ہے کہ انفرادی ملکیت تو کسی حد تک تسلیم ہو لیکن اس کے غیر محدود ہونے اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے حیلہ بن جانے کے انسدادی قوانین موجود نہ ہوں لیکن جب اسلام انفرادی ملکیت کو محدود صورت میں تسلیم کرنے کے بعد اقتصادی نظام میں ایسی دفعات قانونی بھی بیان کرتا ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت پر قابو پانے سے روکتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا سر کچلنے کے لئے اپنے قانونی تیشہ سے کام لیتی رہتی ہیں تو پھر ایک وہمی اندیشہ کی بناء پر انسانوں کو ان کے فطری حق سے روک دینا ظلم ہے اور راہِ عدل سے ہٹ کر افراط و تفریط کے غار میں گر جانا ہے۔

دوسرا اختلاف "معیشت کے درجات سے" متعلق ہے اسلام حقِ معیشت کی مساوات کو تو تسلیم کرتا بلکہ ضروری قرار دیتا ہے لیکن مدارجِ معیشت میں مساوات کا قائل نہیں ہے یعنی وہ اس کو نہیں مانتا کہ یہ ضروری ہے کہ سب کو ایک ہی طرح پر سامانِ معیشت حاصل ہو لیکن یہ ضروری سمجھتا ہے کہ سب کو ملے اور جد و جہد اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر سب کے سامنے کھل جائیں اس کے برعکس سوشلزم حقِ معیشت کی مساوات کے ساتھ ساتھ نفسِ معیشت کی بھی مساوات کا قائل ہے اور مدارجِ معیشت کا قطعاً انکار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ احوالِ معیشت کا یہ اختلاف قدرتی نہیں ہے بلکہ سوسائٹی کا خود پیدا کردہ ہے پس اگر آئندہ سوسائٹی کا نظامِ معیشت مساوات کے اصول پر قائم کر دیا جائے تو دوسری طرح کے محرکاتِ ذہنی پیدا ہو جائیں گے اور کارخانۂ معیشت کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں گی جس طرح آج جاری ہیں۔

اس دوسری صورتِ اختلاف کو بھی غائر نظر سے دیکھا جائے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ اس میں بھی اسلام کی بتائی ہوئی راہ ہی صحیح ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں ہے اور جب استعداد یکساں نہیں ہے تو سعیِ معیشت کے نتائج و

ثمرات کا اختلاف بھی ضروری اور ناگزیر ہے اور ایسی صورت میں سوسائٹی کا ایسا نظام قائم کرنا جس کی بنیاد معیشت کی مساوات پر ہو کسی طرح بھی صحیح اور درست نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ناقابل قبول ہے کہ اس قسم کے نظام کے بعد ذہنی و معنوی محرکات میں بھی ایسی تبدیلی ہو جائے گی کہ جس سے معیشت کا کارخانہ اسی سرگرمی سے جاری رہے گا۔

بہر حال جسمانی و دماغی استعداد کے اختلاف کو مان لینے کے بعد معیشت کا اختلاف بھی فطری ہو جاتا ہے اسی لئے قرآنِ عزیز نے اس طرف راہنمائی کی ہے کہ یہ اختلاف قدرتی ہے اور کارخانۂ عالم کی فطری قوتوں کے ابھرنے اور ترقی پانے کے لئے ایسا ہونا ضروری تھا اگر یہ نہ ہوتا تو سب کی حالت یکساں ہوتی تو مسابقت اور مزاحمت کی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اور ان قوتوں کو ابھرنے کا موقعہ کبھی نہ ملتا اور اگر یہ موقعہ میسر نہ آتا تو اجتماعی زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں سرد ہو کر رہ جاتیں جس پر نظامِ عالم کا یہ کارخانہ چل رہا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (نحل)

اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (زخرف)

ہم نے دنیوی زندگی میں ان کی معیشت تقسیم کردی اور ان سب کو یکساں درجہ میں نہیں رکھا بلکہ بعض کو بعض پر برتری دی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (فاطر)

اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بلا شبہ تمہارا پروردگار (بد عملیوں کی) فوراً سزا دینے والا ہے اور بلا شبہ وہ بڑا ہی بخش دینے والا رحمت والا ہے۔

ان تمام آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے اس چکر میں ایک دوسرے کی

جانشینی کا سلسلہ قائم ہے یعنی ایک جاتا ہے دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اس کے ثمرات کا وارث بنتا ہے اور یہ کہ تمام انسان درجہ کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں نیز یہ کہ معیشت کے مدارج کا یہ تفاوت اس لئے قائم کیا گیا ہے تاکہ انسان کو اس کے عمل و تصرف میں آزمایا جائے اور اس کو یہ موقعہ دیا جائے کہ جس درجہ کو وہ اپنی سعی عمل سے حاصل کر سکتا ہے کر لے اور یہ بھی امتحان لیا جائے کہ وہ ان تفاوتِ درجات کی موجودگی میں کس حالت میں خدا سے غافل رہتا ہے اور کس حالت میں نہیں رہتا۔

الحاصل اسلام کے اقتصادی نظام اور سوشلزم کے اقتصادی نظام کا مقصد اگرچہ ایک نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ عام انسانی افراد کی ملی تباہی، افلاس اور بدبختی کو دور اور ان کی بھاری اکثریت کی بدحالی کو ختم کیا جائے اور دونوں نے علاج بھی ایک ہی تجویز کیا ہے کہ مذموم سرمایہ داری کو رُوبہ کار نہ آنے دیا جائے یعنی "جمع دولت" اور "اکتناز" کو باقی نہ چھوڑا جائے لیکن طریق کار میں دونوں کے درمیان یہ دو بنیادی اختلاف ضرور پائے جاتے ہیں کہ ایک معیشت کے اختلاف کو قبول کرتا اور انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور دوسرا ان دونوں کا انکار کر کے ان کو فنا کرنا چاہتا ہے۔

اسلام نے حقِ معیشت کی مساوات کو تسلیم کیا اور سعی و ترقی کی راہیں سب کے لئے یکساں طور پر کھلی رکھیں اور اس نے "احتکار" کی وہ تمام رکاوٹیں ختم کر دیں جن کی بدولت خاص افراد یا گروہ نے کمزور افراد اور گروہ کی خوشحالی و ترقی میں قائم کر رکھی تھیں اس نے قانون سازی کے ذریعہ زکوٰۃ اور وراثت اور بعض تجارتی اصول کو لازم قرار دے کر اور سود اور قمار اور اس قسم کے تمام کاروبار کو ناجائز بتا کر اکتناز و احتکار کو فنا کر دیا اور تمام ایسی غیر معتدل راہوں کا سدِ باب کر دیا جو ظالمانہ سرمایہ داری کا موجب بنتی ہیں۔

ان تفصیلات کے ساتھ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سوشلزم کے مسطورہ بالا ہر دو اصول دراصل اس نظام اور اس سوسائٹی بلکہ اس مذہبی گروہ کے مقابلہ میں انتقامی جذبات کے ماتحت اصول قرار پائے ہیں جن کے ظالمانہ ماحول سے متاثر ہو کر کارل مارکس اور اینگلز نے اپنے نظریوں اور ان کے ماتحت عملی سرگرمیوں کا اختراع کیا ورنہ یہ ہر دو اصول نہ عملی تجربہ کی خراد پر ٹھیک اترتے ہیں اور نہ عقلی دلائل

کی روشنی میں صحیح نظر آتے ہیں اور اس لئے راہ حق کے قطعاً خلاف اور اعتدال کے منافی ہیں۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا مختصر خاکہ

اب ان تمام اپن داں کے بعد اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی اور اصولی خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے

(۱) اکتناز (جمع دولت) اور احتکار (خاص افراد یا طبقات میں دولت کا محصور ہو جانا) ممنوع ہے یعنی سرمایہ داری کے مسطورہ بالا طریقوں کو کسی حال میں وجود پذیر نہ ہونے دیا جائے اور اگر پہلے سے موجود ہوں تو ان کو فوراً فنا کر دیا جائے اور اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے قانونی اور اخلاقی طور پر زکوٰۃ، وراثت، وقف، انفاق فی سبیل اللہ کو نافذ کیا جائے سود اور اس کی تمام شکلوں، قمار اور اس کی تمام صورتوں کو ممنوع اور موجودہ تعلقہ داری کے جابرانہ سسٹم کو ختم کر دیا جائے۔

(۲) معیشت میں اختلافِ مدارج کو تسلیم کرتے ہوئے حقِ معیشت میں مساوات کو ضروری اور فطری عقیدہ تسلیم کیا جائے تاکہ سرمایہ اور محنت میں صحیح توازن قائم رہ سکے اور سرمایہ کسی وقت بھی محنت کو اپنی خود غرضانہ ہوس کا آلۂ کار نہ بنا سکے اور عام خوشحالی پیدا ہو جائے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے ان تمام قوانین کو ضروری قرار دیا جائے جو کانوں، کارخانوں، فیکٹریوں اور امداد باہمی کی سوسائٹیوں کے لئے بیان کئے جا چکے ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کو قوت پہنچانے والے تمام کاروبارِ تجارت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

(۳) انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایسی قیود اور پابندیاں عائد کی جائیں جن سے اس کا منافذ اجتماعی مفاد کے زیر اثر آ جائے اور خود غرضانہ جراثیم کو کسی قسم کی مدد نہ ملنے پائے اور اس کو قائم کرنے کے لئے شخصی زمینوں، ذاتی کمپنیوں اور ذاتی تجارتوں سے متعلق بیان کردہ احکام کو نافذ کیا جائے۔

(۴) ان اصولوں کو قائم کرنے کے لئے ایسے طرزِ حکومت کو رائج کیا جائے جو زمین پر خدائے برتر کے "عدل" کا نائب ہو، خدا کی مخلوق (پبلک) کے سامنے جواب دہ ہو، حاکمیت کی جگہ خدمت اس کا نصب العین ہو، رعایا کے ہر فرد کی معاش کا متکفل ہو، عوام کا نمایندہ ہو اور عادلانہ نظام کے

قوانین کی تنفیذ کے علاوہ تمام اُمور میں خلیفہ، عُمّال حکومت اور رعایا کے حقوق" اس میں "یکساں ہیں اور اس طرزِ حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے بیت المال، سرکاری وظائف، اعداد و شمار کی تکمیل اور اسی قسم کے دوسرے بیان کردہ وسائل و ذرائع کو اختیار کیا جائے اور موجودہ تمام جابرانہ و سرمایہ دارانہ نظامہائے حکومت اور ریاستی سسٹم کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا جائے۔ لہ

اس اجمالی خاکہ کو مندرجہ ذیل اجمالی نقشہ کی شکل میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا اجمالی نقشہ

اعلاء کلمۃ اللہ و خدمتِ خلق

(۱) ہر شخص کی معاشی کفالت کے اصول پر شوروی حکومت کا قیام	(۲) خلیفہ، عُمّالِ حکومت اور رعایا کے اقتصادی حقوق میں یکسانیت و مساوات کے اصول کا لزوم	(۳) بیروزگاروں اور حاجتمندوں کی کفالتِ عام عسکری نظام کی ضرورت، اور اجتماعی خدمت کے پیش نظر اعداد و شمار کی ترتیب و وظائف کا قیام
(۴) زکوٰۃ، میراث، وقف اور انفاق کے بنیادی اصول پر اکتناز یعنی سرمایہ داری کا انسداد	(۵) سود، قمار، منشیات کی بیع و شرا، تجارتی و صنعتی بدعنوانیوں کی قانونی اور حرمت کے اصول پر احتکار، سرمایہ داری کے دوسرے نقطہ کا انسداد	(۶) کانوں، فیکٹریوں، کارخانوں، ملوں وغیرہ میں انفرادی حقوق کے مقابلہ میں اجتماعی حقوق کی ترجیح کا اعتراف و قیام اور اس کی عملی تشکیل

لہ لطیفہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرماتے ہیں، یہ مکاشفہ ان کو اس وقت ہوا تھا جب وہ مدینۃ الرسول میں حاضر ہوکر دربار قدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے مستفیض ہو رہے تھے فرماتے ہیں۔
مجھ پر نیند میں ایک کیفیت طاری ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نظامِ عالم میں خدا کی مشیت کو پورا کرنے کے لئے امام بنا دیا گیا ہوں (اس کے بعد غلبہ کفار اور مسلمانوں کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں) اس غیظ و غضب کی حالت میں مسلمانوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اب اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے "ماذا حکم اللہ فی ھذہ الساعۃ" میں نے جواب دیا فک کل نظام یعنی کسی عادلانہ نظام قائم کرنے سے پہلے سب سے اہم فرض یہ ہے کہ انقلاب پیدا کرکے موجودہ دنیا کے تمام نظامہائے حکومت کو درہم برہم کر دیا جائے۔ (فیوض الحرمین ص ۸۹)

(۷) انفرادی ملکیت کے لئے تجارت اور دیگر کاروبار میں شرکتِ نفع کے اصول پر سرمایہ و محنت کے عادلانہ توازن کا قیام	(۸) آمدنی و ذرائعِ آمدنی میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے سرمایہ داری کے اصول کے انکار پر اُن کی تحدید و تعیین	(۹) مدارجِ معیشت کے اعتراف کے ساتھ طبقاتی، نسلی و جغرافیائی قسم کے امتیازات کے انسداد کے اصول پر حقِ معیشت میں یکسانیت مساوات کا قانونی قیام
(۱۰) ریاستی و تعلقہ داری سسٹم کا انسداد	(۱۱) امدادِ باہمی کے اصول پر غیر سودی انجمنوں کے قیام اور شرکتِ نفع کے صحیح اصول پر تجارتی کاروبار کا فروغ	(۱۲) غیر سرمایہ دارانہ اصول پر تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے لئے اسباب کی فراہمی کا لزوم و وجوب
(۱۳) حریفانہ معاشی دستبرد کے انکار اور اخوتِ عام کے اصول پر غیر ترجیحی اور آزادی تجارت کی حمایت	(۱۴) کاروبار کے لئے سکہ و ٹکسال کا قیام اور عوام کو ٹکسال میں سکہ بنوانے کی اجازت اور شرحِ تبادلہ میں عادلانہ اصول کا اجراء	(۱۵) رفاہِ عام، اجتماعی ضروریات انفرادی حاجات اور حکومت کی ضروریات کی کفایت کے لئے بیت المال کا قیام

(۱۶) خلیفہ، عمالِ حکومت اور تمام انسانوں میں عیش پسندی کے وسائل کو قانون و اخلاق کے ذریعہ مٹا کر سادہ زندگی کی شاہراہ پر قائم کرنا۔

پس جس اقتصادی نظام میں افراط و تفریط کا شائبہ نہ ہو اس کی اساس و بنیاد ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر انتقامانہ جذبات پر قائم نہ ہو وہ ایسے طرزِ حکومت کا حامی ہو جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے مساوی حقوق کا حکم دیا گیا ہو۔ وہ تمام انسانوں کی معاشی زندگی کا متکفل اور خوشحالی کا ضامن ہو مخصوص افراد و طبقات میں جمعِ دولت اور حصرِ دولت کے وجود کو فنا کرتا اور اکتناز و احتکار کی بنیادوں کو مٹاتا ہو۔ وہی اس قابل ہے کہ دنیا کی معاشی زندگی کا کارخانہ بہتر طریقہ پر چلا سکے اور سرمایہ و محنت کی کشمکش کا عمدہ طور پر حل کر سکے اور اس کا دائرۂ عمل ہمہ گیر اور عالمگیر ہو اور وہی دنیا کی اقتصادی ساکھ کو بحال کر کے عام خوشحالی اور سرور زندگی کا ضامن بنے ـــــ ایسے ہی "نظام" کا دوسرا نام

اسلام کا اقتصادی نظام ہے اور اسی کی سربلندی کی دعوت میری اس جنبشِ قلم کا مقصدِ علمی اور منتہائے اعلےٰ ہے۔

واللہ بصیرٌ بالعباد — اور اللہ اپنے بندوں کا خود دیکھنے والا ہے۔

احساسِ فرض/ میری اس کد و کاوش کا مقصد محض علمی تفریح اور اسلامی لٹریچر میں اضافہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک صدائے قلب ہی جو صرف اس لئے تہ قلب سے نکل کر نوک قلم پر آئی ہے کہ تمنا اور آرزو ہے کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے پھر اس بھولے ہوئے سبق کی یاد تازہ ہو جس نے تیئس سالہ پاک حکومت کے دور میں ایران، فارس، سندھ و مکران، روم، مصر، شام، عراق اور سرزمینِ عرب کے گوشہ گوشہ میں امن و اطمینان، خوشحالی و خوشدلی پیدا کر دی تھی اور جس نے سرمایہ و محنت اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان عدل کی ترازو اس طرح قائم کی تھی کہ اس دور میں نہ طبقاتی جنگ کی ضرورت پیش آئی اور نہ موجودہ کشمکش ہی کا ہنگامہ برپا ہوا۔ کیونکہ وہاں نہ سرمایہ داری کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ غریبوں کو اپنی اغراض پر قربان کر سکے اور نہ مزدور محنت کش کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ غیر کی ملکیت پر قابض ہونے کے خواب دیکھے بلکہ اس نظام ہی تمام ملکوں، شہروں اور آبادیوں میں ایک ایسی درمیانی حالت قائم ہو گئی تھی کہ اختلافِ مدارج کے باوجود سب خوش حال تھے، چین و آرام ہر ایک کو میسر تھا زکوٰۃ و خیرات دینے والے بہت تھے مگر لینے والا ایک بھی میسر نہ آتا تھا۔

پس اگر فیسزم جرمنی و اٹلی پر قبضہ کر سکتا ہے اگر سوشلزم روس پر تسلط جما سکتا ہے تو اسلام کا اقتصادی نظام کیوں ٹرکی، ایران، افغانستان، مصر یا حجاز و یمن پر نہیں چھا سکتا مگر افسوس ایسا نہیں ہے۔

ضرورت ہے کہ ہماری آواز ان آزاد حکومتوں تک پہنچے اور کوئی ایک سلطنت ہی یورپین نظامہائے اقتصادی سے مرعوب ہوئے بغیر اسلام کے اقتصادی نظام کو بروئے کار لائے دنیا کے سامنے نمونہ بنکر دکھلائے اور بتائے کہ محنت و سرمایہ کی کشمکش کے انسداد اور عام خوشحالی کی ضمانت کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخۂ کیمیا نہیں ہے یا پھر عام مسلمان خدا کا نام لے کر اٹھیں اور اپنی

فرض ادا کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ — اور میں تم سے اس کا عوض نہیں چاہتا میرا اجر تو خدا کے علاوہ اور کسی کے ذمہ نہیں ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم نے ہمت کا قدم آگے بڑھایا تو خدا کی حمایت و نصرت ہمارے ساتھ ہے

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ — نہ پست ہمت ہو اور نہ تم غمگین ہو اور تم ہی سر بلند ہوگے اگر تم سچے مسلمان ہو۔

ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل

گذشتہ سطور میں جن جذبات کے ماتحت ممالکِ اسلامی سے اپیل کی گئی اور ان کے سامنے اسلام کا اہم مطالبہ رکھا گیا۔ اسلام ہم سے بھی اسی مطالبہ کا حق دار ہے البتہ ادائے فرض میں آزاد اسلامی ممالک اور ہمارے درمیان نمایاں فرق ہے کہ ان کے سامنے صرف طرزِ حکومت کے رُخ بدل دینے کا سوال ہے اور ہم محکومیت کا شکار اور حکومتِ تسلط کے زیرِ اقتدار ہیں اور محکومیت پر مستزاد یہ کہ پورے ملک میں مسلم و غیر مسلم اقوام کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس لئے اس سے قطع نظر کر ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کا خاکہ کیا ہونا چاہئے اور اس سلسلہ کے نظریاتی مباحث سے دامن کشاں ہو کر کتاب کے موضوع "اقتصادی نظام" کے پیشِ نظر ہمارے لئے ادائے فرض کی بہترین شکل یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں پر اول تحریر و تقریر سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ علمی و عملی دونوں پہلوؤں سے کائناتِ انسانی کے لئے امن و اطمینان اور فوز و فلاح صرف اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول و قوانینِ اساسی کو اپنا راہنما بنا لیا جائے۔

اگر ہندوستان جنت نشان میں کمیونزم، سوشلزم، نیشنلزم، فیسزم اپنے اپنے نظام ہائے معاشی کی تبلیغ و دعوت میں سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نظامِ معاشی کی دعوت و تبلیغ کے لئے میدان تنگ سمجھ کر ہم پست و پا بریدہ بن جائیں اور حرمان و یاس کو

رفیقِ حیات بنالیں۔

کیونکہ اگر دنیوی نظامہائے اقتصادی کی مقبولیت کے لئے اس ملک کا دامن وسیع ہے تو روحانیت کی راہ سے آئے ہوئے معاشی نظام کے لئے اس کا دامن کیسے کوتاہ رہ سکتا ہے

البتہ یہ شرط ہے کہ اس نظام کی تبلیغ و دعوت کے لئے نفرت کی جگہ مودت خشونت کی بجائے رقت و نرمی، تنگ نظری کے بدلے وسعتِ نظر اور عداوت و بداخلاقی کی جگہ مواسات و حسنِ اخلاق جیسے برتر اصولوں کو اسوہ بنایا جائے اور قرآنِ حکیم کے اس مقدس اصولِ دعوت کو معیارِ یقین کیا جائے

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ	(اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) تم اپنے پروردگار کی جانب دعوت
بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ	دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مجادلہ (تبادلہ
الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ	خیالات) کرو اس طریقہ پر جو بہت ہی خوب اور بہتر
بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ	سے بہتر ہو۔

پس اگر ہم نے حسنِ اخلاق کے ساتھ روشن دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے سج کر مسلم و غیر مسلم پر اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری کو روشن کر دیا تو وہ وقت دور نہیں کہ مادیت کے انتہائی عروج اور روحانیت کے سخت انحطاط کے اس دور میں بھی جو سعید روحیں امنِ عالم اور کائناتِ انسانی کی اخوتِ عام اور فلاحِ دوام کے لئے حقیقی معنی میں بے چین و مضطرب ہیں ان کے ہاتھوں توپ و تفنگ اور مادی اسلحہ کی گرم بازاریوں کے بغیر ہی ایسا انقلاب برپا ہو جائے کہ سرزمین ہند کا ہر ایک طبقہ اور ہر ایک ملت و قوم اس مقدس نظام کی برتری کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے اور اس طرح خدائے برتر کا پیغامِ حق اپنی پوری رعنائیوں اور دل نوازیوں کے ساتھ برضا و رغبت اس سرزمین میں عملی صورت اختیار کر لے اور آج کا یہ محکوم کل کو تمام کائنات کے لئے نمونۂ راہ اور راہنما ثابت ہو۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

ہندوستان میں صحیح معاشی نظام اور اس کی مشکلات

ہندوستان میں اگر صحیح معاشی نظام کو بروئے کار لایا جائے تو اس سلسلہ میں دو وسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں ایک سود کا مسئلہ اور دوسرا بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا مسئلہ اس لئے کہ ان دونوں مسئلوں کے ساتھ باشندگانِ ہند کا بہت گہرا تعلق موجود ہے خصوصاً مسئلہ سود تو اس درجہ خطرناک ہو کہ ہندوستان کی اکثر و بیشتر مسلم و غیر مسلم آبادی کی معاشی بدحالی و فاقہ مستی کا یہی واحد اجارہ دار ہے اور اس کے بعد ان بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داریوں کا درجہ ہے جن میں کاشتکار کو اسلام، اخلاق اور انصاف کے خلاف غلام سمجھا جاتا اور غلاموں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے اور جو عوام کی معاشی بدحالی کے لئے جونک کا کام کر رہی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ شریعتِ اسلامی کے اہم قانون وراثت کے خلاف مجرمانہ جرأت کے ساتھ یہ زمیندار اور تعلقہ دار سرکاری عدالتوں میں یہ بیان دیتے چلے آتے ہیں کہ ہم اپنی اسٹیٹ اور اپنے تعلقہ کی وراثت کے مسئلہ میں اسلامی قانون پر رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہیں اور تقسیمِ وراثت کا انکار کرتے ہوئے اسٹیٹ اور تعلقہ سے متعلق رسم و رواج کے قانون کو واجب العمل یقین کرتے ہیں۔

اس لئے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں نہ "سود" کے لئے کوئی گنجائش ہے اور نہ ذاتی اسٹیٹ اور تعلقہ کے موجودہ سسٹم کے لئے کوئی گنجائش ہے۔

ان ہر دو مسائل میں سے "سود" تو ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی قباحت و شناعت واضح اور عام طور پر مسلم ہے اور معاشی نظام میں اس کی تباہ کاریاں روشن و ظاہر ہیں البتہ بڑی بڑی زمینداریوں کے موجودہ سسٹم کی قباحت و شناعت میں شخصی ملکیت کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے اور اس لئے اس کے خلاف اقتصادی نظام کا اقدام نہ صرف غیر مسلم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو احکامِ اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر اس اقدام کو غیر اسلامی سمجھتے اور کمیونزم یا سوشلزم کی کورانہ تقلید جانتے ہیں اس لئے ازبس ضروری ہے کہ اس مقام پر علماءِ اسلام کے وہ چند فتاویٰ یا اسلامی فیصلے پیش کر دیئے جائیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کا تقاضہ ہو

ہو تو امام اور امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفتوحہ ملک کی آراضی کو شخصی ملک بنانے کی بجائے بیت المال اور حکومت (خلافت) کی ملک قرار دے۔

علماء اسلام کے یہ فتاویٰ مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیر تحریر آئے ہیں کہ "آراضی ہند" اشخاص و افراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں "ارض المملکۃ" یا "ارض الحوزۃ" کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے "ارضِ عراق" کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا اور جمہور صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر کے آئندہ کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا۔

چنانچہ شیخ جلال الدین تھانیسری[1] نے ایک مستقل رسالہ "تحقیق آراضی ہند"[2] کے نام سے اسی غرض سے تصنیف فرمایا کہ "اراضی ہند" شخصی ملک نہیں بلکہ "ارضِ مملکت" اور وقف للمسلمین ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں۔

والحجۃ لعلمائنا فی التقریر امیر المومنین
عمر لسواد عراق بموافقۃ من الصحابۃ
رضوان اللہ علیہم اجمعین ــــ فی
الھدایۃ فی باب الغنائم واذا فتح الامام
بلدۃ عنوۃ ای قہرا فہو بالخیار
ان شاء قسمہ ما بین المسلمین کما
فعل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

اور تقریر (خلیفہ کا ملک کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی
ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ
باقی رکھنا اور اسکی ملکیت کو حکومت کی قرار دینا "تقریر"
کہلاتا ہے) کے متعلق ہمارے علماء (احناف) کی دلیل
حضرت عمرؓ کی وہ تقریر ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی
موافقت کے ساتھ سواد عراق کے متعلق ان سے عمل میں آئی
ہدایہ باب الغنائم میں ہے کہ اگر امام کسی شہر کو قہر و غلبہ کے ساتھ

---

[1] حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے مرید متبحر عالم اور شیخ کامل تھے دہلی کے قریب پنجاب کے علاقہ تھانیسر وطن مالوف تھا اور وہیں پچانوے سال زندہ رہ کر ۱۴ ذی الحجہ ۹۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔

[2] یہ رسالہ مطبوعہ ہو گیا مگر خود شیخ کے ہاتھ کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں بتایا جاتا ہے۔

مخیر وان شاء اقر اهله علیه ووضع علیهم الجزیة وعلی اراضیهم الخراج کذالک فعل عمرؓ بسواد العراق بموافقة من الصحابة رضوان الله علیهم اجمعین ولم یحمد من مالفهم وفی کل من ذلک قدوة فیتخیر۔[1]

فتح کرے تو اس کو اختیار ہو کہ چاہے تو اس کی آراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کرے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضہ میں انکو رہنے دے اور اس پر جزیہ مقرر کرے انکی زمینوں پر خراج مقرر کرے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کی موافقت کے ساتھ کیا اور جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند سمجھا گیا بہرحال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے اور دونوں اس کی صواب دید کے لئے اسوہ حسنہ ہیں۔

اور ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

وفی نفی الملک عن الکفار فی صورة التقریر وجعلهم کالاکرة العاملة للمسلمین فوائد منیرة ومنافع کثیرة لاهل الاسلام المستحقین لخراج الارض والخرج بالمنع والعطاء للمستحقین۔[2]

اور اراضی ہند کے بارہ میں "تقریر کی شکل میں" یہ کہنا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کی ملکیت نہیں ہے اور انکو کاشتکاروں اور اجارہ داروں کی طرح قرار دینا جو مسلمانوں کے (بیت المال) کے لئے عامل کی حیثیت میں ہیں مسلمانوں کے لئے روشن فوائد اور کثیر منافع کا باعث ہے اس لئے کہ زمین اور خراج کے دینے اور نہ دینے کا معاملہ دراصل مستحقین کے پیش نظر ہے۔

اور دوسری جگہ آراضی ہند کو مختلف انواع پر منقسم بتلاتے ہوئے "ثم اعلم ان اراضی ولایة الهند لیست علی سنن واحد بل هی علی انواع شتی"[3] صرف ایک نوع میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

منها ما اعطی الامام باول الفتح لبعض الغانمین او لبعض المستحقین[4]

بجز ایک صورت کے کہ امام نے جس وقت ملک ہندوستان کو فتح کیا تو اس فتح کی ابتداء ہی میں بعض زمینیں مجاہدین یا مستحقین کو عطا کریں

اور آخر میں اس بحث کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں:۔

لہ ص ۳ ٭ ص، ٭ ص ۱۱ ٭ ص ۱۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر ہندوستان کی اکثر و بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہے جو اس پر قابض ہیں سوچو اور سمجھو۔ پھر معلوم رہے کہ جبکہ ہندوستان کی اراضی ان انواعِ مختلفہ پر قائم ہے جن کا گذشتہ ذکر ہو چکا ہے تو اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدم ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ حکم لگانے والے کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے پس جس زمین کے بارے میں جس نوع سے متعلق ہونے کا یقین ہو جائے اس کے مطابق حکم دینا چاہیے لیکن اگر علمِ یقین حاصل نہ ہو تو فتویٰ دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اس لئے کہ فصلِ قضایا کی بحث میں اس طرح فتویٰ دینا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ؎

شیخ جلال الدین نور اللہ مرقدہٗ کے یہ فقہی ارشادات یا فیصلے اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا دور تھا مغلِ اعظم کی حکومت تھی اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کی مفتاحِ سعید تھی۔

اور ہندوستان کے مشہور محقق عالم مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے بھی اپنے رسالہ میں اراضی ہند کے متعلق یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرد یا جماعت کی شخصی ملکیت نہیں ہیں بلکہ ارضِ مملکت اور ارضِ بیت المال ہیں۔

اور مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ آراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں یعنی حکومت کے بیت المال کی ملکیت ہیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہیں۔ ؎

شیخ جلالؒ اور محمد اعلیٰ کے چند صدی بعد جب برٹش حکومت کا تسلط ہوا تو علمائے اسلام کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ آراضی ہند شخصی ملکیت ہیں یا نہیں اور ان پر عشر یا خراج واجب ہے یا نہیں تو محققِ عصر حضرت شاہ عبد العزیز نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت بھی یہی فیصلہ دیا کہ اراضی ہند بیت المال کی ملکیت ہیں شخصی مملوکہ نہیں ہیں اور یہاں زمیندار و تعلقہ دار مالک کی حیثیت میں نہیں، اس لئے اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی۔ فرماتے ہیں۔

حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز رسالہ در احکام آراضی ہند قلمی فرمودہ اند	اور حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس سرہ نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھا اور اس رسالہ

ؔل ص ۱۲ و ۱۳ ؔ۲ العرف الشذی ص ۲۶ تقریر درس راس المحدثین حضرت الشیخ مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ۔

دراں رسالہ ایں مذہب را بشواہد و دلائل
بسیار ابطال فرمودہ تحقیق فرمودہ اند کہ
اراضی ہند بدستور اراضی سواد عراق
موقوف بر ملک عامۂ مسلمین بے تخصیص
است یعنی در ملک بیت المال است
و زمینداران را بیش از قیم بودن دخلے
نیست و قاضی محمد اعلےٰ تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ نیز دریں باب رسالہ نوشتہ[۵]
و ہمیں مسلک را ترجیح دادہ الخ

مگر بنا برآنچہ حضرت شیخ جلال تھانیسری
قدس اللہ سرہ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ
زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق
کہ در عہد حضرت فاروق رضی اللہ عنہ مفتوح
شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال است
و زمینداران را بیش از تولیت و کاروگی تردد و
فراہم آوردن مزارعین و اعانت مزارعت و حفظ
و نظر نیست چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعار آں میکند
و تغیر و تبدیل زمینداری و عزل و نصب زمینداری
و اخراج بعضے از آنہا و اقرار بعضے و عطائے بعضے
اراضی با فغانان و بلوچان و سادات و مشائخ

میں انھوں نے اس مذہب کو رد کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں
کی ملک ہیں، بہت سے دلائل و شواہد سے باطل قرار دیا ہے
اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی آراضی آج بھی بدستور سابق
عراق کی اراضی کی طرح عامۂ مسلمین کے لیے وقف ہیں یعنی بیت المال
کی ملکیت ہیں کسی شخص و فرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں
کی ملکیت اور نہ زمینداروں کو چودھری اور نگراں ہونے سے
زیادہ کوئی دخل ہے اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے
بھی اس بارہ میں ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور انھوں نے
اس میں شیخ جلالؒ ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے

بنابریں اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال تھانیسری
قدس اللہ سرہ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی سر
زمین ابتدا فتح میں عراق کی طرح جو کہ حضرت فاروق کے زمانہ
میں فتح ہوا تھا بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے اور زمینداروں
کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و ذمہ دار ہیں اور کاشتکاروں
کو تلاش کرکے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے
اور اسی ذمہ داری کے غور و فکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل
نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کا کوئی دخل ہے چنانچہ لفظ زمیندار
بھی اسی کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر و تبدل و عزل و
نصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لیے اثبات اور بعض کو
اراضی دینا مثلاً افغانوں، بلوچوں، سادات، مشائخ وغیرہ کو

[۵] یہ رسالہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

بصیغۂ زمینداری دلالت صریحہ بریں می کنند[1] زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعویٰ کی صریح تائید کرتے ہیں

علماء اسلام کے ان فتاویٰ کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضی ہند پر جو تصرفات قائم رکھے نیز شاہ عالم نے سر طامس رو کو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمینداریوں کے متعلق جو معاہدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے بنگال کی زمینوں کے متعلق جو معاہدہ کیا وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضی ہند کو زمیندار و تعلقہ دار کی ذاتی و شخصی ملکیت نہیں سمجھتے اور حکومت کی مِلک شمار کرتے ہوئے ان کو نگراں اور "قیم" کی حیثیت دیتے تھے۔

پس جبکہ علماء اسلام کے فتاویٰ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کی زمین حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے اور انھوں نے اس فیصلہ میں عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کے پیش نظر مخصوص طبقۂ زمینداران و تعلقہ داران کے نقصان کو قابلِ نظر انداز سمجھا اور اس کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ "ارض عراق" کو اسوۂ حسنہ قرار دیا تو آئندہ کے لئے ہندوستان کے معاشی نظام میں اس قسم کے اقدام کو غیر اسلامی کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے البتہ یہ دیکھنا از بس ضروری ہوگا کہ یہ اقدام عامۃ المسلمین کی معاشی فلاح کے لئے مفید ثابت ہو۔ ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

خادم ملت

محمد حفظ الرحمٰن (کان اللہ لہ)

کتبہ محمد نثار احمد راشد ۵ اگست ۱۹۶۳ء لکھنؤ

[1] فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۴ مجتبائی